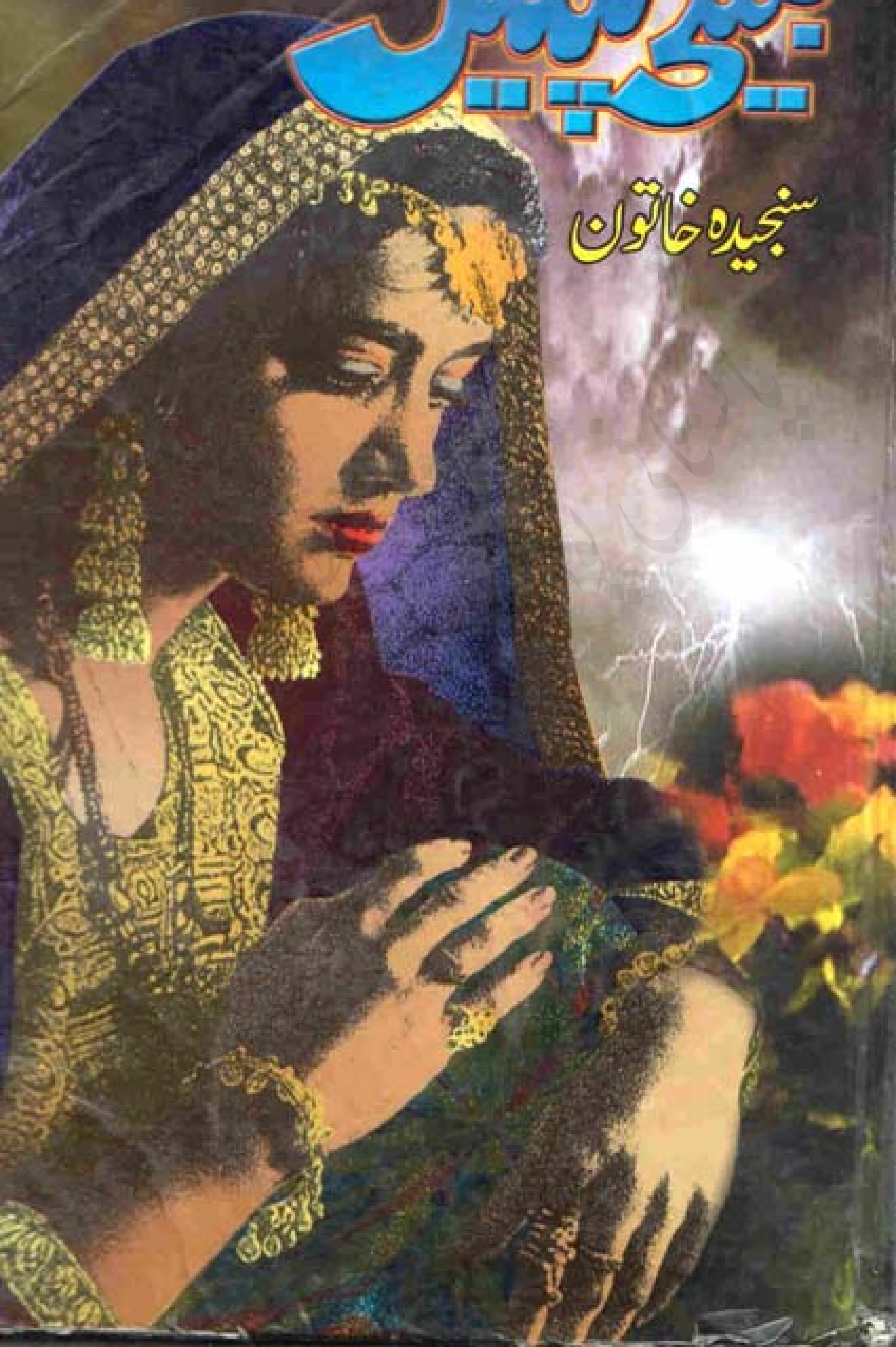

بھیگی پلکیں
سنجیدہ خاتون

سنجیدہ خاتون کی تحریریں

اپنی تحریروں میں سنجیدہ خاتون کی اپروچ پروگریسو رہی ہے۔ اُنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے تاریخی وعصری تناظر میں طبقاتی شعور کو اُجاگر کیا ہے۔ وہ تقریباً تیس سال سے لکھ رہی ہیں۔ ان کی کہانیوں اور موضوعات کا تعلق ہماری روزمرہ زندگی اور ایک عام آدمی کو درپیش مسائل سے ہے۔ وہ بڑی سادگی اور فنکارانہ سوجھ بوجھ کے ساتھ ان مسائل کی نشاندہی کرتی ہیں۔

طبع زاد لکھنے کے علاوہ سنجیدہ خاتون نے دنیا کی مختلف زبانوں سے تراجم کیئے ہیں۔ ان میں انگریزی، فارسی، عربی، بنگلہ، ہندی وغیرہ شامل ہیں۔ دوسری زبانوں کے ناولوں کو اُردو میں منتقل کرتے ہوئے سنجیدہ خاتون اس بات کا خاص خیال رکھتی ہیں کہ ہمارے پاکستانی معاشرے کے لئے کیا چیز کس حد تک قابل قبول ہو سکتی ہے۔ وہ اسی لئے ترجمہ کیئے جانے والے ناولوں کے ان حصوں کو حذف کر دیتی ہیں جو نوجوان کچے ذہنوں پر غلط اثرات مرتب کر سکتے ہیں۔ غالباً یہ کوئی غلط بات نہیں۔ کیونکہ ان کی تحریریں گھروں میں بھی پڑھی جاتی ہیں۔

....شمیم نوید

سنجیدہ خاتون کے ناولوں کی خصوصیت یہ ہے کہ انہیں پڑھنا شروع کر دیا جائے تو ہاتھ سے رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ بہرحال کوئی معمولی بات نہیں کہ ناول کی بُنت اور پیرایۂ اظہار اتنا پُرکشش ہو جو پڑھنے والے کو ناول کے اختتام تک پوری طرح اپنی طرف متوجہ رکھے۔ سنجیدہ خاتون نے جو ناول ہندی سے اُردو میں ترجمہ کیئے ہیں ان کے مطالعے سے ہمیں ہندوستان کے معاشرتی حالات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ دیگر زبانوں سے سنجیدہ خاتون نے جو ترجمے کیئے ہیں وہ تخلیقی عمل کا درجہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ اچھا ترجمہ بھی تخلیقی عمل ہے۔

....پروفیسر رئیس علوی

سنجیدہ خاتون کے ناول غیر سنجیدہ معاشرے کے لئے سنجیدہ کوشش ہیں۔ ہمارے ہاں

کتابیں پڑھنے کا رجحان دم توڑ رہا ہے۔ ان حالات میں سنجیدہ خاتون لائق مطالعہ ناول تحریر کر رہی ہیں جو قابل ستائش ہے۔

.... طاہر نجمی، ایڈیٹر روزنامہ ایکسپریس کراچی

یہ خوش آئند بات ہے کہ سنجیدہ خاتون اپنی گھریلو مصروفیات کے باوجود لکھنے کی خاطر وقت نکال لیتی ہیں۔ ان کے ناول پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ معاشرتی شعور رکھتی ہیں اور اپنے کرداروں کے ذریعے معاشی مسائل کو خوبصورت انداز میں پیش کرتی ہیں۔ ان کی یہ تحریریں ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ جو زندگی ہم گزار رہے ہیں اس میں اصلاح کا کیا پہلو ممکن ہے۔ سنجیدہ خاتون کا طرزِ تحریر شائستہ ہے اور ان کے مکالمے بہت جاندار ہیں۔ بلاشبہ وہ ایک کامیاب ناول نگار ہیں۔

.... پروفیسر سحر انصاری

سنجیدہ خاتون کی تحریروں کو میں نے پڑھا اور انتہائی دلچسپ پایا۔ انہوں نے ہندی ناولوں کے جو ترجمے کئے ہیں ان کی حیثیت بھارت اور پاکستان کے درمیان محبت کے پُل جیسی ہے۔ زبان کوئی بھی ہو، محترم ہے۔ سنجیدہ خاتون بڑی سادہ اور عام فہم زبان لکھتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں محاورے بہت خوبصورت اور برجستہ ہوتے ہیں۔ وہ لائق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے دنیا کی مختلف زبانوں کے ادب کو اُردو میں منتقل کیا ہے۔ اُن کی تحریروں میں کہیں اُلجھاؤ نہیں، بلکہ روانی اور حقیقت بیانی ہے۔ سماجی حقیقتوں کو وہ اپنی تحریروں میں بڑے دلکش طور پر پیش کرتی ہیں۔

.... پروفیسر آفاق صدیقی

سنجیدہ خاتون کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے ناول عوام وخواص دونوں کے لئے قابل فہم اور دلچسپ ہیں۔ انہوں نے زندگی کے کرب، محرومیوں کے احساس، انسانی جبلت اور سماجی ناہمواریوں کو اپنی تخلیقات کی بنیاد بنایا ہے۔ انسان کے بنیادی جذبوں کا بیان اور داخلی و خارجی کشمکش، عمل و ردِعمل اُن کا بنیادی موضوع ہے۔ خیر و شر کی جنگ کی تباہ کاریوں کے اثرات ہمیں ان کے یہاں بڑے واضح نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں کہانی، کردار اور زبان کا رابطہ کہیں بھی ٹوٹنے نہیں پاتا۔

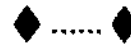
.... پروفیسر سیما سراج

بھیگی پلکیں

ٹرین نے رفتار پکڑ لی تھی۔ مگر اس سے پہلے ہی کچھ پولیس والے بھی اس میں سوار ہو گئے تھے جنہیں کسی مجرم کی تلاش تھی۔ وہ مجرم کسی مندر سے ایک نادر مورتی چرا کر بھاگا تھا جو ٹھوس سونے کی بنی ہوئی تھی اور چار ہزار سال پرانی بتائی جاتی تھی۔

پنڈتوں نے اس مورتی کی چوری پر ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ انہوں نے ایک بڑا جلوس نکال کر حکومت سے مطالبہ کیا کہ اس نایاب مورتی کا فوراً پتہ چلایا جائے ورنہ اس کے بیرونِ ملک منتقل ہونے کا اندیشہ ہے۔ چنانچہ پولیس حرکت میں آ گئی۔ پورے شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی۔ ہر آنے جانے والے کو مشتبہ سمجھا جانے لگا۔ نہ جانے کتنے لوگوں کی تلاشی لی گئی!

اسی دوران پولیس کی نظروں میں وہ شخص آ گیا جو ٹرین کے پلیٹ فارم سے روانہ ہوتے ہی اندر آیا تھا اور بھاگتا ہوا چلتی ٹرین میں چڑھا تھا۔ اُس کے چہرے پر گھنی داڑھی مونچھیں اور سر پر بڑی سی پگڑی تھی۔ وہ کوئی سکھ لگتا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں سوٹ کیس بھی تھا۔



وجے نے ٹرین میں چڑھ کر سکون کا سانس لیا اور پھر آگے بڑھا۔ سخت سردی پڑ رہی تھی اس لئے مسافروں نے اپنے اپنے فرسٹ کلاس کیبن اندر سے بند کر لئے تھے۔ وہ چلتا رہا اور آخری کیبن کے دروازے کو کھلا پا کر بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ اندر کوئی نہیں تھا، مگر سامان موجود تھا۔ صرف ایک برتھ پر بستر بچھا ہوا تھا۔ وجے نے جلدی سے اپنا بریف کیس برتھ کے نیچے کھسکایا، نقلی داڑھی مونچھیں اُتاریں اور کھڑکی کھول کر باہر پھینک دیں۔ پھر اُس نے کوٹ اُتارا اور پلٹ کر پہن لیا۔ اب وہ کوٹ سیاہ کے بجائے سفید چیک دار تھا۔ اُس نے اپنی جیب سے ایک میگزین نکالا اور اسے پڑھنے لگا۔

معاً کیبن کا دروازہ کھلا۔ وجے نے دھڑکتے دل کے ساتھ اُدھر دیکھا۔ ایک حسین لڑکی کو اندر آتے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں تولیہ تھا اور دوسرے میں صابن دانی۔ وجے کو دیکھ کر لڑکی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ سوچ رہی تھی میرے کیبن میں یہ مرد کہاں سے آن ٹپکا؟ مجھے تو بتایا گیا تھا کہ دوسری برتھ کسی عورت ہی کو دی جائے گی۔ لڑکی نے کیبن کا دروازہ بند نہیں کیا بلکہ چپ چاپ اپنی برتھ پر آ کے بیٹھ گئی۔ چند لمحے بعد اُس نے اپنا ناشتے دان اٹھایا اور کھڑکی کے پاس بنی ہوئی میز پر رکھ کر اسے کھولنے لگی۔

یکایک کیبن کے دروازے پر ایک پولیس انسپکٹر آیا۔ اُس نے اندر جھانک کر دیکھا۔ وجے نے اپنی توجہ ناشتے دان پر مرکوز کر دی اور انسپکٹر کو یہ تاثر دیا جیسے میاں بیوی کھانا کھا رہے ہیں۔

"آپ نے کسی سردار جی کو تو نہیں دیکھا؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" وجے نے جلدی سے جواب دیا۔

انسپکٹر نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "ایک مجرم اس ٹرین پر سوار ہو گیا ہے۔ آپ اپنا دروازہ اندر سے بند کر لیجئے۔"

مجرم کے بارے میں سن کر لڑکی کانپ کے رہ گئی۔ اُس نے مشتبہ نظروں سے وجے کی طرف دیکھا جو انسپکٹر کی ہدایت کے مطابق دروازہ بند کر رہا تھا۔ وہ یہ سوچ کر پریشان ہو گئی کہ ایک مرد کے ساتھ تنہا سفر کیسے کر سکے گی؟ اُس نے بغور وجے کا جائزہ لیا۔ لمبا قد، چوڑا سینہ، سرخ و سفید رنگت اور چہرے پر معصومیت!

پھر وہ لڑکی اپنے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی اور وجے اپنے میگزین میں کھو گیا۔

کھانا کھانے کے بعد لڑکی نے کھڑکی کھولی تو سرد ہوا کا جھونکا اندر آیا۔ گلاس میں موجود پانی سے وہ ہاتھ دھونے لگی۔ ٹوائلٹ میں جا کر ہاتھ دھونے کا ارادہ اُس نے بدل دیا تھا۔ ہاتھ دھوتے ہوئے پانی کی کچھ چھینٹیں اُڑ کر وجے کے منہ پر پڑیں۔

"آئی ایم سوری۔" لڑکی نے پلٹ کر وجے سے کہا۔

جیب سے رومال نکال کر چہرہ صاف کرتے ہوئے وجے بولا۔ "کوئی بات نہیں۔"

لڑکی کھانے سے فارغ ہو کر اپنی برتھ پر لیٹ گئی اور کمبل اوڑھ لیا۔ اُس نے آنکھیں

بند کر لیں۔ وجے نے دیکھا اُس کی پلکیں غیر معمولی طور پر لمبی اور گھنی ہیں۔ وجے نے محسوس کیا کہ لڑکی نے کوئی پرفیوم بھی لگا رکھا ہے جس کے سبب کیبن بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا ہے۔ وہ خوشبو وجے کو اپنے دل کی گہرائیوں میں اُترتی محسوس ہوئی۔ پھر وہ بھی اپنی برتھ پر لیٹ گیا۔ لڑکی کے بارے میں سوچتے سوچتے جانے کب اُس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح اُس کی آنکھ کھلی تو چھ بج چکے تھے۔ وجے کی نظر لڑکی پر پڑی۔ وہ اُس کی طرف منہ کئے مطمئن انداز سے سو رہی تھی۔ اُس کی لمبی اور گھنی پلکیں گویا وجے کے دل میں کھب گئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کنول کی پنکھڑیاں بند ہوں۔ اُس کا حسین چہرہ گلابی تھا۔ ہونٹ اور بھی زیادہ گلابی تھے۔ اُس کے چہرے پر زلفیں بکھری ہوئی تھیں جن کا رنگ سنہرا تھا۔

معاً وجے کی نظر لڑکی کے گلے میں موجود اس قیمتی ہار پر پڑی جو ابھی تک اُس نے نہیں دیکھا تھا۔ لڑکی کے کانوں میں سنہری بالیاں، کلائیوں میں چوڑیاں اور انگلیوں میں قیمتی ہیرے کی کئی انگوٹھیاں تھیں۔

وہ حسینہ اتنی قیمتی جیولری کے ساتھ بے فکری کی نیند سو رہی تھی۔ وجے نے اُسے کئی بار دیکھا، یوں گویا اپنے دل میں اُتار رہا ہو۔ وہ پیشہ ور چور، ڈاکو اور مجرم تھا، وقت آنے پر کسی کو قتل بھی کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود اُس کے دل میں ایک نرم گوشہ تھا۔

وجے نے ہوش سنبھالا تو خود کو جرائم کی دنیا میں پایا۔ اُس کا باپ دیوان چند، بمبئی کے ایک بدنام اسمگلر اور قاتل چندانی سیٹھ کے لئے ہر ناجائز اور غیر قانونی کام کرتا تھا۔ چونکہ وجے کی ماں نہیں تھی اس لئے وہ ہمیشہ اپنے باپ کے ساتھ رہا تھا۔ اپنی ماں کو وجے نے صرف تصویر میں دیکھا تھا۔ وہ مر چکی تھی۔ اکثر اُس کا باپ اپنی بیوی کی تصویر کے آگے گھنٹوں گم صم کھڑا رہتا تھا اور پھر رونے لگتا تھا۔ اسی کے ساتھ جب بھی اُس کے سامنے بھگوان کا ذکر ہوتا تو وہ نہ جانے کیوں طنزیہ انداز میں ہنس دیتا۔ وجے نے اپنے باپ دیوان چند سے اس کی وجہ پوچھی تو وہ ٹال گیا۔ وجے کا خیال تھا کہ اُس کا باپ زمانے کی ستم ظریفی کا شکار ہوا ہے۔ اپنے باپ کی جگہ وجے اب چندانی سیٹھ کے لئے کام کرتا تھا، لیکن بالکل اکیلا۔ چندانی سیٹھ نے جو گروہ بنایا تھا اس کے کسی بھی فرد سے وجے کی دوستی نہیں تھی۔ وہ چندانی سیٹھ سے اپنا معاوضہ وصول کر کے عیش و عشرت کی

زندگی بسر کر رہا تھا۔ اپنے باپ کی طرح چندانی سیٹھ کے گروہ میں وہ یوں پھنس چکا تھا کہ کوشش کے باوجود نہیں نکل سکتا تھا۔

چندانی سیٹھ خطرناک آدمی تھا۔ بے وفائی کرنے والوں کو وہ زندہ نہیں چھوڑتا تھا۔ وجے کو چندانی سیٹھ کے اڈے کا پتہ تک معلوم نہ تھا۔ گروہ کے کچھ خاص آدمیوں ہی کو یہ علم تھا کہ چندانی سیٹھ کا اڈا کہاں ہے۔ چندانی سیٹھ دہری شخصیت کا مالک تھا۔ سماج میں وہ معزز حیثیت کا حامل اور عزت دار شہری تھا۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں، وزیروں اور مشیروں کے ساتھ وہ اُٹھتا بیٹھتا تھا۔



کچھ دیر بعد لڑکی کی آنکھوں کو حرکت ہوئی۔ اُس کی گھنی اور لمبی پلکیں تھرتھرائیں اور پھر پھول کی پنکھڑیوں کی طرح کھل گئیں۔ لڑکی نے یوں انگڑائی لی جیسے اپنی خواب گاہ میں ہو، لیکن جلد ہی اُسے احساس ہوگیا کہ کہاں ہے۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور وجے کی طرف دیکھ کر دھیرے سے مسکرائی۔

''آپ کہاں جائیں گی؟'' وجے نے اُس کی مسکراہٹ سے حوصلہ پاتے ہوئے سوال کر ڈالا۔

''بومبے۔'' لڑکی نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''وہاں تو میں بھی جا رہا ہوں۔ آپ شہر کے کس علاقے میں رہتی ہیں؟'' وجے نے دریافت کیا۔

لڑکی نے سوچا، آج کل کے نوجوانوں کا یہی ''طریقۂ واردات'' ہے۔ پہلے وہ بات چیت شروع کرتے ہیں اور پھر اُنگلی پکڑ کر پہنچے تک پہنچ جاتے ہیں۔

''مالی ہل۔'' لڑکی نے مختصر جواب دیا، پھر ٹوتھ پیسٹ، برش اور تولیہ لے کر کیبن سے باہر چلی گئی۔

وجے نے لڑکی کا رُوکھا پن محسوس کر لیا تھا۔ اُسے دُکھ تو ہوا مگر سوچا کہ میں ایک مجرم ہوں، ان جذبوں سے میرا کیا تعلق۔

لڑکی واپس آئی تو اُس نے وجے کو کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وجے بھی خاموش بیٹھا رہا۔ لیکن بار بار اُس کی نظر لڑکی کی طرف اُٹھ رہی تھی۔

ٹرین گیارہ بجے اپنی منزل پر پہنچی تو ماحول خاصا گرم تھا۔ بمبئی کا موسم ویسے بھی گرم یا معتدل رہتا ہے۔ ان دونوں مسافروں نے اپنی کھڑکیاں پہلے ہی کھول لی تھیں۔ لڑکی بڑی بے چینی کے ساتھ پلیٹ فارم پر کھڑے لوگوں میں کسی کو ڈھونڈ رہی تھی۔

پلیٹ فارم پر کھڑی ایک لڑکی نے ٹرین والی لڑکی کو دیکھ کر زور زور سے ہاتھ ہلایا۔ ''انشو......! انشو......!''

''مینا۔'' وجے نے اپنی ہم سفر لڑکی کی آواز سنی۔

تو محترمہ کا نام انشو، یعنی کرن ہے۔ وجے نے سوچا۔ مجھے بھی ایک کرن کی تلاش تھی جو میری زندگی کے اندھیروں کو اُجالوں میں بدل دے۔ ہوسکتا ہے یہ وہی کرن ہو۔

وجے اکثر سوچتا تھا کہ میرا انجام کیا ہوگا؟ کیا میں زندگی بھر اسی طرح مجرم بنا رہوں گا؟ کبھی نہ کبھی تو میں قانون کی گرفت میں آجاؤں گا۔ وہ جیسے ایک گنبد بے در میں قید تھا جہاں سے نکلنے کا راستہ اُسے نہیں مل رہا تھا۔

گاڑی رُک گئی تو وجے کی طرف دیکھے بغیر انشو پلیٹ فارم پر اُتر گئی۔ وجے بھی اپنا بریف کیس لے کر نیچے آگیا۔ انشو اور مینا بڑی گرم جوشی سے ملیں۔ مینا کے ساتھ باوردی ڈرائیور بھی موجود تھا۔ ڈرائیور اور قلی نے انشو کا سامان باہر نکالا۔

''ممی کہاں ہیں؟'' انشو نے مینا سے پوچھا۔

''بنگلے پر کچھ مہمان آگئے تھے اس لئے انہوں نے مجھے یہاں آنے کا حکم دیا اور میں چلی آئی۔'' مینا نے جواب دیا۔

وجے ایک طرف کھڑا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں باہر کی طرف چلیں تو وجے بھی ان کے پیچھے تھا۔ لمبی سی سفید چمچماتی غیر ملکی گاڑی میں وہ بیٹھیں، قلی نے اُن کا سامان ڈگی میں رکھا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔ اسی لمحے انشو کی نظر وجے پر پڑی جو فٹ پاتھ پر کھڑا اُسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انشو نے غصے سے سر کو جھٹکا اور مینا سے باتیں کرنے لگی۔ گاڑی وجے کی نظروں سے دُور ہوتی جا رہی تھی مگر اُس نے گاڑی کا نمبر اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا تھا۔



وجے اپنے گھر پہنچا، اُس کا گھر چھوٹا سا مگر خوبصورت تھا۔ گھر کے باہر ایک ٹی ایٹ

کار کھڑی تھی۔ وجے کے باپ نے گرمجوشی سے اُس کا استقبال کیا۔ اُس نے سوٹ کیس باپ کے حوالے کر دیا۔ اُس کے باپ دیوان چند کے سر پر سفید بال بھی اُڑے ہوئے تھے، چہرے پر جھریاں تھیں۔ وہ دن رات شراب میں ڈوبا رہتا تھا۔ بظاہر اُس کا چھوٹا سا کاروبار تھا مگر اصلاً وہ چندانی سیٹھ کا آدمی تھا۔ پہلے وہ چندانی سیٹھ کے حکم پر دوسرے شہروں میں جاتا تھا اور چندانی کے آدمیوں کا چرایا ہوا مال لے آتا تھا۔ اب یہی کام وجے کرتا تھا۔

اُس نے وجے سے سوٹ کیس لے کر گھر کے کھڑکی دروازے اچھی طرح بند کئے اور سوٹ کیس کھول کر مورتی باہر نکالی۔

''اب تو بھگوان بھی اسمگل ہو کر بیرون ملک جا رہے ہیں۔'' اُس نے قہقہہ لگایا۔ پھر یکدم اُس کے چہرے پر سنجیدگی پھیل گئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے اپنی آنجہانی بیوی کی تصویر کو دیکھا جو ایک دیوار پر لگی تھی۔

''پتا جی!'' وجے نے کہا۔ ''پہلے آپ بھگوان کے لئے طنزیہ باتیں کرتے ہیں، پھر اچانک سنجیدہ ہو جاتے ہیں، ایسا کیوں ہے؟''

''بیٹا! اگر بھگوان چاہتا تو میری بیوی مجھ سے جدا نہ ہوتی۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اور پھر تو بھی کبھی چندانی کے گروہ میں شامل نہ ہوتا۔''

''ماں کی موت کے بعد آپ چاہتے تو خود کو مجھ سے دُور رکھ کر ایک اچھا انسان بنا سکتے تھے۔ کوئی مجرم باپ اپنے بیٹے کو مجرم نہیں بناتا۔ مگر آپ کے دل میں یقیناً کوئی راز پوشیدہ ہے جو آپ مجھے بتانا نہیں چاہتے۔'' وجے نے کہا۔

''ہاں ایک راز تو ہے میرے سینے میں۔ مگر ابھی اسے ظاہر کرنے کا وقت نہیں آیا۔ واقعی میں نے تجھے اپنے ساتھ رکھ کر اچھا نہیں کیا۔ بہرحال مرنے سے پہلے میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا، یہ میرا وعدہ ہے۔''

وجے خاموش ہو کر سوچنے لگا، پتا جی مرنے کی بات کیوں کرتے ہیں......؟ آخر وہ جرم کی راہ پر کیوں چل پڑے تھے؟ شاید یہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں تبھی اپنے ساتھ رکھا اور اسی سبب مجھے بھی اسی راستے پر ڈال دیا۔

تھوڑی دیر بعد دیوان چند نے چندانی سیٹھ کو فون پر مورتی کے پہنچنے کی اطلاع دے

دی۔

کچھ دن گزر گئے۔ وجے کے آئینۂ دل میں اب انشو کی تصویر کا عکس دُھندلا پڑنے لگا تھا۔ وہ انشو کو بھول جانا چاہتا تھا۔ انشو جو بھی وجے کے لئے آسمان کا ستارہ تھی جسے دیکھنا تو ممکن ہے، چھوا نہیں جا سکتا۔ وجے کو ریل گاڑی کا سفر بار بار یاد آتا۔ اُس حسین و یادگار سفر کی یاد کو وجے نے ذہن سے جھٹکنا چاہا جس میں انشو اُس کی ہم سفر تھی، مگر وہ ناکام رہا۔

ابھی کچھ روز ہوئے تھے کہ چندانی سیٹھ کی طرف سے ایک دعوت نامہ ملا۔ سیٹھ نے اپنے بنگلے پر ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ اس تقریب میں دیوان چند اور وجے کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ دراصل چندانی سیٹھ کا بیٹا رندھیر دو سال بعد لندن سے بمبئی واپس آیا تھا۔ یہ جشن اسی کی آمد کے سلسلے میں تھا۔

''کیا باس کا بیٹا ہمارا باس بنے گا؟'' وجے نے اپنے باپ دیوان چند سے سوال کیا۔

اس پر دیوان چند دھیرے سے ہنس کر بولا۔ ''شاید نہیں۔ کیونکہ چندانی سیٹھ ایک خطرناک مجرم ہے۔ اس کا بیٹا رندھیر محض ایک عیاش اور آوارہ مزاج نوجوان ہے۔ رندھیر یہ خطرناک دھندا نہیں سنبھال سکتا۔ آگے چل کر وہ بدل جائے تو اور بات ہے۔''

وجے نے خاموشی اختیار کر لی۔ ویسے بھی اُسے کسی سے کوئی غرض نہ تھی۔ وہ اپنے اور دیوان چند کے سوا صرف کام کے بارے میں سوچتا تھا۔

چندانی سیٹھ کا بنگلہ سجا ہوا تھا۔ وجے نے اپنی کار بھی دوسری کاروں کے ساتھ کھڑی کی اور اپنے باپ کے ساتھ اندر پہنچا۔ چندانی سیٹھ، رندھیر کے ساتھ کھڑا ہوا مہمانوں کا استقبال کر رہا تھا۔ دیوان چند تو رندھیر کو پہلے سے جانتا تھا مگر اُس سے وجے کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ وہ نوجوان وجے کو اچھا نہیں لگا۔ ایک تو اُس کی شکل و صورت بھدی تھی، اوپر سے افریقیوں جیسا حلیہ بنا رکھا تھا۔ اُس کے انداز و اطوار سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اس وقت خود کو کوئی شہزادہ سمجھ رہا ہے۔ رندھیر سے مل کر وجے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ دیوان چند اپنے کچھ دوستوں سے باتیں کرنے لگا۔

اچانک وجے کو ''وہ'' نظر آ گئی۔ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ آج وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔ ایک تو اُس کا خداداد حسن، پھر قیمتی اور جدید تراش خراش کا لباس! واقعی وہ

پرستان سے آئی ہوئی کوئی پری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ انشو ہی تھی۔ اُس کے ساتھ ایک مرد اور عورت بھی تھے جو غالباً اُس کے ماں باپ تھے۔ دونوں ہی انگریزوں کی طرح سرخ و سفید تھے۔ سانولا سانولا سا ایک نوجوان بھی انشو کے ساتھ تھا۔ وہ سانولا نوجوان اُس کا بھائی نہیں ہو سکتا تھا پھر بھی اُس نوجوان کو دیکھ کر وجے سوچنے لگا کہ آخر یہ کون ہے؟

چندانی سیٹھ نے اپنے بیٹے رندھیر سے سب کو ملوایا۔ رندھیر، انشو سے مل کر کچھ زیادہ ہی خوش نظر آیا۔ انشو اور اُس کے ساتھی نوجوان کو ساتھ لے کر رندھیر اس میز کی طرف چلا گیا جہاں کھانے پینے کی ڈھیروں اشیاء سجی تھیں۔ رندھیر نے انشو کی خاطر مدارات شروع کر دی۔ انشو کے منع کرنے پر بھی وہ مختلف چیزیں پلیٹوں میں رکھ کر اُسے پیش کرنے لگا۔

وجے یہ منظر دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا۔ انشو بھی رندھیر سے ہنس ہنس کے باتیں کر رہی تھی۔ انشو کا نوجوان ساتھی البتہ سنجیدہ لگ رہا تھا۔

یکایک انشو کی نظر وجے پر پڑی تو وہ چونک اُٹھی۔ وجے کا چہرہ وہ اب تک بھول نہیں سکی تھی۔ اُس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر شناسائی کے انداز میں اٹھا تو ضرور مگر پھر اُس کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ اُس نے سوچا، میرا اس شخص سے کیا تعلق جو میں اسے دیکھ کر ہاتھ ہلاؤں؟ ٹرین میں ایک ساتھ سفر کرنے کا یہ مطلب بہر حال نہیں کہ تعلقات بڑھائے جائیں۔ پھر وہ رندھیر سے باتیں کرنے لگی۔

وجے لان کے کنارے تنہائی میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی نظریں پھولوں پر تھیں۔ انشو نے اُسے تنہا کھڑا دیکھا تو یہ سوچ کر افسردہ ہو گئی کہ شاید اس بھری دنیا میں اس کا کوئی بھی نہیں ہے، اسٹیشن پر اسے لینے کوئی نہیں آیا تھا۔

وجے کی شخصیت اور اُس کی سنجیدگی نے انشو کے دل کے تار جھنجھوڑ دیئے تھے۔ وہ رندھیر سے باتیں کرتی رہی۔ مگر اُس کا دماغ وجے کی طرف لگا رہا۔ ایک آدھ بار گھوم کر اُس نے وجے کی طرف دیکھا بھی۔ پھر اچانک ہی وجے اُسے نظر نہ آیا۔ اُس نے آس پاس نظریں دوڑائیں، مگر وجے کہیں نہیں تھا۔ اُسے حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ اُسے یوں لگا جیسے اتنی بڑی تقریب میں کوئی کمی پیدا ہو گئی ہے۔

انشو کچھ کھوئی کھوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ تقریب میں اُس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ رندھیر کو بھی اس کا احساس ہو گیا کہ انشو اُس کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ یہ بات اُسے بری

لگی۔ دوسری جانب انشو کا نوجوان ساتھی بھی رندھیر کی باتوں سے اُکتا رہا تھا۔

رندھیر سوچنے لگا، میں اس تقریب کی جان ہوں اور یہ لڑکی مجھ ہی سے بے اعتنائی برت رہی ہے۔

''انشو جی! آپ کہاں ہیں؟'' رندھیر نے آخر پوچھ ہی لیا۔

اس پر انشو چونک اٹھی اور بولی۔ ''میں دراصل اس نوجوان کو دیکھ رہی تھی جس کے ساتھ میں ایک بار طویل سفر کر چکی ہوں۔ ہم دونوں ٹرین کے ایک ہی کیبن میں تھے۔ ابھی کچھ دیر ہی پہلے وہ مجھے یہاں نظر آیا تھا لیکن......''

''پھر تو وہ نوجوان واقعی خوش قسمت ہوا۔'' رندھیر دھیرے سے ہنس کر بولا۔

''لیکن وہ ہے کہاں؟''

''کیوں؟ کیا اُس نے آپ سے کوئی بدتمیزی کی؟''

''جی نہیں، وہ ایک شریف و مہذب نوجوان ہے۔''

''چھوڑیں بھی، آج کل کوئی بھروسے کے قابل نہیں۔'' رندھیر نے کہا اور پھر انشو کے سانولے سلونے ساتھی کی طرف گھوم کر کہنے لگا۔ ''کیوں وشال! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''جی...... جی ہاں۔'' وشال نے جواب دیا۔

وشال چھوٹے سے ایک گھرانے کا بہت ہی سیدھا اور شریف نوجوان تھا۔ وہ دل سے انشو کو چاہتا تھا۔ یہ بات انشو کے ڈیڈی رائے صاحب اور ان کی بیوی کو بھی معلوم تھی۔ وہ دونوں وشال کو انشو کے لئے پسند کر چکے تھے۔ انشو کو بھی اس کا علم تھا۔ اُسے اپنے والدین کے اس فیصلے پر کوئی اعتراض تو نہیں تھا لیکن اُس کا دل وشال کے لئے کبھی پیار بھرے انداز میں نہیں دھڑکا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ شادی کے بعد میں ایک مشرقی لڑکی کی طرح اپنے شوہر سے پیار کرنے لگوں گی۔ وشال، رائے صاحب کے ایک قریبی دوست کا بیٹا تھا۔ وہ الہ آباد سے آیا تھا اور ان دنوں رائے صاحب کا مہمان تھا۔

چندانی سیٹھ کے بنگلے پر منعقد ہونے والی اس تقریب میں نغمہ و رقص کی محفل بھی سجائی گئی تھی۔ رندھیر کو مغربی رقص میں مہارت تھی جس کا مظاہرہ کر کے اُس نے مہمانوں، بالخصوص نوجوان لڑکیوں کو حیران کر دیا۔ انشو کو بھی رندھیر کے ساتھ رقص کرنا پڑا۔

رات گیارہ بجے کے بعد بڑے بوڑھے رخصت ہونے لگے، مگر نوجوانوں کی محفل گویا اب جمنے والی تھی۔ رائے صاحب بھی جانے کے لئے اُٹھے تو طے شدہ منصوبے کے مطابق چندانی سیٹھ نے اُنہیں روکنا چاہا۔

رائے صاحب سے چندانی سیٹھ کی ملاقات کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ یہ ملاقات ایک تقریب کے دوران ہوئی تھی۔ اُس نے انشو کو دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کی شادی اپنے بیٹے رندھیر سے کرے گا۔ اُس کی نظریں رائے صاحب کی جائیداد اور فیکٹریوں پر تھیں جن کی اکلوتی وارث انشو ہی تھی۔ وہ رائے صاحب سے ملتا رہا اور اُن کے ساتھ تعلقات مستحکم ہوتے رہے۔ جب چندانی سیٹھ نے رائے صاحب کی ایک فیکٹری کے کچھ شیئرز خرید کر ان کا اعتبار حاصل کر لیا تو رندھیر کو بلوا لیا۔ اپنے باپ کے کالے دھندوں کا رندھیر کو علم تھا۔ اسی لئے وہ چندانی سیٹھ کی دولت پر عیش کرنے کو اپنا حق سمجھتا تھا۔

چندانی سیٹھ اپنے بیٹے کے انداز و اطوار اور بے راہ روی سے بخوبی واقف تھا اسی بناء پر اُس نے رندھیر کو سمجھایا تھا کہ وہ انشو کے معاملے میں محتاط رہے اور عمدہ برتاؤ اور سلیقے کے ساتھ انشو کا دل جیتے۔ رندھیر نے اپنے باپ کی نصیحت پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ اُسے خود پر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بھروسہ تھا۔

رائے صاحب اس پارٹی میں چندانی سیٹھ کے بے حد اصرار پر آئے تھے ورنہ تو اُنہیں کام سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔

جب چندانی سیٹھ کو یہ معلوم ہوا کہ رائے صاحب انشو کے لئے وشال کو پسند کر چکے ہیں تو اُسے جھٹکا لگا، مگر مایوسی نہیں ہوئی۔ رائے صاحب کو پارٹی سے جاتے دیکھ کر اس نے انہیں روک لیا اور کہا۔ ’’رائے صاحب! اگر آپ کو جلدی ہے تو میں نہیں روکوں گا، آپ چلے جایئے مگر براہِ کرم انشو بیٹی کو چھوڑ جایئے۔ یہ محفل بچوں کے لئے ہی تو ہے۔ اس سے بیٹی کو بھی لطف اندوز ہونے دیجئے۔‘‘

رائے صاحب نے لمحے بھر کو کچھ سوچا، پھر انشو سے پوچھا۔ ’’تم رُکو گی؟‘‘

’’رُکے گی کیوں نہیں۔‘‘ چندانی سیٹھ جلدی سے بولا۔ ’’میرا بیٹا دو سال بعد واپس آیا ہے، کچھ دن رہ کر چلا جائے گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ رائے صاحب نے وشال کی طرف دیکھ کر کہا۔ ’’تم دونوں بعد میں آ

جانا، میں گاڑی بھیج دوں گا۔‘‘

’’جی انکل۔‘‘ وشال نے آمادگی ظاہر کی۔

چندانی سیٹھ کو وشال کا رُکنا پسند نہیں آیا، مگر وہ مجبور تھا۔

رائے صاحب اپنی بیوی کو ساتھ لے گئے تو رندھیر خوشی سے کھل اُٹھا۔ رقص کا سلسلہ چلتا رہا۔ کچھ دیر میں چند بزرگ مہمان اور چلے گئے تو چندانی سیٹھ نے نوجوانوں کے بیچ حائل رہنا مناسب نہ سمجھا۔ جب اُس نے انشو کو رندھیر سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے دیکھا تو مطمئن ہو گیا۔

رندھیر تو باپ کے جانے ہی کا منتظر تھا۔ شام ہی سے اُسے شراب کی طلب ستا رہی تھی۔ چندانی سیٹھ کے جاتے ہی اُس نے ایک گوشے میں جا کر اپنی طلب پوری کی۔ دو پیگ چڑھانے کے بعد اُس نے رقص شروع کیا تو سبھی حیران رہ گئے۔ اُس نے انشو کو اپنے ساتھ رقص کرنے کی دعوت دی۔ انشو نے انکار نہ کیا۔ وشال بے وقوفوں کی طرح دیکھتا رہا اور انشو رندھیر کے ساتھ رقص کرتی رہی۔ دوسرے بھی ان کے ساتھ تھرکنے لگے۔

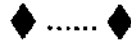
انشو کو اندازہ ہو چکا تھا کہ رندھیر نشے میں ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ رندھیر اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو رہا ہے۔ وہ اسی لئے ذرا فاصلہ رکھ کے رقص کر رہی تھی۔ اسی طرح رقص کے کئی راؤنڈ ہوئے۔

رندھیر کو نشہ چڑھ چکا تھا۔ ایک بار اُس نے رقص کے دوران انشو سے دست درازی کرنی چاہی۔ انشو نے لحاظ رکھے بغیر اُس کے رُخسار پر طمانچہ جڑ دیا۔ رندھیر کا نشہ جیسے پل بھر میں ہرن ہو گیا۔ انشو کی آنکھوں سے قہر و غضب کا اظہار ہو رہا تھا۔

رقص کرنے والے سبھی جوڑے حیران رہ گئے۔ آرکسٹرا تھم گیا۔ رندھیر کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ انشو اُس کے ساتھ یہ سلوک کرے گی۔ اُس کا جی چاہا کہ جواباً انشو کے رُخساروں پر اتنے تھپڑ مارے کہ رُخسار لہولہان ہو جائیں اور وشال کو بھی قتل کر دے۔

انشو پیر پٹختی ہوئی بنگلے سے باہر آ گئی۔ وشال اُس کے ساتھ تھا۔ انشو کی کار آ چکی تھی۔ دونوں کار میں بیٹھے اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

’’آوارہ......شرابی...... ذلیل!‘‘ انشو بڑبڑا رہی تھی۔



دوسرے روز صبح چندانی سیٹھ کو رات کا واقعہ معلوم ہوا تو اُس نے رندھیر کی بیوقوفی اور جلد بازی پر اُسے خوب ڈانٹا۔ ''اچھی طرح سمجھایا تھا کہ شراب کو ہاتھ نہ لگانا، پھر بھی تم نے شراب پی اور نشے میں سارا کھیل بگاڑ دیا۔ اگر تم ایک رات شراب نہ پیتے تو کیا مصیبت آ جاتی۔''

رندھیر چپ چاپ اپنے باپ کی ڈانٹ سنتا رہا۔ اُسے اپنی غلطی کا احساس تھا، مگر انشو اُس کے دل و دماغ پر چھا چکی تھی۔ انشو کو حاصل کرنے کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا، کسی بھی حد سے گزر سکتا تھا۔

چندانی سیٹھ بھی اتنی دولت اور جائیداد سے محروم نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اسی بناء پر اُس نے رائے صاحب کو فون کیا۔ گزشتہ واقعے پر اُس نے دُکھ کا اظہار کرتے ہوئے رائے صاحب سے معافی مانگی۔

''رائے صاحب! اُس کے دوستوں نے زبردستی اُسے پلا دی تھی، اسی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔ آپ کے سامنے اُس نے شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ وہ نشے سے دُور ہی رہتا ہے، چونکہ عادی نہیں ہے اس لئے پیتے ہی ہوش و حواس کھو بیٹھا۔''

''ٹھیک ہے، جو ہوا سو ہوا۔'' رائے صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔

رائے صاحب کو صبح ہی انشو نے پوری بات بتا دی تھی جسے سن کر وہ بھڑک اُٹھے تھے۔ چندانی سیٹھ نے ٹیلی فون کر کے معذرت کی تو اُن کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ انہوں نے یہ کہہ کے بات ختم کر دی۔ ''اب میں اس موضوع پر کوئی بات نہیں کروں گا۔''

''میں رندھیر کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔'' چندانی سیٹھ نے کہا۔ ''وہ بے حد شرمندہ ہے۔ آپ سے اور انشو بیٹی سے وہ خود معافی مانگنا چاہتا ہے۔''

''چندانی صاحب! اُسے یہاں بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں، بات کو اب ختم کر دیجئے۔'' رائے صاحب رُوکھے لہجے میں بولے اور رابطہ منقطع کر دیا۔

چندانی سیٹھ نے رائے صاحب کے الفاظ کو اپنی توہین سمجھا۔ وہ خطرناک آدمی تھا اور اپنا کام نکالنا بخوبی جانتا تھا۔ لیکن یہ معاملہ رائے صاحب کا تھا جو کوئی معمولی یا عام آدمی نہیں تھے۔ وہ نہ جانے کتنے تعلیمی اداروں، یتیم خانوں اور رفاہی اداروں کو چلا رہے تھے۔ راجیہ سبھا (قومی اسمبلی) کے ارکان بھی اُن کے پاس آتے تھے۔ درست اور

بروقت سیاسی مشورے دینے میں انہیں بڑی مہارت حاصل تھی۔

چندانی سیٹھ نے اسی لئے صبر کا گھونٹ پی لیا اور رندھیر سے کہا۔ ''سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکل گئی۔''

رندھیر بھی آسانی سے ہار ماننے والا نہ تھا۔ اُس کی رگوں میں چندانی سیٹھ ہی کا خون دوڑ رہا تھا۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ انشو کو اپنانے کا ایسا راستہ نکالے گا کہ انشو اُس کی بننے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس پر بھی انشو اُس کی نہ بنی تو کم از کم اُسے یہ خوشی تو ہوگی کہ انشو سے اپنی توہین کا بدلہ لے لیا۔



انشو کو دوبارہ دیکھنے کے بعد وجے کی چشمِ تصور میں اُس کی دُھندلائی ہوئی تصویر ایک بار پھر پوری طرح واضح ہوگئی۔ وہ انشو کو بھول جانا چاہتا تھا مگر اس نے ایک بار پھر سامنے آ کر وجے کے باطن میں ہلچل مچا دی تھی۔ انشو کو رندھیر سے ہنس ہنس کے باتیں کرتے دیکھ کر وہ حسد کی آگ میں جلنے لگا تھا۔ وہ اس سے لاعلم تھا کہ عشق کی پہلی منزل یہی ہے۔

اُس کا جی چاہا کہ انشو کو رندھیر کے کردار سے آگاہ کر دے، مگر ہمت نہ کر سکا۔ عشق آدمی سے اس کا حوصلہ بھی تو چھین لیتا ہے۔ عشق کے مختلف پہلو اور مختلف رنگ ہیں۔ ان سارے پہلوؤں اور رنگوں میں ہوس کا کوئی دخل نہیں۔ عشق پاکیزگی ہے، طہارت ہے، سچ ہے۔ ابھی وجے نے عشق کے صحرا میں پہلا ہی قدم رکھا تھا۔ وہ ابھی آبلہ پایانِ عشق کے انجام سے نا آشنا تھا۔ غالباً اسی لئے وہ تقریب چھوڑ کر چلا گیا، لیکن اُس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ جرم کی زندگی نہیں گزارے گا۔

انشو اُسے دیکھ کر جس طرح ٹھٹکی تھی، اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ وجے کو اچھا آدمی سمجھتی ہے۔ اگر کسی دن وہ پکڑا گیا اور اس کی تصویریں اخبارات میں چھپ گئیں تو انشو اُس کے بارے میں کیا سوچے گی؟ یہی سوچ کر اُس نے جرم کی دنیا کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کیا تھا۔

وجے نے اپنے فیصلے سے دیوان چند کو آگاہ کیا تو وہ فکرمند ہوگیا۔ چندانی سیٹھ کے گروہ کو چھوڑنا آسان نہ تھا۔ اس پر بھی دیوان چند نے وجے کو سمجھانا بہتر نہ جانا۔ وجے کو محبت کی راہ پر چلنے سے روک کر وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ دیوان چند کو خبر

تھی کہ اگر وجے بھڑک جاتا تو چندانی سیٹھ کو بھی خاطر میں نہ لاتا۔ اس خیال سے وہ چپ رہا کہ وجے کا غصہ شاید وقتی ہے جو دو ایک روز میں خود اُتر جائے گا۔

چندانی سیٹھ کا کام چھوڑ کر وجے کو آزادی مل گئی۔ اُس کا کام دیوان چند کرنے لگا۔ اُس نے چندانی سیٹھ کو بتایا تھا کہ وجے کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

وجے روزانہ ایک قریبی ہوٹل میں چلا جاتا تھا۔ یہ درمیانے درجے کا ہوٹل تھا۔ ہوٹل میں اوپر کمرے بھی تھے اور نیچے بال روم، کافی شاپ وغیرہ۔ وجے کے لئے اس ہوٹل میں ایک میز مخصوص تھی۔ وہ وہیں بیٹھ کر کافی پیتا، سگریٹ پھونکتا اور پھر بیروں کو تگڑی ٹپ دے کر چلا آتا۔ ہوٹل کے سبھی بیرے اسی لئے وجے کی خدمت پر آمادہ رہتے تھے۔

ایک روز وجے دن کے تین بجے ہوٹل پہنچا تو اُسے ہوٹل کے نزدیک انشو کی سفید غیر ملکی کار نظر آئی۔ یہی کار اس سے پہلے وجے نے ریلوے اسٹیشن پر دیکھی تھی۔ نمبر پلیٹ اور ڈرائیور کو دیکھ کر وجے پہچان گیا کہ یہ کار رائے صاحب کی ہے۔ یہ بات البتہ اُس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ اس دوسرے درجے کے ہوٹل میں رائے صاحب کا کیا کام!

وجے سر جھٹک کر آگے بڑھا ہی تھا کہ اُسے اس کار کے پیچھے دوسری ایک اور کار کھڑی نظر آئی جس کا بمپر پچکا ہوا تھا۔ اُس کی نمبر پلیٹ دیکھ کر وجے ایک بار پھر چونک اُٹھا۔ یہ چندانی سیٹھ کے زرخرید غنڈوں کی کار تھی۔ وہ اُلجھن میں مبتلا ہو گیا۔ اُسے بے چینی سی ہونے لگی۔ وجے کو یہ شک ہوا کہ شاید رندھیر کے جال میں پھنس کر انشو اس ہوٹل میں چلی آئی ہے۔ یہ سوچتے ہوئے اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ سیدھا ہوٹل کے ریستوران میں پہنچا اور اپنی مخصوص میز کی طرف بڑھ گیا۔

اپنی میز پر بیٹھ کر وجے نے اطراف کا جائزہ لیا تو اُسے چندانی سیٹھ کے کئی گرگے مختلف میزوں پر بیٹھے نظر آئے۔ انہوں نے بھی وجے کی طرف دیکھا مگر ایسے ہو گئے جیسے اُسے جانتے ہی نہ ہوں۔ وجے کو یوں بھی گروہ کے لوگوں سے ملنا جلنا اور بات کرنا پسند نہیں تھا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ اُس کی یہ عادت سبھی کے علم میں تھی۔

ہوٹل میں رندھیر نہیں تھا، مگر وجے کی بے چینی تھی کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ معاً ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح اُس کے ذہن میں آیا۔ اُس نے ویٹر کو قریب بلایا جو اُسے اچھی طرح پہچانتا تھا۔

''یہ سامنے جو لوگ بیٹھے ہیں، کیا ان کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟'' وجے نے ویٹر سے سرگوشی میں پوچھا۔

''ہاں.....'' ویٹر نے بھی دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ''وہ شخص اس وقت کمرہ نمبر ایک سو دو میں ہے۔''

وجے نے ویٹر کو رندھیر کا حلیہ بتا کر معلوم کیا۔ ''وہ شخص کیا ایسا ہے؟''

''جی ہاں، بالکل ایسا ہی ہے۔'' ویٹر نے بتایا۔

''اُس کے ساتھ کوئی لڑکی بھی ہے؟'' وجے نے اگلا سوال کیا۔

''لڑکی تو نہیں تھی.....'' ویٹر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اگر وہ پہلے سے اس کمرے میں موجود ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔''

ویٹر چلا گیا تو وجے نے سگریٹ سلگائی اور گہرے گہرے کش لینے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ انشو واقعی رندھیر کے جال میں نہ پھنس گئی ہو۔ ہو سکتا ہے وہ خود ہی رندھیر کی طرف بڑھی ہو.....مگر وہ اس طرح کی لڑکی نہیں تھی۔ پھر اُس نے سر کو جھٹکا دیا کہ مجھے کسی سے کیا غرض! لیکن دل تھا کہ مانتا ہی نہیں تھا۔

آخر سوچتے سوچتے وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور ہوٹل سے باہر انشو کی کار کے پاس پہنچ گیا۔ ڈرائیور کار میں بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ وجے نے سگریٹ جلانے کے لئے اُس سے بیڑی مانگی۔ ڈرائیور نے ماچس نکال کر اُس کی طرف بڑھا دی۔

وجے نے سگریٹ سلگائی اور پھر کار پر نظر ڈال کر بولا۔ ''بہت خوبصورت کار ہے۔ کس کی ہے؟''

''رائے صاحب کی کار ہے یہ!'' جواب دیتے ہوئے ڈرائیور کی گردن تن سی گئی۔

''اچھا..... رائے صاحب آئے ہیں۔''

''جی نہیں، اُن کی بیٹی آئی ہیں۔''

''اکیلی؟''

''جی.....'' ڈرائیور نے کہا، پھر چونک کر مشتبہ نظروں سے وجے کو دیکھنے لگا کہ یہ شخص ایسی باتیں کیوں کر رہا ہے؟''

''اچھا۔'' وجے بولا اور واپس ہوٹل میں چلا گیا۔ مطلوبہ معلومات اُسے حاصل ہو چکی

تھیں۔

لفٹ کے ذریعے وجے نے برق رفتاری سے سفر طے کیا۔ ذرا ہی دیر میں وہ کمرہ نمبر ایک سو دو کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ دروازے سے کان لگا کر اُس نے کچھ سننا چاہا، مگر ایئر کنڈیشنڈ کمرے سے کوئی بھی آواز باہر نہیں آ رہی تھی۔

وجے کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ایک انجانا سا خوف اُسے دہلائے دے رہا تھا۔ اُس نے دروازے پر آہستگی سے دستک دی، مگر دروازہ نہ کھلا۔ دوسری مرتبہ اُس نے زور سے دستک دی تو دروازہ تھوڑا سا کھلا۔ اس کے ساتھ ہی شراب کی بدبو بھی اُسے محسوس ہوئی۔ پھر رندھیر کا چہرہ نظر آیا۔

''کیا بات ہے؟'' رندھیر غرایا۔ اُس کی آنکھوں میں سرخی تیر رہی تھی۔

جواب میں وجے نے دروازے کو دھکا دیا اور اندر داخل ہو گیا۔ رندھیر نشے میں تھا اسی لئے دھکا کھا کر گر پڑا۔ کمرے میں انشو بھی تھی مگر بے حد خوفزدہ۔ اُس کی آنکھوں میں دہشت تھی۔ اندر کا منظر دیکھتے ہی پوری بات وجے کی سمجھ میں آ گئی۔

اچانک رندھیر اُٹھا۔ اُس نے جیب سے چاقو نکال کر کھولنا چاہا، مگر شراب نوشی کے سبب نہ تو اُس کے ہاتھوں نے ساتھ دیا نہ ٹانگوں نے۔ وجے نے اُس کی کلائی پکڑ کر مروڑی اور چاقو ہاتھ سے چھین لیا۔ پھر اُس نے ایک زوردار گھونسا رندھیر کے منہ پر مارا۔ اُس کے منہ سے خون کی دھار بہہ نکلی۔ وجے کا غصہ پھر بھی کم نہ ہوا۔ اُس نے دو تین تگڑے تگڑے ہاتھ رندھیر کے جڑ دیئے۔ رندھیر فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ انشو ابھی تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے وجے کو دیکھ رہی تھی۔ اُس نے عین موقع پر پہنچ کر انشو کی عزت کو پامال ہونے سے بچا لیا تھا۔

وہ باہر نکلی تو وجے اُس کے ساتھ تھا۔ انشو نے ابھی تک وجے سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ وجے کا شکریہ تک ادا نہیں کر سکی تھی۔

انشو اپنی کار کے پاس پہنچی تو ڈرائیور نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ انشو اندر بیٹھ گئی۔ وجے ایک طرف کھڑا رہا۔ انشو نے چاہا کہ نظر اُٹھا کر وجے کی طرف دیکھے اور اُس کا شکریہ ادا کرے، مگر اُس کی قوتِ گویائی جیسے جواب دے گئی۔ اُس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

وجے اُس کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ اُس نے بھی انشو سے کوئی بات نہ کی اور ڈرائیور سے کہا۔ ''میم صاحبہ کو ان کے گھر لے جاؤ۔''

چند لمحوں بعد کار وہاں سے جا چکی تھی۔ وجے دوبارہ ہوٹل کے ریستوران میں پہنچا۔ اُس کی کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اُسے ابھی بل بھی ادا کرنا تھا۔

ریستوران کے اندر چندانی سیٹھ کے آدمی ابھی تک مے نوشی کر رہے تھے۔ انہوں نے وجے کو دیکھا، اُس کی حالت سے ذرا بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کسی سے لڑ کر آیا ہے۔ وجے ان لوگوں کو نظر انداز کرتا ہوا اپنی میز پر جا بیٹھا اور دوبارہ کافی منگوائی۔ وہ خوش تھا کہ عین وقت پر پہنچ کر اُس نے انشو کو بچا لیا۔ مگر یہ بات اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ انشو وہاں کیوں آئی؟ وہ اس کمرے میں کس طرح پہنچی؟

ایک ویٹر، چندانی سیٹھ کے گرگوں کے پاس پہنچا اور اُن سے دھیمی آواز میں کچھ کہا۔ وہ سب اُٹھے اور ہوٹل سے باہر نکل گئے۔

وجے بھی باہر آ گیا۔ باہر آتے ہی اُس کی نظر رندھیر پر پڑی۔ وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ موجود تھا۔ سب کی آنکھوں میں غیظ و غضب تھا۔ رندھیر کی آنکھیں تو جیسے انگارے برسا رہی تھیں۔ وجے ذرا سی دیر میں معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اُس نے مطمئن انداز میں سگریٹ زمین پر پھینک کر جوتے سے مسل دی اور بے فکری سے آگے بڑھا۔ اسی وقت رندھیر نے وجے کے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔

''نمک حرام...... تیری یہ مجال! جس تھالی میں کھاتا ہے اسی میں سوراخ کرتا ہے!'' رندھیر نے گرج کر کہا۔

وجے پلٹا اور اُس نے رندھیر کے منہ پر گھونسا جڑ دیا۔ رندھیر کو گویا دن میں تارے نظر آ گئے۔ اُس کے آدمی ایک ساتھ وجے پر ٹوٹ پڑے۔ وجے نے اُن سب کی خوب ٹھکائی کی۔ اُسے بھی چوٹیں آئیں مگر جس کے بھی اُس کا ہاتھ پڑ گیا، وہ چکر کھا کر رہ گیا۔

کچھ ہی دیر میں وہاں بھیڑ لگ گئی۔ ہوٹل کے منیجر نے پولیس کو فون کر دیا۔ پولیس کے سائرن سن کر رندھیر اور اُس کے ساتھی حواس باختہ ہو گئے۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ کار میں سوار ہوئے اور پھر کار ہوا ہو گئی۔

پولیس موبائل آ کے رُکی تو اس میں سے ایک انسپکٹر اور کچھ سپاہی اُتر کر وجے کے

پاس آئے۔ وہ رومال سے اپنے ہونٹ پونچھ رہا تھا جن سے خون بہہ رہا تھا۔ پولیس انسپکٹر نے وجے سے پوچھا۔ ''یہ کون لوگ تھے؟ اور جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟''

وجے نے سوچا کہ چندانی سیٹھ کے بارے میں انسپکٹر کو بتا دے، لیکن اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ سوچنے لگا، میں خود بھی تو اسی گروہ کا آدمی رہ چکا ہوں۔ چندانی سیٹھ کے پاس میرے جرائم کے ثبوت ہیں۔

چندانی سیٹھ ایک عیار و ہوشیار مجرم تھا۔ لوگوں سے وہ جرائم کا ارتکاب کراتا اور پھر ان کے ثبوت ٹیپ کر لیتا یا ان کی فلمیں بنوا لیتا۔ یہی وجہ تھی کہ چندانی سیٹھ کے گروہ کا کوئی آدمی اُس سے بے وفائی نہیں کر سکتا تھا۔

''مسٹر! آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔'' انسپکٹر نے وجے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ...... میں ان غنڈوں میں سے...... ایک غنڈے کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اُسے کہیں دیکھا ہے۔''

''کہاں دیکھا ہے؟'' انسپکٹر نے سوال کیا۔

''وہ غنڈے ایک شریف لڑکی کو چھیڑ رہے تھے۔ میں نے اُنہیں روکا تو وہ مجھ سے اُلجھ پڑے۔''

''لڑکی کہاں ہے؟'' انسپکٹر نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''چلی گئی۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ وہ بے چاری شریف لڑکی تھی۔ اس جھگڑے کو بڑھتے دیکھ کر کھسک گئی۔''

''مگر مجھے تو تم بھی کچھ کھسکے ہوئے لگتے ہو۔'' انسپکٹر کا لہجہ بدل گیا۔ ''سچ سچ بتاؤ، کون تھی وہ لڑکی؟''

وجے چکرا کے رہ گیا۔ اُسے توقع نہیں تھی کہ پولیس انسپکٹر اُسی کو اپنا ہدف بنا لے گا۔



بڑی مشکل سے وجے نے پولیس انسپکٹر کو مطمئن کیا۔

''ٹھیک ہے۔ اگر وہ غنڈے دوبارہ آئیں یا تمہیں ان کے بارے میں کچھ یاد آ جائے تو اس حلقے کی پولیس چوکی پر چلے آنا۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''جی بہتر ہے۔'' وجے اقرار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

پولیس والے چلے گئے تو وجے اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آج میں نے انشو کی عزت بچائی ہے، کیا وہ مجھے یاد کر رہی ہو گی؟ ممکن ہے اُس کے دل میں میرے لئے جگہ بن گئی ہو۔ کاش ایسا ہو جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو میں اُس کے پیار کے سہارے اپنی زندگی کو بدل ڈالوں گا، مگر نہیں...... وہ بھلا مجھ جیسے مجرم کو کیوں قبول کرے گی؟ وہ انکار بھی کر سکتی ہے۔ اور مجھے کوئی حق نہیں کہ اس سیدھی، شریف اور اعلیٰ خاندان کی لڑکی کی زندگی میں تلاطم پیدا کر دوں۔ میں اُس کے پیار کو دل میں رکھ کر اُس کی پوجا کروں گا اور ساری زندگی اسی طرح گزار دوں گا۔



انشو اپنے بنگلے پر پہنچی تو رائے صاحب فیکٹری گئے ہوئے تھے۔ وہ اپنی ممی سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روتے روتے اُس نے آج کے حادثے کے بارے میں اُنہیں سب کچھ بتا دیا۔ ممی نے اُسے دلاسا دیا اور اُس کے آنسو پونچھے۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ اگر انشو کو کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آ جاتا تو اُن کا گھرانا کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ مجرم مرد ہوتا ہے مگر سزا لڑکی اور اس کے گھر والوں کو بھگتنی پڑتی ہے۔

اُنہوں نے اُس نوجوان کو دل ہی دل میں دُعائیں دیں جس کی وجہ سے اُن کی بچی بحفاظت گھر پہنچ گئی تھی۔ وہ اُن کی نازوں کی پالی اکلوتی بیٹی تھی جس کو خوش رکھنے کے لئے انہوں نے کیا کیا جتن نہیں کئے تھے۔ انہوں نے دل میں عہد کر لیا تھا کہ رندھیر کو

"تم ہمارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑ سکتے...... اور نہ ہم تمہیں چھوڑ سکتے ہیں۔" چندانی سیٹھ کی آواز میں درشتی کے ساتھ بڑا اعتماد بھی تھا۔ "تم یہ مت بھولو کہ تمہارے پتا جی اس وقت میری قید میں ہیں۔ اگر تم نے ہمارا ساتھ چھوڑنے کی حماقت کی تو ہم اُنہیں......" چندانی کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ وجے نے کہیں قریب ہی سے چیتوں کے گرجنے کی آواز سنی۔ وجے جانتا تھا کہ چندانی نے چیتے پال رکھے ہیں۔ غداری کرنے یا اپنا حکم نہ ماننے والوں کو وہ ان چیتوں کے آگے ڈال دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ان چیتوں کو زندہ انسان کے ٹکڑے کر کے کھانے میں بڑا لطف آتا تھا۔

وجے کے ہاتھ میں ریسیور تھا۔ اُس کا ہاتھ نمایاں طور پر کانپ رہا تھا۔ چندانی فون بند کر چکا تھا مگر وجے کے کانوں میں ابھی تک چیتوں کی غراہٹیں گونج رہی تھیں۔ وہ دانت پیس کر بڑبڑانے لگا۔

"مجھ پر بس نہیں چلا تو میرے پتا جی کو قید کر لیا۔ اب تو اُس کے پاس جانا ہی ہوگا۔ اور...... اور اُس کا کام بھی کرنا پڑے گا۔ ورنہ وہ نہیں...... نہیں...... اپنے پتا جی کو چیتوں کی خوراک نہیں بننے دوں گا۔"

اُس نے گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر تیزی کے ساتھ گھر سے نکل آیا۔ ٹیکسی کے ذریعے وہ تاج محل ہوٹل پہنچا۔

ایک نوجوان ٹہلتا ہوا اُس کے قریب آیا اور اپنا تعارف کرایا۔ "رمن۔"

وجے اُس کے ساتھ آگے بڑھا۔ رمن ایک کار کے پاس رُک گیا جس میں ایک آدمی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا اور دوسرا پیچھے۔ وجے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اب وہ دو آدمیوں کے درمیان میں تھا۔ گاڑی کے چلتے ہی اجنبی نوجوان رمن نے ایک چشمہ وجے کی طرف بڑھا دیا۔ "اسے پہن لو۔"

زبان سے کچھ کہے بغیر وجے نے چشمہ لے کر آنکھوں پر لگا لیا۔ صرف چند انتہائی با اعتماد افراد کے سوا چندانی کے اڈے پر جانے والے ہر شخص کو ایسا ہی مخصوص چشمہ پہننا پڑتا تھا۔ اس چشمے کو پہننے کے بعد باہر کا کوئی منظر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ چشمہ کیا تھا، ایک طرح آنکھوں پر باندھی گئی پٹی تھی، مگر دیکھنے والے یہی سمجھتے تھے کہ اس آدمی نے سیاہ چشمہ پہن رکھا ہے۔

کئی موڑ کاٹنے کے بعد کار ایک جگہ رُک گئی۔ وجے کو سہارا دے کر دونوں آدمیوں نے نیچے اتارا کیونکہ اُسے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چند قدم چل کر وجے نے ان آدمیوں کی مدد سے کچھ سیڑھیاں عبور کیں پھر وہ آگے بڑھے اور بائیں طرف مڑ گئے۔ کچھ دُور چل کے وہ رُک گئے۔ ایک شخص نے وجے کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اسی کے ساتھ وجے کی سماعت سے ایک عجیب سی آواز ٹکرائی۔ "غوں غوں...... بوں بوں......" ایک آدمی وجے کو لے کر آگے بڑھا۔ عجیب آوازیں مزید واضح ہوگئیں۔ اب دوسرا آدمی بھی آ گیا اور وجے کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں آدمیوں کے سہارے وہ پھر آگے بڑھا اور چند قدم کے بعد رُک گیا۔

معاً وہ اُچھل پڑا۔ عجیب آوازوں کے ساتھ ہی اُسے چیتوں کی گرج بھی سنائی دی تھی۔ وہ کئی بار اس اڈے پر آیا تھا اور ہر بار آنے کا یہی طریقہ اپنایا گیا تھا۔ گن کر وہ چار قدم آگے بڑھا، پھر چند سیڑھیاں چڑھ کر دوسری طرف کچھ سیڑھیاں اُتر گیا۔ چند قدم آگے بڑھنے کے بعد اُسے روک دیا گیا اور دونوں آدمی اُسے چھوڑ کر ہٹ گئے۔ وجے نے اپنی آنکھوں سے چشمہ اتار دیا۔ وہ چندانی سیٹھ کے سامنے کھڑا تھا۔ چندانی اپنی کرسی پر بیٹھنے کی بجائے ایک بڑی سی میز سے ٹکا کھڑا تھا۔ میز پر ایک کوڑا بھی رکھا تھا۔ چندانی اپنے باغیوں کو زدوکوب کرنے کے لئے چمڑے کا یہی کوڑا استعمال کیا کرتا تھا، پھر اُنہیں چیتوں کے آگے ڈال دیا کرتا تھا۔ میز پر سونے کے ایک بڑے تھال میں گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے رکھے تھے۔ کچھ دُور زنجیروں سے بندھے دو چیتے پُر اُمید نظروں سے چندانی کو دیکھ رہے تھے۔

چندانی سیٹھ نے گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا اُٹھا کر چیتوں کی طرف اُچھالا۔ دونوں چیتے اس گوشت کے ٹکڑے کی طرف اُچھل کر لپکے مگر وہ ٹکڑا ایک ہی چیتے کے ہاتھ لگا۔ چندانی نے دوسرا ٹکڑا دوسرے چیتے کی طرف اُچھال دیا۔ چندانی سے کچھ ہی دُور رندھیر بھی کھڑا تھا۔ وہ شعلہ بار نظروں سے وجے کو گھور رہا تھا۔ اُس کی ایک آنکھ سوجی ہوئی تھی اور پیشانی پر بھی زخم تھا جو ظاہر ہے وجے ہی کا "تحفہ" تھا۔ دوسرے لوگ بھی وجے کو خونخوار نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

یہ ایک بہت بڑا تہہ خانہ تھا۔ اس کی دیواروں پر بندوقیں بھی لٹکی ہوئی تھیں۔ اس ہال

کے علاوہ تہہ خانے میں چند کوٹھڑیاں بھی تھیں جن میں قیدی رہتے تھے۔ ان قیدیوں کو اس وقت تک نہایت عیش و آرام سے رکھا جاتا تھا جب تک ان کے رشتے دار یا عزیز چندانی سیٹھ کے لئے کام کرتے تھے۔ جب وہ چندانی کے لئے کام کرنے سے گریزاں ہوتے تو ان کے قیدی عزیزوں کو چیتوں کے سامنے ڈال دیا جاتا جو انہیں چیر پھاڑ کر اپنی خوراک بنا لیتے۔ اس قید خانے سے کسی قیدی کو زندہ نکلنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ انہی کوٹھڑیوں میں سے ایک کے اندر وجے کا پتا دیوان چند بھی قید تھا۔ اسے ہر طرح کا آرام دیا گیا تھا۔ اُس کے استعمال کی خاطر آرام دہ بستر تھا، میز کرسی تھی، مطالعے کے لئے کتابیں، رسالے اور اخبارات تھے۔

چندانی سیٹھ نے اپنا کوڑا اٹھایا اور چیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ان چیتوں کے بارے میں تو جانتے ہونا؟''

''ہاں۔'' وجے کی آواز میں بے خوفی تھی۔

''پھر بھی تم نے میرے بیٹے رندھیر پر ہاتھ اُٹھانے کی جرأت کی؟'' چندانی درشت لہجے میں بولا۔

''اس معاملے کا میرے اس کام سے کوئی تعلق نہیں جو میں آپ کے لئے کرتا ہوں۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔'' وجے نے بدستور بے خوف آواز میں کہا۔

''ہاں، یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ میں نے اپنے آدمیوں سے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ ان کے نجی معاملات میں دخل نہیں دوں گا۔'' چندانی کسی قدر نرم پڑ گیا۔ ''تمہارے پتا جی کو ہم نے عزت سے اپنا مہمان بنایا ہے تاکہ تم کبھی ہمارے کام سے انکار نہ کرو۔''

ابھی وہ مزید کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف اُس کا سیکرٹری تھا۔ اُس نے کسی کی کال آنے کی اطلاع دی۔ ''بات کراؤ!'' چندانی نے حکم دیا۔ چند لمحے بعد اُس نے کہا۔ ''جی، میں چندانی بول رہا ہوں۔ فرمایئے رائے صاحب، کیسے یاد کیا؟''

رائے صاحب کا نام سن کر وجے کے کان کھڑے ہو گئے۔ اُس نے چندانی کی طرف دیکھا۔ اب اُس کے چہرے پر تناؤ نظر آ رہا تھا۔

اچانک چندانی ہنستے ہوئے بولا۔ ''آپ کا جو دل چاہے کریں، میں نہیں روکوں گا، لیکن یہ یاد رکھیے گا کہ لڑکی کی عزت لڑکے سے زیادہ نازک ہوتی ہے۔ ہوٹل کا کمرہ

رندھیر کے نام تک تھا۔ آپ کی بیٹی انشو اُس کے کمرے میں خود گئی تھی۔''

وجے کو نہیں معلوم تھا کہ دوسری طرف سے کیا کہا گیا، لیکن یہ طے تھا کہ چندانی کی بات نے رائے صاحب کو ہلا دیا ہوگا۔

فون بند کر کے چندانی نے وجے کو مخاطب کیا۔ ''ہمیں ہمیشہ افسوس رہے گا کہ وہ لڑکی ہمارے ہاتھ سے بچ نکلی۔ دراصل رائے صاحب نے اپنی بیٹی کے لئے وشال کو پسند کیا تھا۔ چنانچہ رندھیر نے اپنے آدمی رائے صاحب کے بنگلے پر لگا دیئے کہ وشال بنگلے سے جائے تو اُسے یہ اطلاع مل جائے۔ پھر وشال بمبئی سے چلا گیا تو رندھیر نے اُس کی آواز بنا کر انشو کو ہوٹل بلایا۔ انشو دھوکا کھا گئی اور بے دھڑک ہوٹل چلی گئی۔ وہاں طے شدہ منصوبے کے مطابق رندھیر پہلے سے اس کا منتظر تھا۔ اگر رندھیر اپنے منصوبے میں کامیاب ہو جاتا تو رائے صاحب بحالت مجبوری رندھیر کو قبول کر لیتے۔ کیونکہ کسی ایسی لڑکی سے کون شادی کر سکتا تھا......! ویسے بھی رائے صاحب کو بلیک میل کر کے ہم خاصی دولت کما سکتے تھے، مگر خیر......'' کچھ توقف کے بعد چندانی پھر کہنے لگا۔ ''خیر جو ہوا سو ہوا۔ ہمیں اُمید ہے کہ مستقبل میں تم ہمارے ذاتی کام کو اپنا ذاتی کام نہیں سمجھو گے۔ ہم نے تمہیں رندھیر کے معاملے پر بات کرنے کو بلایا تھا، مگر ہم بات کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ کیونکہ تم ہمارے گروہ کے بہت اچھے اور ذہین نوجوان ہو۔ ہم تمہیں گنوانا نہیں چاہتے۔ جب تک تم ہمارے ساتھ کام کرتے رہو گے، ہم تمہارے پتا جی کو کوئی دُکھ نہیں دیں گے۔ تمہیں تمہارے کام کا معاوضہ بھی حسب معمول ملتا رہے گا۔ تمہارے پتا جی کو ہم اس لئے آزاد نہیں کر سکتے کہ اب ہمارے اور تمہارے تعلقات میں ایک گرہ پڑ گئی ہے......اور تم یقیناً یہ جانتے ہو گے کہ ہم کبھی کوئی خطرہ مول نہیں لیتے۔''

انسان کس قدر گر سکتا ہے، چندانی کو دیکھ کر یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔

''میں پتا جی سے مل سکتا ہوں؟'' وجے نے سوال کیا۔

''ضرور!'' چندانی نے جواب دیا۔ ''مگر ہمارے آدمیوں کی موجودگی میں۔'' پھر اُس نے اپنے دو آدمیوں کی طرف گھوم کر کہا۔ ''کمرہ نمبر پانچ۔''

تہہ خانے کے کونے میں کمرہ نمبر پانچ تھا۔ وجے کا باپ دیوان چند سلاخوں کے پیچھے کھڑا اُسی کا منتظر تھا۔ کمرے کے آگے لوہے کی سلاخوں کا ایک اور کٹہرا تھا تاکہ کوئی

بھی شخص قیدی کے قریب نہ جا سکے۔ وجے نے بغور جائزہ لیا، کمرے میں آرام کی ہر چیز تھی، ریڈیو، صوفہ تک تھا۔

دیوان چند کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وجے یہ دیکھ کر تڑپ اُٹھا، مگر درمیان میں آہنی کٹہرے کی وجہ سے وجے اُسے چھو بھی نہ سکا۔

''بیٹے! تو میری فکر مت کر اور اپنا مستقبل دیکھ!'' دیوان چند نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''[illegible] ہے پتا جی!'' وجے کی آواز کرب میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ''اپنے جیتے جی میں آپ کو [illegible] کی خوراک نہیں بننے دوں گا۔''

''[illegible] ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔'' پھر مزید کچھ کہنے سے پہلے اُس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ دراصل دیوان چند کو چندانی کے ان دونوں آدمیوں کا خیال آ گیا تھا جو وجے کے ساتھ تھے۔ اگر وہ اس وقت کوئی ایسی ویسی بات کرتا تو چندانی کے آدمی وجے کو یہاں سے باہر نکلتے ہی ختم کر دیتے۔

وجے کے ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے۔ اپنی دانست میں وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُس کا باپ دیوان چند اُس سے کیا کہنا چاہتا تھا؟ وجے کو احساس ہو گیا تھا کہ دیوان چند کچھ کہتے کہتے اچانک رُک گیا ہے۔ اس کا سبب وہاں چندانی کے آدمیوں کی موجودگی تھی۔ چندانی سیٹھ یقیناً بڑا چالاک تھا جس نے وجے کو دیوان چند سے تنہائی میں ملنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ وجے نے دیوان چند کی آنکھوں میں دیکھ کر اس کا پیغام پڑھا۔ ''میری فکر نہ کرو...... اپنی زندگی کا خیال کرو۔''

غیر محسوس طور پر وجے نے بغیر کوئی آواز نکالے اپنے ہونٹوں کو مخصوص انداز میں حرکت دی۔ یہ اُس پیغام کا جواب تھا جو وجے نے دیوان چند کی آنکھوں میں پڑھا تھا۔

''میں اپنی زندگی کی آخری سانس تک بھی آپ کی جان کی حفاظت کروں گا۔''

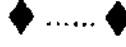
دونوں باپ بیٹوں نے ایک دوسرے سے مزید کچھ کہے بغیر آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے عزائم کا اظہار کیا۔ خاموشی کی بھی ایک زبان ہوتی ہے اور انہوں نے اپنی دانست میں اسی زبان کو اظہار کا ذریعہ بنایا تھا۔

''اچھا پتا جی، اب میں چلتا ہوں۔'' وجے نے چلتے ہوئے دیوان چند سے کہا۔

''جاؤ، بھگوان تمہاری رکھشا (حفاظت) کرے۔'' دیوان چند نے دُعا دی۔

تہہ خانے ہی میں وجے کو پھر چشمہ لگا لینے کی تاکید کی گئی۔ اُس نے آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھا لیا۔ دونوں آدمی اُسے سہارا دے کر اسی طرح واپس چل پڑے جس طرح وہاں لے کر آئے تھے۔ شہر کے ایک نواحی علاقے میں چندانی کے آدمیوں نے کار رُکوائی، وجے سے چشمہ واپس لیا اور اُسے کار سے اتار دیا۔

♦ ...... ♦



اُس رات انشو کو دیر تک نیند نہ آئی۔ وہ بار بار کروٹیں بدل رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں گزرے ہوئے منظر گھوم رہے تھے۔ ان سبھی منظروں میں [illegible] کو وجے سے پہلی ملاقات یاد آئی جب وہ ٹرین کے ایک ڈبے میں [illegible] ایک اسٹیشن سے وجے ٹرین کے اسی ڈبے میں سوار ہو گیا تھا۔ انشو [illegible] ہو رہا تھا کہ اگر وہ حسین و پُرکشش تھی تو وجے بھی مردانہ وجاہت میں کسی سے کم نہیں تھا۔ انشو کا یہ مزاج تھا کہ وہ کسی اجنبی سے جلد بے تکلف نہیں ہوتی تھی۔ وہ اسی لئے وجے کے ساتھ سفر کرنے کے باوجود اُس کا نام بھی نہ جان سکی۔ اپنے اور وجے کے درمیان اُس نے دانستہ ایک فاصلہ رکھا۔ وجے سے دوسری ملاقات بھی کبھی ہو سکے گی، انشو کو توقع نہیں تھی۔ مگر یہ ملاقات ہوئی اور پھر اُس تقریب میں وجے کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔ وجے سے تیسری ملاقات کا منظر انشو کی آنکھوں میں جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔

انشو سوچ رہی تھی کہ اگر وہ اجنبی مسافر جو اُسے ٹرین میں ملا تھا، ہوٹل میں نہ آتا تو کیا ہوتا؟ نتائج کے بارے میں سوچتے ہوئے اُس کا دل بار بار تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ نہ جانے وہ کس طرح دھوکا کھا کر رندھیر کے جال میں پھنس گئی تھی۔ اُسے ساری باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں۔

اُس روز وشال صبح ہی ''من ماڈ'' چلا گیا تھا جہاں اُس کے کچھ رشتہ دار رہتے تھے۔ وشال کو وہیں سے الہ آباد جانا تھا، لیکن دوپہر کو تقریباً ڈھائی بجے انشو کو وشال کا فون موصول ہوا۔ اُس نے بتایا کہ میں ابھی ''من ماڈ'' نہیں گیا ہوں اور بمبئی ہی کے ایک ہوٹل میں ہوں۔ اسی کے ساتھ اُس نے ہوٹل کا نام اور کمرہ نمبر بتایا۔

وشال سے یہ سن کر انشو کو حیرت ہوئی اور وہ بولی کہ تم ''من ماڈ'' کیوں نہیں

گئے ..... ؟ اگر کسی وجہ سے وہاں نہیں جا سکے تو بنگلے پر واپس آنے کی بجائے ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہو؟ مجھے اس کی وجہ بتاؤ......! وشال، تم...... بھگوان نہ کرے تم کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گئے؟''

جواب میں وشال نے بتایا۔ ''نہیں انشو، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

انشو کو یہ سن کر مزید حیرت ہوئی اور اُس نے وضاحت چاہی۔ ''کیسی باتیں؟''

''یہ باتیں ٹیلی فون پر کرنے کی نہیں ہیں۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو انشو!''

''سمجھ ہی میں تو کچھ نہیں آ رہا۔'' انشو نے اعتراف کیا۔

''تم میرے پاس آ جاؤ۔ میں تمہیں سب کچھ سمجھا دوں گا۔''

انشو نے سوچا، ہوسکتا ہے آج وشال اظہارِ محبت کرنے والا ہو۔ اُس کی آنکھوں میں تو میرے لئے محبت نظر آتی ہے مگر زبان سے کہنے کی ہمت نہیں ہے۔

''تم جو بات فون پر مجھ سے کہتے وقت شرما رہے ہو تو پھر سامنے وہ بات کیا کہو گے؟'' انشو نے شوخی سے کہا۔

''آ جاؤ پلیز! تمہارا بڑا احسان ہوگا مجھ پر۔'' وشال نے انکساری دکھائی۔

اس پر انشو کو ہنسی آ گئی اور یہی وہ لمحہ تھا جب اُسے وشال کی آواز کچھ بدلی بدلی سی لگی۔ انشو نے اس کا اظہار بھی کر دیا۔

''گلے پر موسم کا اثر ہے اور کوئی بات نہیں۔'' وشال نے اُسے اطمینان دلایا۔

انشو سوچنے لگی، وشال سے فون پر بات کرنے کا اُسے دو ایک بار ہی تو موقع ملا ہے، شاید آواز اسی لئے بدلی معلوم ہو رہی ہے۔ شک کو اُس نے اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔

اب وہ یہ سوچ رہی تھی کہ ایک نہ ایک دن تو مجھے وشال کی بیوی بننا ہی ہے...... کیا ہوا اگر آج اُس کے لئے میرا دل نہیں دھڑکتا۔ شادی کے بعد تو میرے دل کی ہر دھڑکن اُسی کی ہوگی۔ ایسی صورت میں اگر میں اپنے ہونے والے شوہر سے ملنے چلی جاؤں تو کیا مضائقہ ہوسکتا ہے۔

''اچھا وشال، میں آ رہی ہوں۔'' انشو نے فیصلہ سنا ہی دیا۔

''کتنی اچھی ہو تم۔'' وشال کے لہجے سے خوشی چھلکی پڑ رہی تھی۔

پھر انشو کو تیار ہو کر بتائے گئے ہوٹل تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

مطلوبہ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اُس نے دستک دی۔ دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی اور اسی کے ساتھ انشو کے دل و دماغ کو شدید جھٹکا لگا۔ کسی مضبوط اور سخت ہاتھ نے اُس کی کلائی کو پکڑ کر اُسے اندر کھینچ لیا۔ اُس نے دروازہ بند کرنے میں بھی دیر نہیں لگائی تھی۔

''رندھیر...... تم!'' انشو نے اُسے پہچان لیا۔

''ہاں میں جانِ من!'' رندھیر بے حیائی سے ہنسا۔

انشو نے پلٹ کر بھاگنا چاہا لیکن رندھیر نے اُس کا راستہ روک لیا۔

''تم آئی اپنی مرضی سے ہو، مگر جاؤ گی میری اجازت سے۔'' یہ کہتے ہوئے رندھیر نے دونوں بازو اس طرح پھیلا دیئے جیسے اُسے پکڑنا چاہتا ہو۔

''لگتا ہے کہ تم...... تم نے میرے ساتھ دھوکا...... دھوکا کیا ہے۔'' انشو گھبرا گئی۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، کیا کرے۔

''محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ تم چاہو تو محبت کا نام دھوکا رکھ لو۔''

رندھیر کی آنکھوں میں ہوس دیکھ کر انشو کے ہوش اُڑ گئے...... اور پھر اسی کے بعد وہ اجنبی، وہ دیوتا، وہ مسافر ایک فرشتے کی طرح رندھیر اور اُس کے درمیان آ کھڑا ہوا تھا۔

اُس نے نہ صرف انشو کی عزت بچائی بلکہ غنڈوں کی بھی خوب دُرگت بنائی۔

نہ جانے وہ کون تھا؟ انشو سوچنے لگی۔ کہاں رہتا ہے وہ؟ قدرت نے اب تک اُس اجنبی سے مجھے تین بار ملایا، پتہ نہیں اب کبھی وہ مل سکے گا یا نہیں؟

سوچتے سوچتے انشو کا دل عجیب انداز سے دھڑکنے لگا۔ یہ اُس کے لئے ایک انوکھا تجربہ تھا۔ اس سے پہلے کبھی کسی نوجوان کے لئے انشو کا دل یوں نہیں دھڑکا تھا۔ اس کے دل میں کسک تھی، مگر اس کسک میں بھی مٹھاس تھی۔

''شاید اسی کا نام محبت ہے۔'' بے اختیار وہ بڑبڑانے لگی۔ ''مگر...... مگر میں...... میں تو کسی اور کی ہوں...... پھر ایک اجنبی کے لئے یہ تڑپ کیوں؟''

انشو ایک عجیب سی اُلجھن میں گرفتار ہوگئی۔ اُس کا دل رونے کو چاہ رہا تھا، مگر اجنبی مسافر کے سینے سے لگ کر!

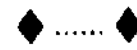
آخر یہ کیا ہے؟ میں کیوں ایسا سوچ رہی ہوں؟ یہ میرے سینے کے اندر آگ سی کیسی لگی ہوئی ہے؟'' انشو کو اپنے دل کے آئینے میں اجنبی نوجوان کی تصویر نظر آئی۔ آخر اسی تصویر کے نقوش کو اپنی آنکھوں میں بسائے وہ سو گئی۔

پھر چند روز اور گزرے تو اس اجنبی کی تصویر انشو کے دل میں دُھندلانے کی بجائے اور بھی گہری ہو گئی۔ تب اُسے یقین کرنا ہی پڑا کہ وہ اجنبی نوجوان کی محبت میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اب وہ شب و روز اُسی کے خیالوں میں کھوئی رہتی تھی۔ اُسے یوں لگتا تھا جیسے وہ دونوں جنم جنم کے ساتھی ہیں اور اب اس کے لئے اجنبی محبوب کو بھلانا کسی طرح ممکن نہیں۔

وہ ہر شب سونے سے پہلے دُعا کرتی کہ کاش ایک بار، صرف ایک بار وہ اجنبی اُس کے سامنے آ جائے تو وہ کم از کم اس کا شکریہ تو ادا کرے۔ شاید اس بہانے وہ اجنبی اُس کے دل کا راز بھی جان لے۔ رات کی تنہائیوں میں تو وہ ''دیوتا'' اپنی کمی شدت سے محسوس کراتا تھا۔

کیا میں اُسے بھول نہیں سکتی؟ وہ سوچتی اور ہر بار کوئی اُس کے اندر سے جواب دیتا، نہیں...... اس اجنبی کو نہیں بھلایا جا سکتا!

پھر نہ چاہتے ہوئے بھی انشو کی پلکیں بھیگ جاتیں۔ وہ سوچتی، میں نے ٹرین میں اس اجنبی مسافر سے بات کیوں نہ کی؟ پھر مجھے دوسرا موقع بھی ملا، میں رندھیر کی پارٹی میں اُس سے ملاقات کر سکتی تھی...... کم سے کم اُس کا نام تو پوچھ ہی لیتی۔ نہ جانے وہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟



ایک دن پھر وجے کو چندانی سیٹھ کے سامنے حاضر ہونے کا حکم ملا۔ اُس نے بادل نخواستہ اس حکم کی تعمیل کی اور مقررہ مقام پر پہنچ گیا۔ چندانی کے آدمی سے ملنے کے بعد اُس نے حسب معمول مخصوص چشمہ آنکھوں پر لگا لیا۔ طے شدہ طریقۂ کار کے مطابق اُسے چندانی کے پاس پہنچا دیا گیا۔

اس روز بھی چندانی سیٹھ اپنے مخصوص انداز میں میز کے سہارے کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں کوڑا تھا۔

''کل صبح تمہیں شالیمار ہوٹل کے سامنے ہمارا آدمی ملے گا۔'' چندانی، وجے سے مخاطب ہوا۔ اُس کی آواز سپاٹ اور کسی بھی جذبے سے عاری تھی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے اُس نے مزید کہا۔ ''اُس کے ساتھ کمو بھی ہوگی۔ ہمارا آدمی تمہیں ایک سوٹ کیس دے گا۔ تمہیں اپنی جان سے زیادہ اس سوٹ کیس کی حفاظت کرنی ہے۔ پھر سوٹ کیس اور کمو کو ساتھ لے کر تم گوا جاؤ گے، اسی کار میں۔ تم جب شہر کی حدود سے نکل کر ویران علاقے میں پہنچو تو ہپی کا روپ اختیار کر لینا۔ اپنے گھر سے تم ہپیوں والا لباس پہن کر نکلنا، لیکن باقی سامان داڑھی، مونچھ، چشمہ، مالا اور رنگین کوٹ ساتھ رکھنا۔ یہ چیزیں کسی ویران جگہ لگا لینا۔ اسٹور روم سے تم اپنی ضرورت کی چیزیں ساتھ لے جاؤ۔ باقی سامان تمہیں کمو دے گی۔ پانڑجی، گوا میں منڈووی ہوٹل کے کمرہ نمبر ستائیس میں تمہیں جارج نامی ایک شخص ملے گا۔ یہ ہے اس کی تصویر۔'' چندانی نے میز پر ایک تصویر رکھ دی۔ ''اس چہرے کو اپنے حافظے میں محفوظ کر لو۔''

وجے نے چندانی کی ہدایت پر بڑی توجہ سے وہ تصویر دیکھی۔

پھر چندانی نے تصویر واپس اپنی جیب میں رکھ لی۔ وہ ایک محتاط شخص تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اگر وجے پولیس کے ہاتھ لگے تو اُس کے ایک گاہک کی تصویر بھی پولیس کے پاس پہنچ جائے۔ وجے کے لئے یہ تمام معاملات نئے نہیں تھے۔ وہ ان باتوں اور مصلحتوں کو سمجھتا تھا۔

''ہوٹل منڈووی میں تم اور کمو مسٹر اور مسز جوزف کے نام سے ٹھہرو گے۔'' چندانی پھر ہدایات دینے لگا۔ ''جارج سے مل کر تم اُس سے اپنا سوٹ کیس بدلو گے۔ جو سوٹ کیس وہ دے، تم ہمارے پاس لے آنا۔ تمہیں کچھ پوچھنا ہے؟'' اپنی بات ختم کر کے چندانی نے سوالیہ نظروں سے وجے کی طرف دیکھا۔

''نہیں۔'' وجے نے انکار میں سر ہلا دیا۔

چندانی نے اطمینان کا سانس لیا اور سگار ہونٹوں کے درمیان رکھ کر جلانے لگا۔

''میں پتا جی سے مل سکتا ہوں؟'' وجے نے پوچھا۔

''ضرور۔'' چندانی نے سگار کا دھواں فضا میں پھیلاتے ہوئے جواب دیا۔ پھر اپنے دو آدمیوں کو اشارہ کیا۔

چندانی سیٹھ کے وہ دونوں آدمی وجے کو ساتھ لے کر دیوان چند کی کوٹھڑی کی طرف بڑھ گئے۔

دیوان چند سے مل کر آج بھی وجے نے محسوس کیا کہ وہ اس سے کچھ کہنا چاہ رہا ہے، مگر کیا......؟ شاید یہی کہ وجے اس کی فکر نہ کرے اور جرائم کی اس دنیا کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دے۔ سیدھی راہ اپنا لے۔ ہر باپ اپنی اولاد کو برے راستوں اور کاموں سے بچانا چاہتا ہے۔ وجے کو اس کا بخوبی علم تھا۔ اس کے باوجود وجے ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ چندانی اُس کے انکار سے خفا ہو کر دیوان چند کو چیتوں کے آگے ڈال دے۔ کچھ دیر اپنے باپ کے سامنے رہ کر اور اُسے تسلی دے کر وجے وہاں سے چلا آیا۔

دوسرے دن صبح دس بجے وجے شالیمار ہوٹل کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ سرخ کوٹ اور کالی پتلون پہنے ہوئے تھا، ہونٹوں میں سگریٹ دبا تھا۔ یکایک اُس کے پاس ایک کار آ کر رُکی جسے ایک خوبصورت لڑکی چلا رہی تھی۔ یہی کمو تھی جس کے بارے میں گزشتہ روز چندانی سیٹھ نے بتایا تھا۔ وہ بڑی ماڈرن اور فیشن ایبل لڑکی تھی۔ آنکھوں پر لگے سیاہ چشمے کے باعث اُس کا گورا چہرہ اور بھی دمک رہا تھا۔ اُس کی زلفیں کندھوں تک جھول رہی تھیں۔ پچھلی سیٹ پر چندانی کا آدمی ڈرائیور کی وردی میں بیٹھا تھا۔ وجے کار کا دروازہ کھول کر کمو کے برابر بیٹھ گیا۔ اسی کے ساتھ کار آگے بڑھ گئی۔ کچھ دُور جا کر کار رُکی تو ڈرائیور کی وردی میں ملبوس آدمی سوٹ کیس عقبی سیٹ پر چھوڑ کر اُتر گیا۔ کمو نے کار آگے بڑھا دی۔

وجے نے اب تک اپنے گروہ کی کسی لڑکی میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ یہ الگ بات کہ سبھی لڑکیاں اُس کے قرب کی خواہشمند تھیں اور اُس کے ایک اشارے پر جان تک دینے کو تیار تھیں۔ وہ اپنے کام میں کسی بھی لڑکی کا ساتھ صرف اس صورت میں قبول کرتا تھا جب اس کی بہت ضرورت ہوتی تھی۔ وہ کام کے سلسلے میں پہلے بھی کئی بار کمو کے ساتھ شریک رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ کمو سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ کمو بھی انہی لڑکیوں میں تھی جو اس پر جان دیتی تھیں۔

''سنا ہے باس تم سے ناراض ہے؟'' کمو نے سوال کیا۔

''ہوا کرے، مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔'' وجے نے بیزاری سے جواب دیا اور پھر

سگریٹ نکال کر جلانے لگا۔

''مون بھی یہی کہہ رہا تھا۔'' کمو بولی۔

''کون مون؟'' وجے نے دریافت کیا۔

''ہے ایک۔ میں کئی بار اُس کے ساتھ کام کر چکی ہوں۔'' کمو نے بتایا۔ ''اُس کی ماں ہمیشہ بیمار رہتی ہے۔ مون کو کہیں ملازمت نہیں ملی تو وہ اس گینگ میں پھنس گیا۔ تین سال تک وہ کام کرتا رہا، پھر اُس کی ماں کو کام کی نوعیت کے بارے میں پتہ چل گیا۔ ماں نے بیٹے کو اپنی قسم دی اور کہا کہ یہ ملازمت فوراً چھوڑ دے۔ مون نے یہ ساری بات باس کو بتائی کہ اُس کی بیمار ماں نہیں چاہتی کہ مون اس کے لئے مزید کام کرے۔ اس پر باس نے مون کو سمجھایا کہ وہ اپنی ماں کو اس کے پاس لے آئے۔ وجہ پوچھنے پر باس نے کہا، تمہاری ماں کو میں سمجھا دوں گا۔ مجھے اُمید ہے کہ میں انہیں مطمئن کر دوں گا اور پھر وہ تمہیں میرے ساتھ کام کرنے سے نہیں روکیں گی۔ مون باتوں میں آ گیا اور اپنی ماں کو باس کے پاس لے آیا۔ باس نے مون کی ماں کو تمہارے باپ کی طرح قید کر دیا۔ پھر باس نے مون کو طلب کیا، مگر اسی عرصے میں مون کی ماں مر گئی۔ مون کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اُس نے نہ آنے ہی میں اپنی بھلائی سمجھی۔''

''مون کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ اُس کی ماں مر گئی؟'' وجے نے کمو سے معلوم کیا۔

کمو اس پر سٹپٹا گئی، پھر کہنے لگی۔ ''مون تک یہ اطلاع میں نے پہنچائی تھی۔''

''کیوں؟'' وجے نے سوال کیا۔

''اس لئے کہ میں مون سے پیار کرتی تھی۔ وہ...... وہ بھی مجھے چاہتا تھا۔'' کمو جذباتی سی ہو گئی۔ اس کا اظہار کمو کی آواز سے بھی ہو رہا تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے وہ مزید بولی۔ ''مگر...... مگر مون کو اپنی ماں سے زیادہ پیار تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر باس اُس کی ماں کو قید نہ کرتا تو وہ شاید ابھی نہ مرتی۔''

کار شہر کی بھیڑ بھاڑ سے نکل کر اب نسبتاً ویران علاقے میں آ گئی تھی۔ وجے نے پیچھے سے ایک دوسرا سوٹ کیس اٹھایا اور اس میں سے نقلی داڑھی مونچھوں کے ساتھ ہی دوسرا سامان نکال کر ہپیوں جیسا میک اپ کرنے لگا۔ وہ اِردگرد کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔

کمو نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''مون نے کئی بار باس کا سامان پکڑوایا۔ وہ تو چاہتا تھا

کہ کسی وقت باس کو بھی گرفتار کرا دے، مگر اُسے باس کے اصل اڈوں کا علم نہیں تھا۔ باس جانتا ہے کہ مون اُس کا دشمن ہو چکا ہے۔ اسی وجہ سے اُس نے مون کو قتل کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ مگر وہ کسی کے ہاتھ ہی نہیں لگ رہا۔ اُس سے میری آخری ملاقات فون پر اس وقت ہوئی تھی جب میں نے اُس کی ماں کے مرنے کی خبر دی تھی۔''

''تم اس گینگ میں کیسے شامل ہوئیں؟'' وجے نے کمو سے پہلی بار پوچھا۔

''ہر فرد کی کوئی نہ کوئی مجبوری ضرور ہوتی ہے۔'' کمو نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔''باس انہی مجبوریوں کا خریدار ہے۔'' کمو نے طویل سانس لیا پھر چند لمحے توقف کے بعد کہنے لگی۔''باس کے اشارے پر ایک لڑکی نے مجھے اس گروہ میں شامل کرا دیا۔ اب میں کچھ اس طرح پھنس چکی ہوں کہ چاہتے ہوئے بھی اس جال سے نہیں نکل سکتی۔ میرے دو چھوٹے بہن بھائی ہیں۔ میں انہیں پڑھا لکھا کر ان کے پیروں پر کھڑا کرنا چاہتی ہوں تاکہ وہ میری طرح جرم کی راہ پر نہ چلیں۔''

اس دوران وجے اپنا حلیہ مکمل طور پر بدل چکا تھا۔ اب کمو کے برابر میں لمبی داڑھی مونچھ والا ایک ہپی بیٹھا تھا جس کی آنکھوں پر گول سیاہ چشمہ اور گلے میں موتیوں کی بڑی سی مالا تھی۔ اُس نے عقب نما آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور مطمئن انداز میں سر ہلا دیا۔ معاً اُس کی نظر اپنی گاڑی کے پیچھے اُس کار پر پڑی جو بہت تیزی سے قریب آتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وجے کے کانوں میں پولیس سائرن کی آواز بھی آنے لگی۔

وجے نے پلٹ کر پھر پیچھے کی طرف دیکھا اور کمو سے بولا۔''لگتا ہے مون کی مخبری پر پولیس ہمارے پیچھے لگ گئی ہے۔ باس سے اپنا انتقام لینے کی غرض سے اُس نے تمہاری محبت کو بھی قربان کر دیا...... اُس نے تمہاری بھی فکر نہ کی۔''

''ہو سکتا ہے۔'' کمو نے کہا۔ وہ بھی پیچھے کا جائزہ لے رہی تھی۔ یقیناً اُس کے اعصاب مضبوط تھے ورنہ پولیس کے بارے میں جان کر وہ گھبرا جاتی۔ اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔''میں تمہیں بتا چکی ہوں نا کہ مون مجھ سے زیادہ اپنی ماں کو چاہتا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے کمو نے ایکسیلیٹر پر پورا دباؤ ڈال دیا۔

کار فراٹے بھرنے لگی۔ پولیس اب بھی پیچھے لگی ہوئی تھی مگر درمیانی فاصلہ تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک موڑ آیا تو اچانک وجے کے اشارے پر کمو نے پوری قوت سے بریک لگا دیئے۔ کار دُور تک گھسٹتی چلی گئی۔

وجے نے سوٹ کیس اٹھایا اور پھرتی سے کار کا دروازہ کھول کر باہر کود گیا۔ اُس کے کودتے ہی کمو نے طوفانی انداز سے کار آگے بڑھا دی۔ سڑک کے کنارے ایک جھاڑی کی آڑ میں وجے دبک گیا۔ پولیس سائرن کی آواز اب قریب آتی جا رہی تھی۔

کمو کے بارے میں وجے کو یقین تھا کہ اب وہ معمول کے مطابق کار چلا رہی ہو گی۔ ویسے بھی اُس کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس کے باعث پولیس اُسے پکڑتی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر سوٹ کیس پولیس کے ہاتھ لگ گیا تو وہ پکڑا جائے گا۔ اسی کی بناء پر چندانی کا گاہک جارج بھی پولیس کے ہتھے چڑھ جائے گا۔ مگر چندانی کو پولیس نہیں پکڑ سکے گی۔ اس کے برعکس ہو گا یہ کہ اس کے باپ دیوان چند کو چندانی چیتوں کے آگے ڈال دے گا۔ اگر یہ سوٹ کیس واپس چندانی کے پاس پہنچ گیا تو اس کا کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ گوا والا کام بعد میں ہو سکتا ہے۔

پولیس موبائل وجے کی پناہ گاہ کے قریب سے بہت تیزی کے ساتھ نکل گئی۔ اُس نے سکون کا سانس لیا اور کھڑا ہو گیا۔ لیکن یہ دیکھ کر اُس کے اوسان خطا ہو گئے کہ پیچھے سے ایک اور پولیس کار آ رہی تھی۔ پولیس کار میں موجود افسر نے اُسے دیکھ لیا تھا۔ وجے نے وہاں رُکنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ سڑک کے کنارے چڑھائی کی طرف دوڑا۔ پولیس کار میں موجود انسپکٹر نے وجے پر گولی چلا کر اُسے رُکنے کا حکم دیا۔

''رُک جاؤ...... ورنہ مارے جاؤ گے۔'' پولیس انسپکٹر نے چیخ کر کہا۔

انسپکٹر کی وارننگ کے باوجود وجے نہیں رُکا۔ گولی اُسے نہیں لگی تھی۔ رُکنے کی بجائے وہ تیزی سے چڑھائی کی طرف بھاگتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر پولیس نے اُسے پکڑ لیا اور اُس کی تصویر اخبارات میں چھپ گئی تو وہ انشو کے سامنے نظر اُٹھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ وہ سوچے گی کہ اُس کی عزت بچانے والا ایک جرائم پیشہ شخص تھا۔ اس خیال سے جیسے وجے کے جسم میں نئی قوت آ گئی۔

اُس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ پولیس والے بھی اب اُس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ وہ کار سے اُتر گئے تھے۔ انہوں نے وجے کو روکنے کی خاطر دو تین فائر بھی کیے مگر

وجے نے کوئی پرواہ نہیں کی۔ وہ بہت تیز بھاگ رہا تھا جبکہ اُس کے مقابلے میں پولیس والوں کی رفتار کم تھی۔ ایک چھوٹی چٹان کے ڈھلان پر وہ اُترا تو پولیس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اُس نے جلدی جلدی اپنی نقلی داڑھی مونچھیں اُتار کر پھینکیں، پھر وِگ بھی اُتار کر جھاڑیوں میں پھینک دی، پھر کوٹ اُتارا اور پلٹ کر پہن لیا۔ اب اُس کا حلیہ بالکل بدل چکا تھا۔ سفید کوٹ اور سیاہ پتلون میں جیسے اُس کی شخصیت ہی بدل گئی تھی۔

اپنا حلیہ بدلنے کے ساتھ ہی وجے نے بڑی پھرتی کے ساتھ آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ پہاڑی راستہ ناہموار تھا مگر وجے اس پر بھی خاصی تیزی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

ایک اور ڈھلان سے اُترنے کے بعد وہ ایک سڑک تک پہنچا۔ اُس کا ارادہ تھا کسی آتے جاتے ٹرک سے لفٹ لے کر نکل جائے گا۔

اچانک وجے کی نظریں اُس امپورٹڈ کار پر پڑیں جو سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ کار سفید تھی اور اُس کا بونٹ کھلا ہوا تھا۔ کار کے اندر اور باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ وجے کار کے پاس پہنچا تو ایک دم اُسے جھٹکا لگا۔ وہ کار رائے صاحب کی تھی۔ وہ سوچنے لگا، رائے صاحب اس ویرانے میں اپنی کار چھوڑ کر کہاں چلے گئے؟ پھر وجے نے انشو کو دیکھا اور چونک اُٹھا۔ سڑک کے دوسری طرف واقع ڈھلان سے چڑھتی ہوئی انشو اوپر آ رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں پلاسٹک کی بڑی سی ایک بوتل تھی۔ وجے کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو اُسے انشو کا خیال آیا تھا۔

وجے پہلے بھی پولیس کو کئی بار چکمہ دے چکا تھا۔ آج بھی قسمت نے اُس کا ساتھ دیا تھا۔ اُس نے پھرتی سے اپنا سوٹ کیس عقبی سیٹ پر ڈال دیا، پھر بونٹ کے پاس آ گیا۔ انشو اُسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اُس کے ہاتھ سے پلاسٹک کی بوتل گرتے گرتے بچی۔ اپنے دل کی خوشی چھپانا اُس کے لئے مشکل ہوگیا۔ اُس کے ہونٹوں پر دلآویز مسکراہٹ بکھر گئی۔ وجے کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی زندگی میں ایک نیا سورج طلوع ہو رہا ہے۔ اُس نے جوابی مسکراہٹ کے ساتھ انشو کا استقبال کیا۔

''آپ ... آپ یہاں کیسے؟'' انشو نے خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سوال کیا۔

''دراصل میں ایک ٹرک کے ذریعے یہاں سے جا رہا تھا۔ ٹیکسی نہیں مل سکی تھی نا۔ تو

میں نے آپ کو ڈھلان سے اُترتے ہوئے دیکھا اور...... آپ کی کار بھی دیکھ لی۔ میں یہ سوچ کر ٹرک سے اُتر آیا کہ ہوسکتا ہے آپ کو مدد کی ضرورت ہو۔'' وجے نے تفصیل کے ساتھ جواب دیا۔ مقصد انشو کو مطمئن کرنا تھا۔

''بہت اچھا کیا آپ نے۔'' انشو مسکرا کر بولی۔ ''میں پانی لینے ڈھلان سے نیچے چشمے تک گئی تھی۔''

انشو بونٹ کی طرف بڑھنے لگی تو وجے نے اُس سے پانی کی بوتل لے لی اور پانی ڈالا، پھر ڈھکن بند کیا اور بونٹ نیچے کر دیا۔

انشو ڈرائیونگ سیٹ پر آ گئی اور وجے اُس کے برابر بیٹھ گیا۔ اسی وقت وجے نے پولیس انسپکٹر اور اُس کے ساتھ سپاہیوں کو دیکھا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں نقلی داڑھی، مونچھیں، وِگ اور موتیوں کی مالا تھی۔ پولیس والے اُنہی کی طرف آ رہے تھے۔

پولیس انسپکٹر نے انشو کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ اس وقت وجے کی عجیب حالت تھی۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا، اگر ڈرائیونگ سیٹ پر انشو کی بجائے کمو ہوتی تو اب تک کار اُڑا لے جاتی۔ پولیس انسپکٹر شہر کی معزز ترین شخصیت رائے صاحب کی بیٹی انشو کو پہچانتا تھا۔

وجے پر ایک نظر ڈالنے کے بعد پولیس انسپکٹر انشو کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''معاف کیجئے گا انشو جی، اِدھر آپ نے کسی مشتبہ شخص کو تو نہیں دیکھا؟ وہ سرخ کوٹ پہنے ہوئے ہے۔'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''جی نہیں انسپکٹر، میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا۔'' انشو نے جواب دیا۔ اسی کے ساتھ سوال کیا۔ ''کیوں... کیا ہوا؟''

''ایک مجرم ہماری آنکھوں میں دُھول جھونک کر بھاگ نکلا ہے۔'' انسپکٹر نے نقلی داڑھی، مونچھ اُسے دکھا کر کہا۔ ''وہ اِسی کے حلیے میں تھا۔''

وجے کا حلق سوکھنے لگا۔ انسپکٹر نے وجے کی طرف غور سے دیکھا۔ وجے نے منہ پھیر لیا۔

''آپ؟'' انسپکٹر کا لہجہ سوالیہ تھا اور اُس کی انگلی وجے کی طرف اُٹھی ہوئی تھی۔

وجے کا تو سانس ہی رُکنے لگا۔ انشو بھی پریشان ہوگئی۔ اُسے یاد آیا کہ اُس دن ٹرین

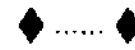
میں بھی اس شخص کی آمد کے بعد پولیس کسی سردار جی کو ڈھونڈتی ہوئی آئی تھی اور آج بھی تقریباً ویسی ہی صورتحال تھی۔

انشو نے وجے کی طرف دیکھا۔ وجے کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔ وہ انشو کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات سے کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسری جانب انشو کا شبہ یقین میں بدلنے لگا تو وہ اندر ہی اندر کانپ اُٹھی۔

یہ بڑے نازک لمحات تھے۔ بازی پلٹنے میں دیر نہ لگتی، وجے کو اس کا پوری طرح احساس تھا۔ اسی کار کی پچھلی سیٹ پر وہ سوٹ کیس رکھا ہوا تھا جو وجے کو مجرم ثابت کرنے کے لئے کافی تھا، ایک ایسا مجرم جو متعدد بار پولیس کو جُل دے کر فرار ہو چکا تھا۔

وجے کی خاموشی بھی انشو کے لئے معنی خیز تھی۔ پولیس انسپکٹر سے وہ خود بھی تو اپنا تعارف کرا سکتا تھا۔ پھر اُس نے ایسا کیوں نہیں کیا......؟ اس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟ اس کا محبوب کوئی مفرور مجرم بھی ہوسکتا ہے، یہ خیال ہی انشو کے لئے سوہانِ رُوح تھا۔ کیا میں کسی غلط شخص سے پیار کر بیٹھی ہوں؟ وہ بے چین ہوگئی۔

دل ہی دل میں انشو نے ایک فیصلہ کیا۔ پھر اُس کے ہونٹ کچھ کہنے کی غرض سے کھلے تو وجے کا دل اُچھل کر جیسے حلق میں آ گیا......!



''انسپکٹر!'' معاً انشو بول اُٹھی۔ اُس نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر مزید کہا۔ ''یہ صاحب میرے ساتھ ہیں۔'' اس نے وجے کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہم ایک دوست کے گھر سے واپس آ رہے تھے کہ انجن کو پانی کی ضرورت پڑ گئی اس لئے ہمیں یہاں رُکنا پڑا۔''

''اوہ!'' یہ کہہ کر پولیس انسپکٹر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

وجے کے تنے ہوئے اعصاب ایک دم ڈھیلے پڑ گئے۔ غیر ارادی طور پر وہ ٹھنڈا سانس بھرنے والا تھا کہ سنبھل گیا۔ اس اطمینان کے باوجود وہ دل ہی دل میں شرمندہ تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ انشو اس کی حقیقت جان چکی ہے۔ انشو نے آج اُس کے احسان کا بدلہ اتار دیا تھا۔ اُس نے انشو کی آبرو پامال ہونے سے بچائی تھی تو انشو نے اس کی عزت بچا لی تھی۔ وہ اسی احساس کے تحت انشو کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکا۔ شرم سے اُس کا سر کچھ اور جھک گیا۔

انشو نے کار آگے بڑھا دی اور سفر خاموشی سے طے ہونے لگا۔ وجے منتظر تھا کہ انشو اُسے مخاطب کرے، کچھ پوچھے، کوئی سوال کرے۔ مگر انشو کافی دیر تک خاموش رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر یہ شخص مجرم ہے تو اسے قانون کی گرفت سے بچا کر میں نے اچھا نہیں کیا۔ لیکن اُس نے یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ جس شخص کو وہ اپنا دیوتا تسلیم کر چکی تھی، اُسے مجرم تصور کرنا بھی اُس کے لئے سوہانِ روح تھا۔ انشو کا دل اس پر آمادہ نہیں تھا۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ اجنبی نوجوان سے کچھ بھی نہیں پوچھے گی، کوئی سوال نہیں کرے گی۔ کیونکہ یہ مجرم نکلا تو اس کے سارے خواب ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ سوچتے سوچتے نہ جانے کیوں، کب اور کیسے انشو کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ پلکوں کی لمبی لمبی نوکوں پر آنسوؤں کے قطرے نمودار ہو گئے۔ اُس کی پلکیں بھیگ گئیں۔

وجے انشو کی طرف سے کسی سوال کا انتظار کر رہا تھا، مگر جب انشو نے کچھ نہ پوچھا

اور خاموش رہی تو اُس کے دل کی بے چینی بڑھ گئی۔ اُس کا خود پر اعتماد ٹوٹنے لگا۔ اُس نے سوچا کہ وہ انشو کی نظر میں ایک کھلا مجرم ہے۔

انشو کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ کار چلاتے ہوئے بہت آہستگی سے اپنے نچلے ہونٹ کو کاٹ رہی تھی۔ شاید وہ وجے کو اپنی کار میں بٹھا کر پچھتا رہی تھی۔ آخر وجے کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو اُس نے انشو کو سب کچھ بتانے کا فیصلہ کرلیا۔

''انشو جی!'' وجے نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ کہا۔

انشو نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا، اُس کی طرف دیکھا تک نہیں بلکہ چپ چاپ اپنا ہونٹ کاٹتے ہوئے گاڑی چلاتی رہی۔

''انشو جی!'' وجے نے دوبارہ اُسے مخاطب کیا۔ ''آپ سوچتی ہوں گی کہ میں کون ہوں، کیا کرتا ہوں؟ اگر اس وقت آپ مجھے نہ بچاتیں تو میں جیل میں ہوتا۔ کیونکہ میں...... میں ایک مجرم ہوں۔ مجبوری کے ہاتھوں میں مجرموں کے اس جال میں پھنس چکا ہوں جس سے کوشش کے باوجود نہیں نکل پا رہا......''

اس کے بعد وجے نے انشو کو اپنی پوری کہانی سنا دی، اس سے کوئی بات بھی نہیں چھپائی۔ جو کچھ اُسے یاد آیا، اُس نے انشو کو بتا دیا۔ یہ بھی کہ جب اُس نے جرم کی اس دلدل سے نکلنے کی کوشش کی تو چندانی سیٹھ نے اُس کے باپ دیوان چند کو قید کرلیا، اُسے اپنے باپ کی زندگی بچانے کے لئے ہی چندانی کی خاطر کام کرنا پڑ رہا ہے۔ وجے نے انشو کو یہ ساری باتیں تو بتا دیں مگر اپنے پیار کو چھپا گیا۔ انشو سے وہ یہ کیسے کہتا کہ ایک مجرم ہو کر بھی اسے چاہتا ہے۔ یوں بھی سب کچھ اس کے بارے میں جان لینے کے بعد انشو کو اس سے ہمدردی ہوسکتی ہے، محبت نہیں۔ محبت تو وہ وشال سے کرتی ہے تبھی تو وشال کی کال پر اُس سے ملنے ہوٹل چلی گئی تھی۔

انشو خاموشی سے کار چلاتے ہوئے وجے کی باتیں سنتی رہی۔

وجے نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''اب جبکہ آپ پر میری اصلیت ظاہر ہو چکی ہے تو میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ خود کو قانون کے حوالے کر دوں۔ چندانی اگر میرے پتا جی کو چیتوں کے سامنے ڈالتا ہے تو ڈال دے، اُنہیں اُن کی کرنی کی سزا مل جائے گی اور مجھے میری کرنی کا پھل۔'' وجے کی آواز میں تلخی تھی۔

دوسری طرف انشو سوچ رہی تھی، یہ اسے کیا ہوگیا ہے؟ یہ اس بات کی بھی پرواہ نہیں کر رہا کہ چندانی اس کے پتا جی کو چیتوں کے آگے ڈال دے گا! خود کو یہ قانون کے حوالے کرنے پر تیار ہے۔ کیا صرف اس لئے کہ میں اس کی اصلیت جان چکی ہوں؟ کیا یہ خود کو بدلنے پر آمادہ ہے؟ کیا یہ صرف میری محبت کی وجہ سے ہوا ہے؟ شاید میں وہ واحد لڑکی ہوں جسے وجے کی حقیقت پتہ چل سکی ہے۔ کیا اسے میرا اتنا خیال ہے کہ اس نے میری خاطر خود کو بدل لیا ہے؟

سوچتے سوچتے انشو کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اُسے خیال آیا کہ ٹرین میں وجے اس سے باتیں کرنا چاہ رہا تھا۔ انشو کا جی چاہا کہ اس سے پوچھے، وجے! کبھی تم نے مجھے ریل کے سفر کے بعد یاد کیا تھا؟ میری عزت بچانے کے بعد تمہیں میری یاد آئی؟ مگر وہ اس سے کچھ نہ پوچھ سکی۔

انشو نے اپنی آنکھیں صاف کیں اور بولی۔ ''میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے۔ اس سے آپ کے پتا جی پر تو ظلم ہوگا ہی، ان لوگوں کے ساتھ بھی زیادتی ہوگی جو چندانی کو چھوڑنا چاہتے ہیں۔ آپ چندانی کے اڈوں کا پتہ چلایئے اور اس سلسلے میں میرے ڈیڈی سے مل لیں۔ وہ پولیس کے اعلیٰ عہدیداروں کے ذریعے آپ کی پوری مدد کریں گے۔''

وجے نے کچھ سوچا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت چندانی سیٹھ کا کوئی آدمی اس کے پیچھے نہیں ہوگا۔ چندانی سمجھ رہا ہوگا کہ وہ گوا جا رہا ہے۔ اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اُس نے انشو کا مشورہ مان لیا۔ وہ رائے صاحب سے ملنے پر آمادہ ہوگیا۔

شام چار بجے کے قریب وجے کو ساتھ لے کر انشو اپنی فیکٹری پہنچی۔ فیکٹری کے کارکن اُس کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آئے۔ وہ سب سے خوش دلی کا اظہار کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ رائے صاحب اپنے دفتر میں مصروف تھے۔ ان کے سامنے فائلیں رکھی تھیں اور ایک کلرک ان سے کاغذات پر دستخط کرا رہا تھا۔ انشو کو اپنے دفتر میں غیر متوقع طور پر دیکھ کر رائے صاحب چونک اٹھے اور بولے۔

''خیریت تو ہے انشو! تم اس وقت کیسے؟''

رائے صاحب نے وجے کی طرف دیکھا تو اُس نے ہاتھ جوڑ کر اُنہیں ''نمستے'' کہا

''وہ ڈیڈی......!'' انشو کچھ کہتے کہتے رُک گئی اور کلرک کی طرف نگاہ اٹھائی۔

''آپ جایئے۔'' رائے صاحب نے کلرک سے کہا۔ ''میں آپ کو بلا لوں گا۔''

کلرک سر جھکا کر چلا گیا تو انشو نے کہنا شروع کیا۔ ''ڈیڈی......!'' پھر وہ رُک کر وجے سے مخاطب ہوئی۔ ''میں نے آپ کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔''

''وجے۔'' وجے نے جواب دیا۔ وہ اب تک کھڑا ہوا تھا۔

''جی ڈیڈی، یہ وجے بابو ہیں۔'' انشو نے رائے صاحب سے وجے کا تعارف کرایا۔ ''انہوں نے ہی اُس روز مجھے رندھیر کے گندے ہاتھوں سے بچایا تھا۔''

''اوہ!'' رائے صاحب ایک دم جذباتی سے نظر آنے لگے۔ ''بیٹھیے!'' انہوں نے وجے کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وجے بیٹھ گیا تو وہ پُرخلوص نرم لہجے میں کہنے لگے۔

''بیٹے! ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں۔ اگر ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو کہنے میں مت ہچکچانا۔''

''جی......! دراصل مجھے آپ کی بہت بڑی مدد کی ضرورت ہے۔'' وجے نے مؤدبانہ انداز میں گزارش کی۔

''گو آن مائی چائلڈ......! ہچکچاؤ مت۔ کیا بات ہے؟'' رائے صاحب پوری طرح وجے کی جانب متوجہ تھے۔

پھر وجے نے اُنہیں بھی اپنی پوری کہانی سنا دی۔ الف سے ی تک! اُس نے کچھ نہیں چھپایا۔

رائے صاحب بغور وجے کی بات سن رہے تھے۔ وجے اپنی بات مکمل کر چکا تو انہوں نے سگار کا ایک گہرا کش لیا اور دُھواں چھوڑتے ہوئے زور سے ''ہوں'' کی۔ وہ تو پہلے ہی چاہتے تھے کہ چندانی اور اُس کے بیٹے کو ان کے کرتوتوں کی سزا دلوائی جائے۔ انہوں نے ڈی آئی جی کو فون کیا اور اپنے دفتر آنے کے لئے کہا۔

ڈی آئی جی سے یقیناً رائے صاحب کے اچھے تعلقات تھے، اُس نے اسی لئے آنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔ اُس کی آمد کے بعد اسے ساری تفصیل بتائی گئی۔ ڈی آئی جی کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔

''چندانی پر ہمیں پہلے ہی شک تھا۔ پچھلے دنوں ہم نے اس کے کچھ آدمی پکڑے بھی

تھے مگر ہمیں اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملا۔ کسی کے کہہ دینے سے ہم اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ ہمیں اس کا جرم ثابت کرنا ہوگا۔ اسی غرض سے ہم نے اس کا تعاقب کیا، اُس کے ملنے جلنے والوں پر نظر رکھی، مگر یہ سب شہر کے معززین تھے۔ ہم ان پر کوئی الزام کیسے لگا دیتے وہ بھی کسی ثبوت کے بغیر۔ چندانی کے بنگلے پر کئی قومی رہنما اور وزیرِ مشیر تک آتے جاتے ہیں۔ ہمیں سب سے پہلے اُس کے اڈے کا پتہ لگانا ہوگا۔ پھر ہم چندانی ہی کو نہیں بلکہ اس کے پورے گروہ کو قانون کی گرفت میں لے سکیں گے۔ ورنہ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔ ہم اس گروہ کا جڑ سے خاتمہ چاہتے ہیں۔''

وجے سوچ رہا تھا کہ چندانی کے اڈے کا سراغ لگانا آسان نہیں، پھر بھی کوشش کی جا سکتی تھی۔ اب خطرہ مول لے ہی لیا ہے تو ڈرنا کیسا؟

''ڈی آئی جی صاحب!'' وجے بول اٹھا۔ ''اگر آپ میری مدد کریں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ جلد ہی چندانی کے اڈوں کا پتہ لگا لوں گا۔''

یہ سن کر انشو کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وجے کو اپنی زندگی کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ وہ ڈی آئی جی کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''پولیس آپ کی پوری مدد کرے گی ینگ مین!'' ڈی آئی جی نے کہا۔

کچھ اور ضروری باتیں کرنے کے بعد وجے رائے صاحب کی فیکٹری سے نکلا تو شام ہو چلی تھی۔ رائے صاحب کی کار اُسے چھوڑنے جا رہی تھی۔

ایک مناسب جگہ وہ کار سے اُتر گیا۔ وہ رائے صاحب کی کار میں اپنے گھر تک جانا نہیں چاہتا تھا۔ چندانی کا کوئی آدمی اُس کے گھر کی اطراف میں ہو سکتا تھا۔ نگرانی کرنے والا وہ شخص چندانی کو اس بات سے آگاہ کر سکتا تھا کہ اُسے رائے صاحب کی کار چھوڑنے آئی تھی۔ جرائم پیشہ افراد بہت محتاط اور چوکنا ہوتے ہیں۔ وہ اپنے سائے تک پر نظر رکھتے ہیں۔ وجے کو بھی ان لوگوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ احتیاط اُس کے مزاج کا بھی حصہ بن چکی تھی۔ ٹیکسی کے ذریعے جب وہ اپنے گھر پہنچا تو اردگرد کا گہری نظروں سے جائزہ لیا اور چونک اٹھا۔ دو آدمی وہاں پہلے سے موجود تھے اور اُسے مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ شاید کمو نے چندانی کو فون کر کے آج کے واقعے کی اطلاع دے دی تھی۔

وجے اپنے گھر کے اندر پہنچا۔ اُس کے ہاتھ میں سوٹ کیس تھا۔ اندر پہنچ کر اُس نے کھڑکی سے باہر دیکھا، جس ٹیکسی میں وہ آیا تھا، اُس میں بیٹھ کر وہ دونوں مشتبہ افراد واپس جا رہے تھے۔ ان کی واپسی پر وجے نے سکون کا سانس لیا۔ اگر وہ دونوں باہر ہی موجود رہتے تو وجے فکرمند ہو سکتا تھا۔ پھر وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ پھونکنے لگا۔

اُس کا ذہن آج پیش آنے والے واقعات میں اُلجھا ہوا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُسے یہ خطرناک کام کرنا چاہئے یا نہیں۔

ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ وجے کو اسی کا انتظار تھا۔ اُس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ فون چندانی سیٹھ کا تھا۔ اُسے چندانی کے سامنے سوٹ کیس سمیت حاضر ہونے کا حکم ملا تھا۔ اُسے ایک مقررہ جگہ پہنچنے کے لئے کہا گیا جہاں سے چندانی کے آدمی اُسے لے گئے۔

چندانی کے سامنے پہنچ کر وجے نے اپنی ناکامی پر گہرے دُکھ کا اظہار کیا، مگر یہ نہیں بتایا کہ وہ پولیس سے کس طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہوا۔ چندانی نے بھی اس سلسلے میں کچھ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وجے سے زیادہ فکر اُسے سوٹ کیس کی تھی۔ سوٹ کیس ہاتھ سے نکل جاتا تو اس کا بہت بڑا نقصان ہو جاتا۔ سوٹ کیس میں جو نادر مورتی تھی، اس کی قیمت چندانی نے دس لاکھ روپے مقرر کی تھی۔

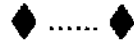
وجے کو چندانی کے چہرے پر سنجیدگی نظر آ رہی تھی۔ چندانی سوچ رہا تھا کہ یہ نوجوان مشکل سے مشکل وقت میں بھی کبھی ناکام نہیں ہوا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ وہ ناکام واپس آیا ہے۔ آخر کیوں؟ وہ اس سوال پر غور کر رہا تھا مگر کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ اُس نے سوچا، اب مجھے وجے کی طرف سے ہوشیار رہنا پڑے گا۔ اس نے مجھ سے بے وفائی نہ کی تو یہ میرے گروہ کا اہم ترین رُکن ہو گا۔ اس کے باوجود میں اسے اپنے اڈے کا پتہ ہرگز نہیں چلنے دوں گا۔ صرف مال لانا، لے جانا ہی اس کے ذمے ہو گا۔ کچھ دیر تک خاموشی کے بعد چندانی نے اپنے آدمیوں کو مخصوص اشارہ کیا۔

اسی وقت وجے نے اپنے باپ دیوان چند سے ملنے کو کہا۔ اُسے ایک طرف تو چندانی پر بھروسہ نہیں تھا کہ وہ دیوان چند کو زندہ رکھے گا، دوسری جانب یہاں آنا اُس کے بس میں نہیں تھا۔ یہاں آنا اسی وقت ممکن تھا جب چندانی اُسے بلاتا۔ وجے نے اسی سبب

موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا۔

چندانی نے اُسے دیوان چند سے اپنے آدمیوں کی موجودگی میں ملنے کی اجازت دے دی۔ وہ بھی جانتا تھا کہ وجے کو اس سلسلے میں مطمئن کر کے ہی اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔

اجازت ملنے کے بعد وجے دو آدمیوں کے ہمراہ ایک طرف بڑھ گیا۔



دیوان چند کی وہی حالت تھی، چہرے پر بے بسی کے تاثرات اور آنکھوں میں آنسو۔ چندانی کے آدمیوں کی وہاں موجودگی نے اُن کی زبان پر تالا لگا رکھا تھا۔ انہیں چندانی کے حکم پر قید میں ہر سہولت اور آرام فراہم کیا گیا تھا، مگر جو آزاد نہ ہو اس کے لئے یہ سب کچھ بے معنی تھا۔ دیوان چند کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اگر کسی پرندے کو سونے کے پنجرے میں بھی قید کر دیا جائے تو وہ آزاد ہونا چاہے گا۔

کچھ دن مزید گزر گئے۔ اس عرصے میں وجے جہاں بھی گیا، اُسے محسوس ہوا کہ اُس کی نگرانی ہو رہی ہے۔ اس پر وجے کو کوئی حیرت نہ ہوئی۔ کیونکہ جن حالات میں وہ ناکام ہوا تھا ان میں اس کی طرف سے چندانی کا شک میں مبتلا ہو جانا فطری امر تھا۔

حالات کے پیش نظر اب وجے بھی پہلے کی نسبت زیادہ چوکنا ہو گیا تھا۔ وہ ہر قدم پھونک پھونک کر اُٹھا رہا تھا۔ اس عرصے میں وجے نے کئی بار ڈی آئی جی سے بات کی مگر صرف فون پر! وہ بھی بہت دیکھ بھال کے۔ اُس نے اپنی ضروریات بتائیں اور ڈی آئی جی سے مشورے نیز ہدایات حاصل کیں۔

ڈی آئی جی کے حکم پر ہی وجے نے دو تین مرتبہ پولیس کے مختلف عہدیداروں سے ملاقاتیں کیں، مگر صرف ہوٹلوں کی لفٹوں میں۔ یہ بہت مختصر ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ اس طرح وجے کو اپنی ضرورت کی چیزیں ملتی رہیں۔

کئی بار وجے کو انشو یاد آئی۔ اُس کا دل چاہا انشو کو فون کرے، اُس سے باتیں کرے، اُس کی باتیں سنے اور موقع ملتے ہی انشو کو اپنے دل کا حال بتا دے۔ اُس نے ایک دفعہ ٹیلی فون ڈائریکٹری سے رائے صاحب کے گھر کا نمبر معلوم کر کے فون ملایا مگر دوسری طرف مردانہ آواز سن کے ریسیور رکھ دیا۔ وہ انشو کو کس طرح فون پر بلاتا؟ اُسے یہ خیال

بھی تھا کہ انشو اُس کی بجائے وشال کی ہو چکی ہے اور اس سے پیار بھی کرتی ہے۔

ایک روز جب خلاف توقع وجے کو انشو کا فون ملا تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اُسے انشو کی نرم وشیریں آواز سنائی دے رہی تھی۔ ''میں انشو بول رہی ہوں۔''

''کون انشو؟'' وجے نے دانستہ اجنبیت کا اظہار کیا۔ ''رانگ نمبر۔'' وجے نے لائن کاٹ دی۔ پھر اُس نے انشو کے گھر کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب سے انشو ہی نے فون ریسیو کیا تو وجے کہنے لگا۔ ''انشو جی! میں وجے ہوں۔ کیا آپ نے ابھی مجھے فون کیا تھا؟''

''جی ہاں۔'' انشو نے کہا۔ ''مگر آپ......''

''جی، میں نے جان بوجھ کر سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ دراصل چندانی آج کل میری نگرانی کر رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ اُس نے کسی لڑکی سے مجھے فون نہ کرایا ہو۔ جس طرح رندھیر نے آپ کو وشال بن کر فون کیا تھا۔'' وجے نے خود ہی وضاحت کر دی۔

''آپ کچھ زیادہ ہی احتیاط نہیں کر رہے ہیں؟'' انشو نے خیال آرائی کی۔

''جی ہاں......'' وجے نے جواب دیا۔ ''مجبوراً ایسا کرنا پڑ رہا ہے۔''

''مجھے آپ کا یہ انداز پسند آیا۔'' انشو بولی۔

''شکریہ! آپ مجھے جب بھی فون کریں گی، ایسا ہی جواب ملے گا۔ میں آپ سے صرف اس وقت بات کروں گا جب خود رابطہ قائم کروں گا۔'' وجے نے کہا، پھر پوچھا۔ ''میرے اس طرح انجان بن جانے اور فون کاٹ دینے سے آپ ناراض تو نہیں ہوئیں؟''

''نہیں، مگر وقتی طور پر دل کو چوٹ ضرور لگی تھی۔'' انشو نے بتایا۔

''میں معافی چاہتا ہوں۔'' وجے بھاری آواز میں کہنے لگا۔ اُسے واقعی افسوس تھا کہ جس لڑکی سے وہ پیار کرنے لگا تھا اُسے دُکھ پہنچا تھا۔

''اِٹ از او کے وجے بابو......! اب تو بات صاف ہو گئی نا۔''

''شکر ہے آپ نے مجھے معاف کر دیا۔'' اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں ریسیور کان سے لگائے کھڑے رہے۔ اُن کی زبانیں خاموش تھیں مگر دل بہت تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ پھر وجے ہی نے خاموشی توڑی اور بولا۔ ''آپ نے مجھے کسی کام سے فون کیا تھا؟''

''ج...... جی...... کوئی...... کا...... کام نہیں تھا۔'' انشو بوکھلا گئی۔

وجے نے اُس کی بوکھلاہٹ سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کے دل کا چور پکڑ لیا۔ وہ سوچ رہا تھا، گویا پیار کی آگ دوسری طرف بھی لگی ہوئی ہے۔ کیا انشو اپنے منگیتر وشال کو چھوڑ کر مجھ میں دلچسپی لے رہی ہے......؟ کیا واقعی ایسا ہی ہے؟

''وجے بابو!'' انشو نے اُسے مخاطب کیا۔ وہ اب اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پا چکی تھی۔

''دراصل میں یہ جاننا چاہتی تھی، آپ اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہو چکے ہیں؟''

وجے نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''کسی حد تک کامیاب سمجھ لیجئے۔''

''بھگوان آپ کی حفاظت کرے۔'' انشو نے دُعا دی۔

وجے نے اس پر انشو کا شکریہ ادا کیا۔ ایک مرتبہ پھر دونوں جانب خاموشی چھا گئی، مگر انہوں نے ریسیور نہیں رکھے۔ اس خاموشی نے ان دونوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا تھا۔ دونوں ہی کچھ کہنے کے لئے لفظ تلاش کر رہے تھے۔ آخر وجے نے کہا۔ ''انشو جی!''

''جی!'' انشو کی آواز پیار میں بھیگی ہوئی تھی۔

''اور کوئی کام؟'' معاً وجے بولا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ میں ہی احمق ہوں جو ایسا سوچ رہا ہوں۔ بھلا انشو وشال کو چھوڑ کر مجھے یعنی ایک مجرم کو دل میں کیوں بسائے گی؟

''جی کوئی کام نہیں۔'' انشو کی آواز ریسیور میں اُبھری۔ ''بس یہی پوچھنا تھا۔'' انشو بادل نخواستہ بولی۔ وہ لڑکی ہو کر اعترافِ محبت میں پہل کس طرح کر سکتی تھی؟

''اچھا بائے۔'' وجے نے کہا۔

''بائے۔'' انشو نے شیریں لہجے میں جواب دیا۔

فون بند کر کے وجے اُسی کے خیالوں میں ڈوب گیا۔ یہ ہمدردی ہے یا انشو واقعی میری طرف مائل ہو رہی ہے؟ اس کی شادی وشال کے ساتھ ہونے والی ہے۔ وہ وشال سے پیار کرتی ہے ورنہ اس کے بلاوے پر ہوٹل کیوں جاتی؟ وجے اس اہم نکتے پر پہلے بھی غور کر چکا تھا۔ کافی غور وخوض کے باوجود جب وجے کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تو اُس نے فیصلہ کیا کہ اس یکطرفہ عشق ہی میں ساری زندگی گزار دے گا۔ وہ اس پیار کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا جس نے اس کی زندگی بدل دی تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد فون کی گھنٹی پھر بجی اور اُسے چندانی کے سامنے حاضر ہونے کا حکم ملا۔ ہدایت کے مطابق اُسے ایک گھنٹے بعد فلورا فاؤنٹین کے نزدیک پہنچنا تھا۔ وجے نے یہ اطلاع فوری طور پر ٹیلی فون کے ذریعے ڈی آئی جی کو دے دی۔ پھر اُس نے ڈی آئی جی سے کچھ باتیں بھی کیں۔

وقت مقررہ پر وہ فلورا فاؤنٹین کے قریب جا کھڑا ہوا۔ ذرا ہی دیر بعد ایک کار اُس کے پاس آ کر رُکی۔ کار کے اندر بیٹھے ہوئے شخص نے اُسے آواز دی اور وہ کار میں بیٹھ گیا۔ اس شخص نے وجے کو مخصوص چشمہ تھمایا۔ وجے نے چشمہ لیتے ہوئے کار سے باہر دیکھا۔ ایک پولیس انسپکٹر اور ایک کانسٹیبل اُسی کی طرف آ رہے تھے۔

جو لوگ کار میں بیٹھے تھے، ان کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے۔ وجے کے چہرے سے بھی فکرمندی جھلک رہی تھی۔

پولیس انسپکٹر نے کار کے سامنے آ کر رُکنے کا اشارہ کیا۔ چندانی کے آدمی حواس باختہ ہو گئے۔ انسپکٹر نے ڈرائیور کے پاس آ کر اُس سے لائسنس طلب کیا۔

تینوں افراد کی جان میں جان آئی۔ انسپکٹر نے لائسنس دیکھ کر ڈرائیور کو واپس کر دیا اور پھر وہاں سے ہٹ گیا۔

جس وقت چندانی سیٹھ کے تینوں آدمی انسپکٹر کی طرف متوجہ تھے، وجے نے طے شدہ منصوبے کے مطابق کام دکھا دیا۔ اُس کے مشن کا ایک مرحلہ کامیابی کے ساتھ مکمل ہو گیا تھا۔ کار آگے بڑھنے لگی تو وجے نے اپنی آنکھوں پر چشمہ چڑھا لیا۔

وجے کو سابقہ طریقۂ کار کے مطابق مختلف راستوں سے گزار کر چندانی کے سامنے پیش کیا گیا۔ چندانی ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں جام تھا۔ چندانی کے ساتھ ہی ایک غیر ملکی بیٹھا تھا۔ وہ بھی مے نوشی کر رہا تھا۔ وجے نے گہری نظروں سے ماحول کا جائزہ لیا۔

''وجے!'' چندانی نے اُسے مخاطب کر کے غیر ملکی کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ''یہ مسٹر جانسن ہیں۔ انہیں کل صبح کی ایک پرواز سے اپنے وطن جانا ہے۔ تمہیں بھی اسی پرواز سے سفر کرنا ہے۔ ایئرپورٹ پہنچنے سے پہلے تمہیں ایک سوٹ کیس ملے گا۔ ویسا ہی سوٹ کیس مسٹر جانسن کے پاس بھی ہوگا۔ کسٹم میں ان کا سوٹ کیس پہلے چیک ہوگا۔

اس کے دو منٹ بعد وہاں ایک عورت بے ہوش ہو کر گر پڑے گی۔ اس دوران افراتفری کا سہارا لے کر تم اپنا سوٹ کیس مسٹر جانسن سے بدل لو گے۔ بعد میں تم اپنی فلائٹ کینسل کرا دو گے۔ تم یہ بہانہ بھی کر سکتے ہو کہ آغازِ سفر سے پہلے کسی خاتون کا بے ہوش ہو جانا کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔ سوٹ کیس بدل جانے کے بعد تمہارا سوٹ کیس چیک ہوتا ہے یا نہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کوئی سوال؟''

''نہیں۔'' وجے کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

''مسٹر جانسن کئی سال بعد بھارت آئے ہیں اور ہمارے بہت پرانے گاہک ہیں۔ اس لئے آج شام چھ بجے ہم ان کے اعزاز میں ایک پارٹی دے رہے ہیں۔ ہمارے بھی کارکن اس پارٹی میں آئیں گے۔ تمہیں بھی اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔'' چندانی نے کہا۔

وجے سوچ رہا تھا، آج یہاں اس گروہ کے تقریباً سبھی کارکن موجود ہوں گے۔ پولیس کو چھاپہ مارنے کے لئے اس سے اچھا موقع پھر کبھی نہیں مل سکے گا، مگر میرے پتا جی کو چندانی نے پولیس کے یہاں پہنچنے سے پہلے مار دیا تو؟

''دیکھو وجے!'' چندانی سیٹھ نے وجے کی خاموشی کا دوسرا مطلب نکالا اور سمجھانے لگا۔ ''ہم سے الگ ہو کر تم کبھی خوش نہیں رہ سکو گے۔ تمہیں ہمارے ساتھ ہر صورت میں کام کرنا ہے...... اس وقت تک جب تک تمہارے پتا جی زندہ ہیں۔ تمہیں چاہئے کہ ہمارے ساتھ بہ رضا و رغبت کام کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یقین کرو ہم تمہیں بھی خوش رکھیں گے اور تمہارے پتا جی کو بھی کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ ہو سکتا ہے کسی دن ہم تمہارے کام سے خوش ہو کر انہیں آزاد کر دیں۔''

''ٹھیک ہے سر! میں پارٹی میں ضرور آؤں گا۔'' وجے بولا۔

''گڈ۔'' چندانی نے کہا۔ ''شام پونے چھ بجے ہوٹل ایمبیسڈر پہنچ جانا۔ بادل تمہیں وہاں سے لے آئے گا۔''

وجے ایک بار پھر اپنے پتا دیوان چند سے دو آدمیوں کی موجودگی میں ملا۔ وہ اس طرح دیوان چند کے زندہ ہونے کی یقین دہانی حاصل کر لیتا تھا۔ اس دن بھی دیوان چند اپنے دل کی بات اس سے کہہ دینا چاہتا تھا مگر نہ کہہ سکا۔ وجے وہاں سے واپس ہوا تو

اُس نے حسبِ معمول چشمہ اپنی آنکھوں پر چڑھا لیا۔ پھر چندانی کے آدمیوں نے اُسے شہر لے جا کر ایک ویران جگہ اتار دیا۔

گھر پہنچتے ہی وجے نے پہلے باہر کا جائزہ لیا اور پھر گھر کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیں۔ اس کے بعد وجے نے ڈی آئی جی کو فون ملایا۔

فون پر ڈی آئی جی کو وجے نے چندانی کی اس پارٹی کے بارے میں بتایا جس میں وہ خود بھی مدعو تھا۔

''لیکن ہمارے وہاں پہنچنے سے قبل چندانی اور اس کے اہم آدمی بھاگ بھی تو سکتے ہیں۔'' ڈی آئی جی بولا۔ ''وہ اتنا بے وقوف نہیں ہوگا کہ تہہ خانے سے بہ وقت ضرورت فرار ہونے کے لئے کوئی خفیہ راستہ نہ بنا رکھا ہو...... پھر یہ کہ فرار سے قبل وہ تمہارے پتا جی کو بھی مار سکتا ہے۔''

''ہم ان میں سے کسی کو بھی بھاگ نکلنے کا موقع نہیں دیں گے۔'' یہ کہہ کر وجے نے ڈی آئی جی کو ایک ترکیب بتائی۔

ڈی آئی جی نے وجے کی بات دھیان سے سنی اور کچھ دیر سوچتا رہا، پھر کہا۔ ''اس میں بہت خطرہ ہے...... تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔ بہرحال کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے۔ پتہ نہیں ہمیں تہہ خانے کے خفیہ راستے بھی ملیں گے یا نہیں۔''

وجے نے ڈی آئی جی سے کچھ اور ضروری باتیں کیں اور پھر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اُس نے کاغذ پر ایک نقشہ بنایا، پھر اسے تہہ کر کے میز کی دراز میں ڈال دیا۔ الماری سے اُس نے اپنے باپ کا ریوالور نکالا، وہ چاندی کی طرح سفید تھا اور جرمنی کا بنا ہوا تھا۔ چھ گولیاں ہی اس کے لئے بہت تھیں۔ اس کے باوجود وجے نے کچھ مزید گولیاں بھی ساتھ رکھ لیں۔ اس ریوالور کا استعمال وجے نے بچپن ہی میں دیوان چند سے سیکھ لیا تھا۔ اُس کا نشانہ سچا تھا۔ آج تک اُس نے کوئی گولی ضائع نہیں کی تھی۔ یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ اُس نے اس ریوالور سے کسی کو قتل نہیں کیا تھا۔ وہ اسے ساتھ رکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ ریوالور پاس ہوتا ہے تو پھر اسے چلانے کو بھی جی چاہتا ہے۔

کبھی کبھار وجے چندانی کے اڈے پر اُس کے تہہ خانے میں گولی چلانے کی مشق کر لیتا تھا۔ چندانی کو اُس کے نشانے پر فخر تھا۔ وہ اُس کی بہت حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

تیار ہو کر وجے بے صبری کے ساتھ شام کا انتظار کرنے لگا۔ آج کی شام بہت اہم تھی۔ اُس کی زندگی آج ایک نیا موڑ لینے والی تھی۔ اگر وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو جاتا تو پھر ہر مشکل آسان ہو جاتی۔

ٹھیک پونے چھ بجے وہ ہوٹل ایمبیسڈر کے سامنے پہنچ گیا۔

''بادل۔'' ایک شخص نے اُس کے پاس آ کر آہستگی سے کہا۔

وجے اُس کے ساتھ ہو لیا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ بادل اور وجے اس کار میں بیٹھے ہی تھے کہ چار انسپکٹر بڑی بے پروائی کے ساتھ کار کی طرف بڑھے۔ پلک جھپکتے میں انہوں نے تین افراد کی کنپٹیوں پر ریوالور رکھ دیئے، مگر وجے کو کچھ نہ کہا۔ ان تینوں نے وجے کو خونخوار نظروں سے دیکھا، مگر اب کیا ہو سکتا تھا!

قریب ہی ایک وین کھڑی تھی۔ چندانی کے تین آدمیوں کو اس میں سوار کرا دیا گیا۔ اسی وین سے تین دوسرے افراد اُترے۔ اُن کے لباس اور حلیے ایسے تھے کہ وہ لفنگے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ تینوں وجے کے ساتھ کار میں بیٹھ گئے۔ کار آگے بڑھی تو وین مجرموں کو لے کر دوسری سمت چلی گئی۔ انسپکٹر بھی اپنی موٹر سائیکلوں پر سوار ہو کر وین کے پیچھے چلے گئے۔ یہ تماشہ دیکھنے کے لئے وہاں لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے۔ گاڑیوں کے جانے کے بعد لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

راستے میں وجے نے اپنی جیب سے چشمہ نکالا۔ یہ چشمہ ہو بہو اس جیسا تھا جو چندانی کے آدمی اُسے ہر بار دیتے تھے۔ لیکن اس میں سے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔

ڈی آئی جی نے وجے کی فرمائش پر اُسے چندانی کے مخصوص چشمے کی طرح کا چشمہ بنوا کر دیا تھا۔ اس چشمے کو لگا کر وجے نے چندانی کے آدمیوں کو دھوکا دیا تھا۔ وجے نے اس طرح چندانی کے اڈے کا پتہ لگا لیا تھا۔ چندانی کا خفیہ اڈا اس کے بنگلے ہی کے تہہ خانے میں تھا۔ اس پر وجے حیران رہ گیا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ تہہ خانے کے لئے بنگلے کے پہلو سے آنا پڑتا تھا۔

وجے نے نقشہ بھی بنا رکھا تھا جس میں ساری تفصیل تھی کہ کون سا راستہ کہاں سے ہو کر کدھر جاتا ہے۔ کون سا موڑ مڑنا ہے، کہاں رُکنا ہے، کس جگہ پہنچ کر بٹن دبانا ہے، پھر اندر جا کے کون سے بٹن کو دبا کے دروازہ بند کرنا ہے۔ وجے نے اپنی مدد کرنے والے

قانون کے رکھوالوں کو تمام باتیں پوری تفصیل کے ساتھ بتا دی تھیں۔ وہ چندانی کے ہاں چھ کے بجائے ساڑھے چھ بجے پہنچنا چاہتا تھا۔ چندانی وقت کا بہت پابند تھا۔ وجے اس وقت وہاں پہنچنا چاہتا تھا کہ سب مہمان آ چکے ہوں۔ اس طرح وقت ضائع کئے بغیر برق رفتاری سے کارروائی ممکن تھی۔ دیر سے آنے والوں کو کوئی ناگزیر وجہ بتانی پڑتی تھی۔ اگر چندانی مطمئن ہو جاتا تو ٹھیک ورنہ اپنے کوڑے سے ایسے لوگوں کی خوب دھنائی کرتا تھا۔ کسی کے ساتھ بھی وقت کے معاملے میں اُسے رعایت کرتے نہیں دیکھا گیا تھا۔

وجے کی آنکھوں پر مخصوص چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ اُس کے ساتھ لفنگوں کے بھیس میں تینوں افراد خفیہ پولیس کے ارکان تھے۔ آخر گاڑی چندانی کے بنگلے میں داخل ہو گئی۔ بنگلے کے لان میں کچھ دور چند افراد بڑے پراسرار انداز میں چھوٹے موٹے کام کر رہے تھے۔ کوئی کیاریوں کو ٹھیک کر رہا تھا تو کوئی لان کی گھاس صاف کر رہا تھا۔ وجے کار سے نیچے اترا۔ دو افراد نے دونوں طرف سے اس کے بازو پکڑ لئے، تیسرا فرد کار لے کر بنگلے سے باہر نکل گیا۔ بنگلے کے لان میں کام کرتے ہوئے افراد نے وجے اور دوسرے ساتھیوں کی طرف دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ کہا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کا باس کسی بھی وقت کسی فرد کو کسی شخص کو لانے کے لئے بھیج سکتا تھا۔ آج کی شام پارٹی میں شرکت کے لئے چندانی سیٹھ کے متعدد مہمان اسی طرح آئے تھے۔

ان دونوں افراد کے ساتھ وجے نے چند قدم چل کر سیڑھیاں عبور کیں تو چھوٹے سے برآمدے کے بعد وہ ایک چوڑی گیلری میں پہنچ گئے۔ کچھ دُور چل کر وہ بائیں طرف مڑے اور چند قدم چل کر رُک گئے۔ ان کے دائیں اور بائیں دونوں ہی جانب گیلریاں تھیں، لیکن وہ کسی طرف بھی نہیں مڑے۔ سامنے دیوار پر ایک بڑی فریم کی ہوئی تصویر لگی تھی۔ تصویر میں ایک عقاب کو اُڑتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ ایک فرد نے وجے کو چھوڑ کر عقاب کی ایک آنکھ پر اُنگلی رکھ کے دباؤ ڈالا۔ یہ دراصل ایک بٹن تھا۔ فوراً ہی دیوار میں ایک دروازہ کھل گیا اور ''چوں'' کی آواز آئی۔

وہ لوگ اندر داخل ہو گئے۔ اندر سے دروازہ بند کرنے کے لئے ایک سادہ بٹن تھا۔ دوسرا دروازہ کھولنے کے لئے بھی ایسا ہی ایک اور بٹن تھا۔ یہ دروازہ کھلا تو پارٹی کی چہل پہل ان کے کانوں میں پڑی۔ دروازہ بند کرنے کے بعد وہ سیڑھیوں سے نیچے اُترے۔

تہہ خانے میں ہلکی موسیقی گونج رہی تھی۔ لیکن اس میں کبھی کبھار چیتوں کی غراہٹ بھی شامل ہو جاتی تھی۔ وجے نے محسوس کیا کہ وہ چیتے انسانی گوشت کے لئے ہمیشہ ہی بھوکے رہتے ہیں۔ دوسرا گوشت کھا کر ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔

چندانی سیٹھ کچھ دور کھڑا جانسن سے گفتگو کر رہا تھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں لبریز جام تھے۔

وجے نے اندھوں کی طرح اپنے ساتھیوں کے سہارے چلتے ہوئے سر گھمائے بغیر اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔

آج چندانی کے تقریباً سبھی کارکن موجود تھے۔ ان میں لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ سبھی جام بکف دکھائی دے رہے تھے۔ باہر کی دنیا سے بے فکر وہ سب خوب لطف اندوز ہو رہے تھے۔

چندانی سیٹھ کا عیاش و آوارہ بیٹا رندھیر نوجوان و حسین لڑکیوں کے درمیان راجہ اِندر بنا کھڑا تھا۔ وجے نے چندانی کے سامنے کھڑے ہو کر چشمہ اتار دیا۔ چندانی اپنا جام خالی کر کے وجے کی طرف پلٹا۔ اس پارٹی میں جو بھی آتا تھا، اسے سب سے پہلے چندانی کے سامنے حاضر ہونا پڑتا تھا۔

وجے کے دونوں ساتھی اسے چھوڑ کر کافی فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔ چندانی نے وجے کے بجائے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے سر کو اس خیال سے جھٹکا دیا کہ کہیں زیادہ تو نہیں پی گیا۔ اُس نے وجے کو یہاں لانے کے لئے بادل کا گروپ بھیجا تھا۔

چندانی کو دال میں کچھ کالا نظر آیا۔ وجے اور اس کے درمیان ویسے بھی کچھ کشیدگی تھی۔ وہ اسی لئے وجے کی طرف سے پوری طرح چوکنا اور محتاط رہتا تھا۔ چندانی نے اپنی جیب سے ریوالور نکالنا چاہا، لیکن وجے مستعد تھا۔ اُس نے بجلی کی سی پھرتی دکھاتے ہوئے اپنی جیب سے ریوالور نکال کے بلا جھجک ایک فائر داغ دیا۔ اُس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا تھا، اس وقت بھی نہیں ہوا۔ چندانی کا ریوالور اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دُور جا گرا۔

وجے کے دونوں ساتھیوں کے لئے یہ گویا سگنل تھا۔ وہ دونوں چندانی کے دائیں بائیں آ کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے اپنے ریوالوروں کی نالیں چندانی کے سر پر رکھ دی

تھیں۔ یہ سب کچھ چشم زدن میں ہو گیا۔ کسی کو ایسی توقع نہیں تھی۔ سبھی چونک اُٹھے۔ اس دوران چندانی کے آدمیوں نے اپنے چاقو اور ریوالور نکالنے چاہے۔ وجے چوکس تھا۔ اُس نے دیوار کی طرف ہٹتے ہوئے سب کو خبردار کیا۔ ''اگر کسی نے بھی ہلنے کی کوشش کی تو میں چندانی کو گولی مار دوں گا۔''

چندانی کا سانس رُکنے لگا۔ اُس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں اچانک بساط اُلٹ جائے گی۔

وجے آگے بڑھا اور فرش پر پڑا ہوا چندانی کا ریوالور اٹھا لیا۔ پھر اُس نے دیوار پر ٹنگی ہوئی دو بندوقیں بھی اتار لیں اور اپنے آدمیوں کو تھما دیں۔ ان دونوں نے اپنے ریوالور جیب میں رکھ کر بندوقیں سنبھال لیں۔ ان میں سے ایک نے چندانی کی پشت پر بندوق کی لمبی نالی رکھ دی تھی۔ دوسرا شخص بندوق لے کر ذرا فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ وہ بالکل ہوشیار نظر آ رہا تھا وجے نے ایک جگہ سے چابی اتار کر اپنے باپ دیوان چند کی کوٹھڑی کا دروازہ کھولا۔

دیوان چند بڑی حیرت سے وجے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وجے نے اُسے باہر نکالا اور چندانی کا ریوالور اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ پھر وجے نے چندانی کی طرف قدم بڑھائے اور سامنے سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دیوان چند سے مخاطب تھا۔

''وہاں ایک بٹن ہے۔'' وجے بولا۔ ''اس بٹن کو دبانے سے ایک دروازہ کھل جائے گا۔ آگے ایک بٹن اور ملے گا، اسے دبانے پر باہر جانے کا راستہ نظر آ جائے گا۔ باہر جاتے ہی آپ کو فوراً ایک فائر کرنا ہے۔ اس فائر کی آواز سنتے ہی باہر موجود پولیس بنگلے کے اندر گھس آئے گی۔ وہ اسی سگنل کی منتظر ہے۔''

ریوالور تھامے ہوئے دیوان چند سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ ادھر وجے کی بات سن کر چندانی کے ہوش اُڑ گئے۔ اُس کے آدمیوں کو بھی پولیس کے بارے میں جاننے کے بعد اپنی فکر پڑ گئی۔ دو افراد نے ایک دوسرے کو اشارہ کر کے اپنے ریوالور نکال لئے۔ وہ چندانی کے پاس کھڑے دونوں افراد کو نشانہ بنانا چاہتے تھے۔ اسی وقت وہ وجے کی تیز نظروں میں آ گئے۔ اُس کے ریوالور نے شعلہ اُگلا اور ان دونوں افراد کی ہتھیلیاں پھٹ گئیں۔ ریوالور چھوٹ کر دُور جا گرے۔ خفیہ پولیس والوں کی گولیاں چندانی پر چلتے چلتے

رہ گئیں۔ وجے کے دونوں ساتھی اور وہاں موجود دوسرے افراد وجے کی پھرتی اور نشانے پر حیران رہ گئے۔

''ابھی تو میں نے گولی صرف ہتھیلیوں پر چلائی ہے۔'' وجے نے سب کو وارننگ دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اب اگر کسی نے کوئی حماقت کی تو میرے ریوالور کی گولی اس کے سینے میں اُتر جائے گی۔''

عین اسی لمحے تہہ خانے کے باہر ایک ہوائی فائر ہوا۔ پولیس کو چندانی کے بنگلے پر دھاوا بولنے کا سگنل مل گیا، مگر فائر کی اس آواز کو سن کر لان میں کھڑے ہوئے چندانی کے آدمی ٹھٹک گئے۔ اُن کی نظریں جب دیوان چند پر پڑیں تو وہ چونک اٹھے۔ انہیں معلوم تھا کہ دیوان چند کو قید کیا جا چکا ہے۔ وہ اسی بناء پر دیوان چند کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگے۔

دیوان چند نے یہ دیکھ کر ایک اور فائر کر دیا۔ اسی دوران چندانی کے ایک آدمی نے دیوان چند کی طرف خنجر پھینکا۔

خنجر دیوان چند کی پشت میں اُتر گیا۔ اس کے ساتھ ہی دیوان چند کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ پشت کے بل گر پڑا جس کے باعث خنجر دستے تک اس کی کمر میں اُتر گیا۔ دیوان چند کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اُس نے موت کی چاپ سن لی تھی۔

دیوان چند پر خنجر سے حملہ کرنے والے کو تہہ خانے میں پیش آنے والے واقعات کا کوئی علم نہ تھا۔ وہ دیوان چند کا ریوالور اٹھا کر تہہ خانے کی طرف بھاگا۔

یہ وہ وقت تھا جب حالات کو اپنے خلاف دیکھ کر چندانی جان پر کھیل گیا تھا۔ وہ جیتے جی خود کو پولیس کے حوالے کرنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ اپنے ان جرائم سے بھی واقف تھا جن کا علم کسی کو نہیں تھا۔ اس کے جرائم کی فہرست خاصی طویل تھی۔ اس فہرست کو پیش نظر رکھتے ہوئے اُسے پھانسی کا پھندا اپنی آنکھوں کے سامنے گھومتا دکھائی دے رہا تھا۔ اُسے زندگی اور موت کا کھیل کھیلتے ایک عرصہ ہو چکا تھا، اس لئے جو قدم اُس نے اٹھایا غیر متوقع نہیں تھا۔

چندانی بڑی تیزی سے نیچے بیٹھ گیا اور اپنی پشت سے لگی ہوئی بندوق کی نال پکڑ لی۔ اسی کے ساتھ اُس نے خفیہ پولیس والے کے منہ پر ایک گھونسا بھی رسید کر دیا۔ چندانی کو

اس طرح ہاتھ پیر مارتے دیکھ کر دوسروں کو بھی موقع مل گیا۔ سبھی وجے اور اس کے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑے۔ پھر گولیاں چلنے لگیں اور چندانی کے کئی آدمی زخمی ہو کر گر پڑے۔ اب دوبدو لڑائی ہو رہی تھی۔ ایک بھگدڑ سی مچ گئی۔ عورتیں اور مرد سبھی اپنی جانیں بچانے کے لئے کھلے ہوئے دروازے کی طرف بھاگنے لگے۔ تہہ خانے میں جو چیخ و پکار ہو رہی تھی، اس نے چیتوں کو بھی پریشان کر دیا اور وہ گرجنے لگے۔

چیتے اپنی زنجیروں کو توڑنے کے لئے زور لگا رہے تھے تاکہ آزاد ہو کر انسانی گوشت سے اپنی بھوک مٹا سکیں۔

چندانی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وجے نے اُس کی زندگی بھر کی محنت برباد کر دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وجے کو چیتوں کے آگے ڈال دے تاکہ وہ اُسے چیر پھاڑ کے برابر کر دیں۔ اپنے آدمیوں کے ساتھ وہ وجے پر ٹوٹ پڑا، لیکن وجے بھی کسی سے کم نہیں تھا۔ اس کے ساتھی بھی ہوشیار اور طاقتور تھے۔ وہ اس طرح کی صورتحال کی باقاعدہ تربیت حاصل کر چکے تھے۔ انہوں نے اسی لئے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

وجے کے گرم اور جوان خون کے آگے چندانی جلد ہار مان گیا۔ اس کے باوجود وہ اپنے ساتھیوں کی مدد سے کسی نہ کسی طرح وجے کو گھیر گھار کر چیتوں کے قریب لے آیا۔ شکار کو قریب دیکھ کر چیتے اُچھلنے لگے۔ وجے کئی بار ان کے پنجوں میں آنے سے بچا۔ آخر میں اُس نے اُچھل کر چندانی کے پیٹ پر ایسی لات ماری کہ وہ اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ چندانی جیسے ہی گرا چیتوں کی پکڑ میں آ گیا۔

وہ جو دوسروں کو چیتوں کے آگے ڈال دیا کرتا تھا، آج اُس کا انجام بھی یہی ہوا۔ چیتوں نے اُس کے جسم کو دانتوں اور پنجوں سے بھنبھوڑنا شروع کر دیا۔ چندانی کی چیخیں بڑی وحشت ناک اور دل ہلا دینے والی تھیں۔ یہ چیخیں سن کر اُس کے ساتھیوں کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ اب ان کے سامنے بھاگ نکلنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا، لیکن اس وقت تک پولیس اندر آ چکی تھی۔

پولیس والوں کے پاس سرچ لائٹیں تھیں۔ انہوں نے پورے تہہ خانے کی اچھی طرح تلاشی لی۔ ایک بھی شخص کو انہوں نے بنگلے سے باہر نہ جانے دیا۔ عورتیں بھی وہاں سے نکلنے میں ناکام رہیں۔ ان کی منت سماجت رائیگاں چلی گئی تھی۔

چندانی کے تمام ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ جانسن بھی قانون کی گرفت سے نہ بچ سکا۔ پولیس نے ان سب کو اپنی گاڑیوں میں بھر کے تھانے روانہ کر دیا۔

اتنا بڑا منصوبہ تن تنہا وجے نے تیار کیا تھا۔ اسی کی وجہ سے یہ منصوبہ کامیابی سے ہمکنار ہوا تھا۔

ڈی آئی جی جب وجے کے پاس آیا تو وہ اپنے ہونٹوں سے بہنے والے خون کو رومال کی مدد سے صاف کر رہا تھا۔ اُس نے وجے کو مبارکباد دی۔ وجے اُس کے ساتھ ہی تہہ خانے سے باہر نکلا۔ قیدی جا چکے تھے اور اب زخمی اٹھائے جا رہے تھے۔ وجے کا باپ دیوان چند بھی زخمی حالت میں لان کی گھاس پر پڑا تھا۔ اُسے دو پولیس والے اٹھا ہی رہے تھے کہ وجے نے دیکھ لیا۔ وہ تیزی سے دیوان چند کے قریب آیا۔ دیوان چند نے اُسے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اُس کی حالت بتا رہی تھی کہ اب وہ کچھ ہی دیر کا مہمان ہے۔ اُس کے چاروں طرف خون پھیلا ہوا تھا۔ وجے اُس کے پاس جھک کر بیٹھ گیا۔

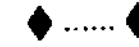
دیوان چند نے بہت پیار سے وجے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شاید وہ اپنے دل کا بھید اس آخری وقت میں وجے کے سامنے ظاہر کر دینا چاہتا تھا۔ وجے کو بھی اس کا اندازہ ہو چکا تھا۔ پھر دیوان چند نے کچھ کہنے کو ہونٹ کھولے مگر ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ غالباً یہ بے بسی کے آنسو تھے۔ اُس نے ٹوٹتے ہوئے سانس کو کھینچا، پھر بھی الفاظ منہ سے نہ نکل سکے۔ معاً اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ اُس کا وہ ہاتھ جو وجے کے ہاتھوں میں تھا، ڈھیلا پڑ گیا۔ اُس کی رُوح جسم سے نکل چکی تھی۔

وجے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نہ جانے اس کے باپ کے دل میں کیا راز تھا جسے ظاہر کئے بغیر وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ آخری وقت میں شاید وہ اسی راز سے پردہ اٹھانے والا تھا مگر زندگی نے اسے مہلت نہیں دی۔ اب وہ اپنے بیٹے کو جرائم کے چنگل سے نکلتے دیکھ سکتا تھا تو اُس کی آنکھوں میں زندگی کی روشنی ہی بجھ گئی تھی۔ آج وہ چندانی کی قید سے نکلنے میں کامیاب ہوا تو زندگی اسے دھوکا دے گئی۔

ڈی آئی جی نے وجے کو تسلی دینے کے لئے اُس کی پشت پر تھپکی دی اور بولا۔ ''آئی ایم سوری مائی سن!''

وجے کے آنسو اب اُس کے رُخساروں پر بہہ رہے تھے۔ جس کی زندگی کے لئے

وجے نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی، اب وہی نہیں رہا تھا۔



کافی دیر تک وجے پولیس اسٹیشن میں رہا۔ اُس نے اپنا تفصیلی بیان ریکارڈ کرایا۔ مجرموں اور اسمگلروں کے اتنے بڑے گروہ کے پکڑے جانے کی اطلاع جنگل کی آگ کی مانند پورے شہر میں پھیل گئی۔ پولیس اسٹیشن کے سامنے لوگوں نے ہجوم کر لیا تھا۔

پولیس کو اتنی بڑی تعداد میں تماشائیوں کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

اسی ہجوم میں اخبار نویس بھی تھے جو پولیس والوں سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے۔ جب اخبار نویسوں کو یہ معلوم ہوا کہ اس گروہ کو پکڑوانے کا سہرا وجے کے سر ہے تو انہوں نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ فوٹو گرافروں نے اُس کی تصویریں بھی کھینچیں۔

وجے کے دل پر اپنے باپ دیوان چند کی موت کا بوجھ تھا۔ پھر بھی وہ رپورٹروں کے سوالوں کے جواب صبر و تحمل سے دیتا رہا۔ آدھی رات کے بعد وہ اپنے گھر پہنچا تو تھکن سے چور چور تھا۔ اس پر بھی اُسے نیند نہ آسکی۔ وہ اپنے باپ کے مرنے پر بے حد رنجیدہ تھا۔

اُس کے باپ کی لاش کو ہسپتال پہنچا دیا گیا جہاں لاش کا پوسٹ مارٹم ہونا تھا۔ لاش اگلے دن ملنی تھی۔ بستر پر دراز ہو کر وجے بار بار یہ سوچتا رہا کہ آخر پتا جی مرنے سے پہلے کیا کہنا چاہتے تھے؟ اُن کے دل میں کیا راز تھا؟ وہ بھگوان کے بارے میں طنزیہ گفتگو کرتے کرتے کیوں اُداس ہو جاتے تھے؟

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے ساری رات کروٹیں لیتے گزر گئی۔ صبح کے وقت وجے کی آنکھ لگی تو فون کی گھنٹی نے اُسے جگا دیا۔ دیر سے سونے کے سبب اُس کا سر دُکھ رہا تھا۔

اُس نے فون کرنے والے کو دل ہی دل میں برا بھلا کہتے ہوئے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔ اُس نے ''ہیلو'' کہا مگر جواب میں کوئی نہ بولا۔ وجے کا دل تیزی سے دھڑک اُٹھا۔ اُس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ کہیں گزشتہ رات کے معرکے میں بچ نکلنے والے چندانی کے کسی آدمی نے تو اُسے فون نہیں کیا؟ اس بار وجے نے ذرا سے تیز لہجے میں ''ہیلو'' کہا۔ آخر دوسری طرف سے انشو کی شہد بھری آواز آئی۔

''میں ہوں، انشو۔''

یہ سنتے ہی وجے کے سر کا درد جیسے ایک دم غائب ہو گیا۔ اُس نے بڑے پیار سے کہا۔ ''اتنی صبح ہی صبح...... خیریت تو ہے؟''

''آج کے اخبار میں آپ کی تصویر دیکھی اور کارنامہ بھی پڑھا تو سوچا کہ آپ کو مبارکباد دے دوں۔''

''شکریہ۔'' وجے نے سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن جن کی زندگی بچانے کی خاطر میں نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا، وہ...... وہ دنیا سے چلے گئے۔''

''وہ تو ہے، مگر آپ کے پتا جی نے اپنی جان کی قربانی دے کر نہ صرف ایک بہت بڑے گروہ کا خاتمہ کرا دیا بلکہ بے شمار مظلوموں اور مجبوروں کو بھی بچا لیا۔ بھگوان جو کرتا ہے، بہتر ہی کرتا ہے۔ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ اگر وہ بچ جاتے تو سرکار انہیں معاف کرنے کی بجائے ساری زندگی کے لئے جیل میں ڈال دیتی۔''

وجے نے سوچا، انشو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اُس کے باپ نے ساری زندگی جرائم کی دنیا میں گزار دی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اُس کے دامن پر کسی بے گناہ کا خون ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے پتا جی مرنے سے پہلے اپنے اسی گناہ کا اعتراف کرنا چاہتے ہوں؟ وجے کا ذہن پھر معمے کی گتھیاں سلجھانے لگا کہ اُس کا باپ دیوان چند مرتے وقت کیا کہنے کی کوشش کر رہا تھا......؟



ابھی وجے اپنے خیالوں میں گم تھا کہ دوسری طرف سے انشو کی آواز سنائی دی۔

"کیا ہوا، آپ خاموش کیوں ہیں؟"

"جی...... جی نہیں۔" وجے چونک کر بولا۔ "آپ کا خیال پتا جی کے بارے میں ٹھیک ہے۔ انہیں...... شاید عمر قید ہو جاتی۔"

"اب آپ کو ایک نئی زندگی شروع کرنی ہے۔" انشو نے کہا۔

وجے سوچنے لگا کہ نئی زندگی کے لئے ایک نئے شریک زندگی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا انشو میری زندگی میں یہ کردار ادا کر سکتی ہے؟ یہ سوچتے ہوئے اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا، مگر اُس نے اپنے دل کو سنبھال لیا۔ انشو کو مجھ سے صرف ہمدردی ہے۔ وہ اچھے دل کی مالک ہے اسی لئے میرے اچھے مستقبل کی آرزومند ہے۔ اس کا پیار تو وشال ہے۔ اگر اس کی زندگی میں وشال نہ آتا تو شاید وہ میری ہو سکتی تھی۔

انشو نے اُسے خاموشی پر ایک بار پھر ٹوکا تو وہ کہنے لگا۔ "میں واقعی اب ایک نئی زندگی شروع کروں گا۔"

"گڈ...... اچھا اب میں اجازت چاہتی ہوں، پھر کبھی ملیں گے۔" انشو نے یہ کہہ کر دوسری جانب سے ریسیور رکھ دیا۔

وجے نے بھی گہرا سانس لے کر ریسیور کو کریڈل پر رکھا۔ اُس کی آنکھوں میں انشو کا حسین و پُرکشش چہرہ گھوم رہا تھا۔

اسی طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ وجے اپنے باپ کی لاش کو نذرِ آتش کر چکا تھا۔ وہ اکثر گھر میں بیٹھا ماضی اور مستقبل کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔ وہ اکثر سوچتا کہ دیوان چند نے اس سے کون سا راز چھپایا تھا؟ مگر اُسے کوئی جواب نہ سوجھتا۔ اب آگے اُسے کیا کرنا چاہئے؟ یہ بھی وہ طے نہ کر سکا تھا۔

اس عرصے میں ایک بار بھی انشو کا فون نہ آیا تو وجے نے خود اُسے فون کرنے کا ارادہ کیا مگر ہمت نہ ہوئی کہ کہیں انشو پر اُس کے دل کا بھید نہ کھل جائے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو وہ انشو کی ساری ہمدردی کھو دے گا بلکہ انشو شاید اس سے نفرت کرنے لگے۔

وجے کو جب معلوم ہوا کہ اب اُس پر کوئی مقدمہ نہیں چلے گا تو وہ بہت خوش ہوا۔ پولیس نے اُسے سرکاری گواہ بنا لیا تھا۔ اس کے علاوہ ڈی آئی جی نے اتنے بڑے گروہ کے خاتمے میں مدد دینے پر اس کے لئے حکومت کی جانب سے ایک بڑے انعام کی سفارش بھی کی تھی۔ پولیس نے چندانی سیٹھ کا بنگلہ، تہہ خانہ اور ان کے اندر موجود ایک ایک چیز اپنے قبضے میں لے لی تھی۔ وہاں سے ملنے والے کاغذات اور دستاویزات کی باریک بینی سے جانچ پڑتال کی جا رہی تھی۔

ڈی آئی جی نے اس بڑی کامیابی پر اپنے بنگلے پر ایک پارٹی دی۔ اس پارٹی میں محکمہ پولیس کے سبھی بڑے اور اعلیٰ افسران کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ ظاہر ہے اس میں وجے بھی موجود تھا۔ پارٹی میں رائے صاحب، اُن کی بیوی اور انشو کو دیکھ کر وجے خوش ہو گیا۔

انشو کو بھی شاید وجے ہی کا انتظار تھا۔ وجے کو دیکھتے ہی وہ خوشی سے کھل اُٹھی، لیکن جلد ہی اُس نے خود کو سنبھال لیا۔ وہ اپنی دلی کیفیت کسی پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال بھی بہرحال تھا کہ وہ کسی سے منسوب ہو چکی ہے۔ ایسی صورت میں کسی دوسرے شخص کے لئے اُسے محتاط رویہ ہی اپنانا چاہئے۔ انشو کے اردگرد اُس کی سہیلیاں تھیں۔ وجے نے انشو کو اپنی ہی طرف متوجہ دیکھا، اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ سوچ رہا تھا، یہ لڑکی کتنی جلدی میرے دل و دماغ پر چھا گئی ہے۔ مگر اب یہ کسی اور کی ہو جائے گی۔ وشال بڑا خوش قسمت ہے۔

وجے نے رائے صاحب اور اُن کی بیوی کو "نمستے" کہا۔ ان دونوں نے وجے کو کامیابی پر مبارکباد دی۔ پھر وجے اپنی پلیٹ میں کچھ کھانے کی چیزیں رکھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ دوسری جانب انشو بے چین ہو رہی تھی۔ وجے کو اکیلے دیکھ کر وہ اُس کی طرف چلی آئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کا استقبال دلآویز مسکراہٹ سے کیا۔ انشو

جدید تراش خراش کے لباس میں بے حد حسین لگ رہی تھی۔ آج اُس نے اپنے سنہری بالوں کو منفرد انداز سے سنوارا تھا۔

انشو کے سحر انگیز حسن نے وجے کو مبہوت سا کر دیا۔ وہ انشو کو دیکھے جا رہا تھا۔ انشو کے سوا جیسے وہاں کوئی نہ ہو۔ انشو اُس سے باتیں کر رہی تھی اور اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے انشو کے جسم سے ایک مسحور کن خوشبو نکل کر پورے ہال میں پھیل رہی ہے۔ انشو اپنی معنی خیز باتوں سے وجے پر اپنے دل کا بھید ظاہر کرنا چاہتی تھی مگر وجے تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وجے کہیں اور ہو، وہاں موجود نہ ہو۔ اسی وجہ سے انشو مایوس ہونے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر میں نے کھل کر وجے سے اظہارِ محبت کر ڈالا تو شاید وجے پر اس کا کچھ اچھا اثر نہیں پڑے گا۔ کسی لڑکی کو عشق کے اظہار میں پہل نہیں کرنی چاہئے۔ جدید طرزِ معاشرت کے باوجود انشو بہرصورت ایک مشرقی لڑکی تھی۔

وجے بھی کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔ اُس کی باتیں، اُس کا شوخ لہجہ اور بولتی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ اس پر وجے کو حیرت تھی کہ کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا انشو میری خاطر اپنے منگیتر وشال کو چھوڑ سکتی ہے؟ میری محبت کی خاطر اپنے ماں باپ سے بغاوت کر دے گی...... اگر ایسا ہوا بھی تو انشو کے والدین کسی ایسے نوجوان کو اپنا داماد بنانا قبول کر لیں گے جس کے جرائم کی تشہیر اخبارات میں بھی ہو چکی ہے؟ انشو ایک مجرم کو اپنا جیون ساتھی کس طرح بنا سکتی ہے؟

پے در پے سوالوں نے وجے کے ذہن پر یورش کر دی۔ اس کے باوجود وجے کو اندازہ ہو رہا تھا کہ انشو جس طرح اس میں دلچسپی لے رہی ہے، اسے صرف ہمدردی نہیں کہا جا سکتا۔ انشو کی آنکھیں اُسے کوئی اور ہی پیغام دے رہی تھیں، ایک ایسا پیغام جس پر یقین کرنا اس کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔

یکایک انشو کی ایک سہیلی وہاں آ گئی۔ وہ انشو سے بہت قریب اور بے تکلف تھی۔ اُسے آنے میں دیر ہو گئی تھی اس لئے سیدھی انشو کے پاس پہنچی۔ یہ وہی لڑکی تھی جو انشو کو اُس روز ریلوے اسٹیشن پر لینے آئی تھی۔ اُس کا نام مینا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوشدلی سے ملیں۔

''ان سے ملو!'' انشو نے مینا سے کہا۔ ''یہ وجے بابو ہیں۔''

مینا کو بھی وجے کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا وہ اسی لئے وجے سے بڑے احترام کے ساتھ ملی۔

''یہ تو بتاؤ......'' مینا اپنی سہیلی انشو سے مخاطب ہوئی۔ ''ہمارے جیجا جی کہاں ہیں؟'' یہ سوال کرتے ہوئے مینا کے لہجے میں شوخی تھی۔

انشو اور وجے دونوں ہی یہ سوال سن کر چونک اُٹھے۔

''اُرے بھئی میں وشال بابو کی بات کر رہی ہوں۔'' مینا پھر چہکی۔

وشال کا نام سن کر وجے کا چہرہ تاریک ہو گیا۔

''مجھے کیا معلوم وہ کہاں ہیں۔'' انشو نے جواب دیا تو اُس کی آواز سے کسی قدر ناگواری جھلک رہی تھی۔

''تم یہ کیا کہہ رہی ہو؟'' مینا نے کہا۔ ''سب سہیلیوں نے ہفتے کو پکنک کا پروگرام بنایا ہے۔ ہم سب کو وشال بابو کا انتظار ہے اور تم کہہ رہی ہو، تمہیں کیا معلوم کہ وہ کہاں ہیں...... یہ بھی خوب رہی۔ انہیں آٹھ یا نو تاریخ تک آنا تھا۔ تم نے خط لکھا اُنہیں؟''

''اوہ!'' انشو نے کن انکھیوں سے وجے کی طرف دیکھا۔ اُسے واقعی اپنی سہیلیوں کے کہنے پر وشال کو خط لکھنا تھا، مگر وجے کے عشق میں وہ سب کچھ بھول بیٹھی تھی۔

''کہاں ہو میڈم؟'' مینا نے سوالیہ انداز میں آنکھوں کو گردش دی۔ ''یعنی تم وشال بابو کو خط نہیں لکھ سکیں؟''

''بھئی مجھے خط لکھنے کی عادت نہیں ہے۔'' انشو زچ ہو کر بولی۔

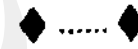
''کوئی بات نہیں۔'' مینا نے کہا۔ ''ابھی وقت ہے، تم وشال بابو کو فون کر دو۔ ہم لوگوں کا پروگرام پکا ہے، دس تاریخ یاد رکھنا۔'' یہ کہہ کر مینا وجے کی طرف پلٹی اور کہنے لگی۔ ''بیچارے وشال بابو تو اس کے پیار میں دیوانے ہیں اور یہ...... مگر وہ بے حد شرمیلے ہیں، اس سے آنکھ تک نہیں ملاتے۔'' پھر وہ چونک کر بولی۔ ''وجے بابو! آپ ہمارے ساتھ پکنک پر کیوں نہیں چلتے؟''

''مم...... میں......'' وجے ہکلا کے رہ گیا۔

''جی ہاں آپ۔ چلیں، بڑا مزہ آئے گا۔''

انشو بھی بول اُٹھی۔ ''ہاں وجے بابو، چلئے نا...... بس آپ کو چلنا ہے۔ ہر قیمت پر چلنا ہے۔ آپ تو ویسے بھی اکیلے ہیں۔ میں آپ کے حصے کا لنچ اور بریک فاسٹ لے آؤں گی۔ رات کا کھانا ہم لوگ پکنک اسپاٹ ہی پر تیار کریں گے۔''

وجے کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی جو مینا سے چھپی نہ رہ سکی۔ وہ سوچنے لگی، وجے میں انشو اتنی غیر معمولی دلچسپی کیوں لے رہی ہے؟ انشو اس کا کھانا اور ناشتہ بھی خود لے کر آئے گی، مگر کیوں؟ پھر اُس نے سر جھٹک کر سوچا کہ انشو، وجے کی بہت اچھی دوست ہے اور بس، اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ دوستی الگ ہوتی ہے اور پیار الگ۔ دوست اور محبوب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔



اتوار کے دن صبح انشو کی تمام سہیلیاں اور دوست لڑکے وقت مقررہ پر اُس کے بنگلے پر پہنچ گئے تھے۔ ان میں مینا بھی شامل تھی۔ مگر مینا کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وشال موجود نہیں تھا۔

''وشال بابو نہیں آئے؟'' مینا نے آخر انشو سے پوچھ ہی لیا۔

''تجھے ان کی اتنی فکر کیوں ہے؟'' انشو نے ناگواری سے کہا۔ ''اگر نہیں آئے تو نہ سہی۔''

''مجھے اُن کی فکر نہیں بلکہ تیری فکر ہے۔ تو ان کے بغیر اکیلی ہو جائے گی نا۔ سبھی لڑکیوں کے دوست ساتھ جا رہے ہیں۔''

انشو اُسے کیا بتاتی کہ اُس نے جان بوجھ کر وشال کو فون نہیں کیا۔ وہ وجے کے ساتھ رہنے کا یہ موقع گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح اپنے دل کا حال وجے پر ظاہر کر دے۔ اپنے جذبات پر قابو رکھنا اب اُس کے لئے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

''اب تو اکیلی بور ہو گی۔'' مینا بولی۔

''بور کیوں ہونے لگی۔'' انشو کہنے لگی۔ ''وجے بابو نہیں ہیں کیا میرے ساتھ؟''

''وجے بابو......؟ لیکن اُن پر تو میری نظر تھی۔'' مینا نے شوخی سے کہا۔

''کیا؟'' انشو نے آنکھیں نکالیں۔

''ایک بات تو بتا انشو!'' مینا نے رازداری سے پوچھا۔ ''کیا تجھے وجے بابو سے وہ......'' اُس نے دانستہ کچھ کہتے کہتے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ انشو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کے چہرے سے سنجیدگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ مینا ٹھنڈا سانس لے کر بولی۔ ''میں سمجھ گئی...... مگر کیا ان کو بھی تجھ سے پیار ہے؟''

''معلوم نہیں۔'' انشو نے جواب دیا۔

''معلوم نہیں کی بچی۔'' مینا کے لہجے میں شوخی تھی۔ ''بھلا وہ کون نوجوان ہو گا جو تیرے لئے سرد آہیں نہ بھرے گا۔ خیر پکنک پر میں اُن کے دل کا حال معلوم کر کے رہوں گی۔''

سبھی لوگ تقریباً آ چکے تھے۔ پھر وجے بھی آ گیا۔ اُسے دیکھ کر انشو کھل اُٹھی۔ مینا بغور انشو کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ لوگ چلنے کو تیار ہو گئے۔ ایک منی بس میں سوار ہو کر وہ بمبئی سے کچھ فاصلے پر واقع ایک پکنک اسپاٹ کی طرف چل دیئے۔

منی بس میں انشو کو اُس کی سہیلیوں نے گھیر رکھا تھا۔ یہ بات نہ تو انشو کو پسند آ رہی تھی نہ وجے کو۔ وہ منی بس کے آخری حصے میں ایک نشست پر بیٹھا تھا۔ لطیفے چل رہے تھے، گیت بھی گائے جا رہے تھے۔ سبھی قہقہے لگا رہے تھے۔ ایک نوجوان نے گٹار بجانا شروع کر دیا تھا۔

بس روانہ ہوتے ہی سب نے ناشتہ کیا۔ وجے کے لئے انشو ناشتہ لائی تھی جو اُس نے اپنے ہاتھ سے وجے کو دیا۔ اس کے بعد چائے کے تھرماس نکل آئے۔ ان سب نے چائے پی۔ انشو نے وجے کو بھی چائے دی۔ بس میں خوب شور ہو رہا تھا اور وہ اپنی منزل کی طرف اُڑی جا رہی تھی۔ سبھی شوخیاں کر رہے تھے لیکن ایسے مواقع پر ہمیشہ چہکنے والی انشو آج چپ تھی۔ یہ بات مینا نے بھی محسوس کی تھی۔

وجے اور انشو کی نظریں بار بار آپس میں مل رہی تھیں، مگر دونوں کی زبانیں خاموش تھیں۔ لگتا تھا، دُور ہو کر بھی وہ ایک دوسرے کے دل کی دھڑکن سن رہے تھے۔ خاموشی جیسے اُن کے لئے گفتگو بن گئی تھی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں انہوں نے جیسے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔

چھ گھنٹے سفر کے بعد بمبئی کے قریب منی بس ایک پکنک اسپاٹ پر پہنچی۔ یہ ایک ڈاک

بنگلہ تھا جو پہاڑیوں کے درمیان بنایا گیا تھا۔ یہاں گھنے درخت بھی تھے اور ایک آبشار بھی جو چٹان سے گر رہا تھا۔ بڑی پُرفضا جگہ تھی۔

ڈاک بنگلے کے مالی اور چوکیدار نے ان لوگوں کا سامان اتارا۔ سبھی لڑکے اور لڑکیاں اس حسین منظر کو اپنی آنکھوں میں بساتے رہے۔ انشو کی نگرانی میں سارا سامان ڈاک بنگلے کے اندر ایک بڑے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

موسم بہت سہانا تھا۔ ہلکی ہلکی سردی تھی۔ سبھی لوگ اندر جانے کے بجائے سیڑھیاں اُتر کر آبشار کے قریب پہنچ گئے اور اس حسین نظارے سے لطف اندوز ہونے لگے۔ چٹان کے اوپر سے پانی گرنے کی مسلسل آواز میں عجیب سی دلکش موسیقی تھی جسے صرف محسوس ہی کیا جا سکتا تھا۔ اس نشاط انگیز موسیقی کے سحر میں جیسے وہ سبھی کھو سے گئے تھے۔ انشو کی سہیلیاں خاصی ماڈرن تھیں۔ وہ مردوں کے سامنے تیراکی کرتے ہوئے بھی نہیں جھجکتی تھیں۔ خود انشو بھی اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتی تھی، مگر اس وقت جانے کیوں وجے کے سامنے وہ اس کی ہمت نہ کر سکی۔ وجے کے سامنے اُسے جھجک اور کچھ شرم سی محسوس ہو رہی تھی۔ حالانکہ اُس نے انگریزی اسکولوں اور کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ لڑکوں کے ساتھ گھلنا ملنا، تفریح کرنا یا پکنک منانا اُس کے نزدیک کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی۔ وہ بڑی با اعتماد لڑکی تھی۔ جنس مخالف سے وہ کبھی مرعوب نہیں ہوتی تھی، لیکن وجے کی بات مختلف تھی۔ اُس کے سامنے انشو خود کو بالکل بے بس اور کمزور محسوس کر رہی تھی۔ یہ انشو کے لئے ایک نیا اور انوکھا سا تجربہ تھا۔

مینا نے تیراکی کا لباس پہنا اور بلا جھجک آبشار میں تیرنے لگی۔ دوسری لڑکیوں نے بھی تیراکی کا لطف لیا، لیکن انشو، مینا کے بار بار اصرار کے باوجود تیراکی کے لئے تیار نہ ہوئی۔ وجے کے سامنے تیراکی کا لباس پہنتے ہوئے وہ شرما رہی تھی۔

دوسرے لڑکے لڑکیاں اپنی تفریح میں مگن تھے اور وجے آہستہ آہستہ انشو کی طرف بڑھ رہا تھا۔ انشو نے بھی اُسے دیکھ لیا تھا۔

وجے اُس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔ انشو سے بات کرنے کی ہمت اُسے اپنے اندر محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ انشو چاہتی تھی کہ وہ کچھ کہے، کچھ بولے، اُس سے پیار کا اظہار کرے، لیکن وجے ہچکچا رہا تھا۔

ایک ایسی لڑکی جو کسی سے منسوب ہو چکی تھی، کیا اس سے اظہارِ محبت مناسب ہوگا؟ وجے سوچنے لگا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے تھے اور آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں، زبانیں البتہ گنگ تھیں۔ مینا نے تیراکی کرتے ہوئے یہ منظر دیکھا تو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس کے بعد وجے آگے کی طرف بڑھ گیا۔ اُس کا رُخ اُس چٹان کی طرف تھا جس سے آبشار گر رہا تھا۔ انشو نے اُس کی طرف دیکھا۔ پہلے تو وہ ہچکچائی، پھر وجے کے پیچھے چل پڑی۔ دوسرے لڑکے لڑکیاں اپنی خوش گپیوں میں مگن تھے۔ مینا کے سوا انشو اور وجے کی طرف کسی کی بھی توجہ نہیں تھی۔ اُس کی نظریں ان دونوں کا تعاقب کر رہی تھیں۔

وجے چٹان کے اوپر چڑھنے لگا تو انشو نیچے ہی رُک گئی۔ وجے نے مسکرا کر انشو کی جانب دیکھا اور آنکھوں سے اُسے بھی اوپر آنے کی دعوت دی۔ انشو نے وہ دعوت قبول کر لی اور آگے بڑھنے کے ارادے سے قدم اٹھایا ہی تھا کہ معاً وجے کا پیر پھسلا اور وہ چٹان سے لڑھکتا ہوا نیچے آ گیا۔ انشو کے منہ سے تیز چیخ نکل گئی۔ وجے کو چٹان سے پھسلتے دیکھ کر وہ گھبرا گئی تھی۔

پاگلوں کی طرح بھاگتی ہوئی وہ وجے کے پاس پہنچی۔ دوسرے لڑکے لڑکیوں نے بھی انشو کی چیخ سن لی تھی۔ وہ سب بھی لپک کر انشو اور وجے کے پاس پہنچ گئے۔ وجے کا سر گود میں لے کر انشو رو رہی تھی۔ وجے کی آنکھیں بند تھیں۔ وجے کے لئے انشو کا اس طرح تڑپنا یقیناً غیر معمولی سی بات تھی جسے سبھی نے محسوس کیا۔ سب کو اس پر حیرت ہوئی۔ اُنہیں کیا خبر کہ یہ دل کا معاملہ تھا۔ وہ تو صرف یہی جانتے تھے کہ انشو کی شادی وشال سے ہوگی۔ لیکن اس وقت انشو کی حالت و کیفیت نے انہیں بتا دیا تھا کہ اصل کہانی کچھ اور ہی ہے۔

"کوئی فرسٹ ایڈ باکس لاؤ" کسی نے چیخ کر کہا۔

"انہیں اٹھا کر اوپر لے چلو" ایک اور آواز آئی۔

مینا بھی اس وقت تک وہاں پہنچ چکی تھی۔ وجے کو بے ہوش دیکھ کر وہ بھی پریشان ہو گئی تھی۔ اوپر سے انشو مسلسل روئے جا رہی تھی۔

اچانک وجے نے جھرجھری لے کر آنکھیں کھول دیں اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اپنے اردگرد لڑکے لڑکیوں کو دیکھ کر اور خاص طور سے انشو کو روتا دیکھ کر وہ ہڑبڑا گیا۔

''آپ ٹھیک تو ہیں؟'' مینا نے سوال کیا۔

''جی ہاں۔'' وجے نے بتایا۔ ''دراصل چٹان سے گرتے ہوئے میرا سر کسی پتھر سے ٹکرا گیا تھا مجھے اسی وجہ سے چکر سا آ گیا تھا۔ اب ٹھیک ہوں۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔

اسے دیکھ کر انشو کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا۔ اُس نے اپنے آنسو پونچھ لئے۔ لڑکے لڑکیاں ان دونوں کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ انشو ان کی نظروں کو برداشت نہ کر سکی۔ وہ بھاگتی ہوئی اوپر ڈاک بنگلے میں چلی گئی۔ وجے مسکرا دیا۔ اب اُس کے اور انشو کے درمیان تعلقِ عشق میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔

لنچ کا وقت ہو چکا تھا۔ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ سبھی لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے لنچ بکس لے کر مختلف جگہوں پر بیٹھ کے کھانے لگے۔ کوئی برآمدے میں بیٹھا تھا، کوئی سیڑھیوں پر، کوئی آبشار کے کنارے چلا گیا تھا اور کوئی درختوں کے درمیان۔ بعض من چلوں نے چٹانوں پر بیٹھ کر لنچ کھانے کا پروگرام بنایا تھا۔

انشو دو پلیٹوں میں کھانا لے کر وجے کے پاس آئی۔ اُس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ وجے سے نظر نہیں ملا پا رہی تھی۔ آج وہ جس طرح وجے کے لئے روئی اور تڑپی تھی، اس کی وجہ سے سبھی ساتھیوں پر اُس کے دل کا بھید کھل گیا تھا۔

وجے پر نگاہ ڈال کر وہ دھیرے سے مسکرائی اور پلیٹ اُس کی طرف بڑھا دی۔ دونوں برآمدے کے ایک کونے میں بیٹھ گئے اور خاموشی سے کھانا کھانے لگے، مگر اس خاموشی کی بھی اپنی ایک زبان تھی۔ محبت کی زبان!

دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، مگر ان کے درمیان شرم و حیا کی دیوار حائل رہی۔ ایک دوسرے کے دل کا راز جان لینے کے بعد بھی ان کی زبانوں پر حرفِ محبت نہ آ سکا۔ وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ البتہ ان کے درمیان تبسم زیرِ لب کا تبادلہ ہوتا رہا۔ اسی دوران ایک بار جب انشو نوالہ منہ میں رکھ رہی تھی تو اُس کی ساڑھی کا آنچل ڈھلک گیا۔ وجے کی نظر اُس کے دائیں بازو پر پڑی جس پر ایک بڑا سا تل اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ وجے کی نظریں اس تل پر تھیں کہ انشو نے یہ بات بھانپ لی۔ اُس نے جلدی سے بازو کو ساڑھی

سے ڈھک لیا۔ وجے نے بھی نظر ہٹا لی۔

اسی طرح کھاتے پیتے اور ہنستے بولتے شام ہو گئی۔ سردی بڑھنے لگی تھی۔ ویسے بھی کھلا ماحول تھا، اوپر سے آبشار، درخت اور پہاڑ! ان سب کے باعث فضا میں پہلے کی نسبت زیادہ ٹھنڈک تھی۔ لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے گرم کپڑے پہننے لگے۔ انشو نے بیل باٹم پینٹ اور کرتی پہن لی تھی۔ پھر اُس نے میک اپ کیا۔ دوسری لڑکیوں نے بھی ہاتھ منہ دھونے کے بعد بناؤ سنگھار کیا۔

اچھی طرح بن سنور کر لڑکیاں باہر نکل آئیں۔ لڑکے بھی اپنے کمرے میں تیار ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے کچھ دیر چاندنی کا لطف لیا۔ پھر ایک لڑکے نے گٹار پر دل آویز دُھن چھیڑ دی۔ ایک لڑکی نے پیار بھرا نغمہ گانا شروع کر دیا۔ غرض اسی طرح گاتے بجاتے رات کے دس بج گئے۔ ان لوگوں نے ڈنر کا پروگرام بنایا تو زیادہ تر لڑکے اور لڑکیوں نے معذرت کر لی۔ ویسے بھی وہ بہت تھک چکے تھے۔ لڑکوں کو الگ کمرے میں سونا تھا اور لڑکیوں کے لئے اندر والا کمرہ تھا۔ سب لوگ ایک دوسرے کو ''شب بخیر'' کہہ کر رخصت ہو گئے۔ وجے مردانے میں تھا اور انشو دوسری لڑکیوں کے ساتھ اندر والے کمرے میں، مگر دونوں خیالوں میں ایک دوسرے کے پاس تھے۔ سوچتے سوچتے نہ جانے کب اُن کو نیند آ گئی۔

دوسرے دن صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد ان لوگوں نے واپسی کے سفر کی تیاری شروع کر دی۔

واپسی میں وجے اور انشو منی بس کی ایک سیٹ پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ اب تو گویا راز فاش ہو ہی گیا تھا لہٰذا انہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے اس دوران میں گفتگو بہت کم کی تھی لیکن دل ہی دل میں ایک دوسرے کو حاصل کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ دونوں ہی محبت میں سنجیدہ تھے۔

''وجے!'' انشو نے اچانک اُسے مخاطب کیا۔ وجے چونک اُٹھا۔ انشو نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں ممی ڈیڈی سے کہوں گی کہ میں نے...... میں نے اپنے لئے جیون ساتھی ڈھونڈ لیا ہے۔'' انشو کی آواز جذبات سے بوجھل تھی۔

''مگر وشال......'' وجے نے کہنا چاہا۔

"وشال میری نہیں، ممی ڈیڈی کی پسند ہے۔" انشو بول اُٹھی۔ "اس وقت تک میری زندگی میں تم نہیں آئے تھے۔ لیکن اب...... اب میں وشال سے شادی نہیں کر سکتی اور...... اور میرے ممی ڈیڈی بھی زبردستی ایسا نہیں کریں گے۔"

"اور...... اور وشال کیا سوچے گا؟" وجے نے سوال کیا۔

"میں نے اُس سے کبھی پیار نہیں کیا۔" انشو کہنے لگی۔ "میرے دل میں وشال کے لئے پیار کے جذبات کبھی نہیں اُبھرے۔ کبھی میرا دل اس کے لئے تیزی سے نہیں دھڑکا۔ میں تو ماں باپ کے احترام کی وجہ سے خاموش تھی۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس وقت تک میں پیار سے ناآشنا تھی۔ اب اور بات ہے۔ اب میرا دل تمہارے لئے دھڑکتا ہے وجے! میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گی۔" انشو جذباتی نظر آنے لگی۔

وجے خاموشی کے ساتھ انشو کے حسین چہرے کو دیکھنے لگا جس پر محبت کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔



سینما دیکھنے جانا ہو، پارک کی سیر کرنے چلنا ہو، کسی ہوٹل جانا ہو یا پکنک پر، انشو جہاں بھی جاتی اُس کے ساتھ سہیلیوں کے علاوہ وجے ضرور ہوتا۔ وجے کے بغیر انشو کو اپنی ہر خوشی ادھوری لگتی تھی۔ اُس نے اپنا مستقبل وجے کے نام کر دیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے پیار میں کھو چکے تھے۔

انشو ہی تھی جس کی محبت نے وجے کی زندگی کو یکسر بدل دیا تھا۔ وہ اب جرم کا راستہ چھوڑ چکا تھا۔ اسے اب ایک نئے مستقبل کی تلاش تھی، ایسا مستقبل جس پر جرم کے سائے نہ ہوں۔ وہ شب و روز جدوجہد میں مصروف تھا۔

ابھی تک انشو نے اس سلسلے میں اپنے ممی ڈیڈی سے بات نہیں کی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کے ماں باپ وجے کو پسند نہیں کریں گے۔ کیونکہ اُس کا ماضی جرم کی راہ پر چلتے ہوئے گزرا تھا۔ انشو اسی لئے اس وقت کے انتظار میں تھی جب کوئی عمدہ موقع ہاتھ لگے اور وہ اپنے دل کی بات ماں باپ سے کہہ دے۔ اُس نے اسی سبب وجے کو فون کرنے سے بھی منع کر دیا تھا۔ وہ خود ہی وجے کو فون کرتی تھی۔

انشو کو دنیا کی ہر خوشی مل چکی تھی۔ اسی بناء پر اُس سے یہ خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی

تھی۔ پہلے وہ بات بے بات قہقہے لگاتی تھی اور اپنے ڈیڈی کے گلے میں بانہیں ڈال کر بچوں کی طرح جھول جاتی تھی، مگر اب اس میں ایک ٹھہراؤ آ چکا تھا۔

وجے کی محبت نے اُس کے انداز و اطوار بدل دیئے تھے۔ وہ اکیلے میں بھی مسکراتی اور خود سے باتیں کرتی تھی۔ انشو کی اس جنونی محبت کو اُس کی ممی نے بھی محسوس کر لیا تھا اور ڈیڈی نے بھی۔ ایک اتوار کو انشو، وجے کے ساتھ انگریزی فلم دیکھنے گئی۔ واپسی پر اُس نے وجے کو اُس کے گھر چھوڑا اور اپنے بنگلے پر پہنچی۔ آج وہ بے حد مگن تھی اور گنگناتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا رہی تھی کہ اُس کے ڈیڈی کی آواز نے قدم روک لئے۔

"انشو ادھر آؤ!" رائے صاحب نے کہا۔

انشو نے پلٹ کر دیکھا۔ ممی بھی رائے صاحب کے قریب بیٹھی تھیں۔

"بیٹی! تمہیں خوش دیکھ کر ہم دونوں کو بڑی خوشی ہوتی ہے۔" رائے صاحب نے انشو کو مخاطب کیا۔ "ہمیں تمہاری ہر خوشی عزیز ہے۔ ان دنوں تم کچھ غیر معمولی طور پر خوش دکھائی دے رہی ہو، ہم اس کا سبب جاننا چاہتے ہیں۔" رائے صاحب نے انشو سے بات کرتے ہوئے پورا خیال رکھا تھا کہ ان کے الفاظ سے انشو کی دل شکنی نہ ہو۔ ویسے بھی وہ انشو کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

انشو نے ممی ڈیڈی کو غور سے دیکھا اور پھر ان کے قریب آ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جب انہوں نے بات چھیڑ ہی دی ہے تو کیوں نہ صاف صاف بتا دوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے اور وجے کی محبت کے بارے میں انہیں کہیں اور سے پتہ چل گیا ہو۔

"وہ ڈیڈی...... مجھ میں تبدیلی...... تبدیلی تو آئی ہے...... میں نے اپنی زندگی کو...... بدل ڈالا ہے۔ وہ...... دراصل......" کچھ کہتے کہتے اُس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ پھر اُس نے خود پر قابو پا لیا اور بولی۔ "وہ...... وہ مجھے کسی...... کسی سے پیار ہو گیا ہے۔"

رائے صاحب نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ گویا اُن کا خیال صحیح تھا۔ انہوں نے تحمل سے انشو کی بات سنی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی ضد پکڑ لے۔ ان کے بھی ملنے جلنے والے یہ بات جانتے تھے کہ انشو کے لئے وہ وشال کا انتخاب کر چکے ہیں۔

"کون ہے وہ؟" انہوں نے دھیمی آواز میں سوال کیا۔

"وجے۔" انشو نے بتا دیا۔

"کیا؟" رائے صاحب اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکے۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"اُس کی یہ مجال؟"

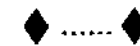
انشو کی ممی کے چہرے پر بھی غصے کے تاثرات تھے۔ وہ بھی کھڑی ہو گئی تھیں۔ وہ حیران تھیں کہ ان کی بیٹی نے اپنے لئے ایک مجرم کا انتخاب کیا ہے۔

"ڈیڈی!" انشو بولی۔ "وجے مجھ سے پیار نہیں کرتا تھا بلکہ میں اُسے چاہتی تھی، اُسی دن سے جب اُس نے رندھیر سے میری عزت بچائی تھی، مگر پھر وہ بھی مجھ سے محبت کرنے لگا...... شاید اس کی وجہ میری سچی محبت تھی۔"

"بیٹی!" رائے صاحب نے اپنے اشتعال پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے، اُس نے جرم کی راہ چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار کر لیا ہے، مگر اس کے ماتھے پر مجرم ہونے کا داغ لگ چکا ہے جو کبھی نہیں مٹ سکتا۔ ذرا سوچو بیٹی، لوگ کیا کہیں گے؟"

"لوگوں سے مجھے کیا لینا۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ اُس نے ملک دشمن عناصر کا خاتمہ کرایا، قانون کی حفاظت کی اور اس کام میں اُس کے پتا جی کی جان بھی قربان ہو گئی۔ اُس نے ہمارے ملک کو ایک بڑے نقصان سے بچا لیا ہے اور آپ اُسے مجرم کہہ رہے ہیں۔ سن لیجئے ڈیڈی! میں شادی کروں گی تو صرف وجے سے ورنہ کسی کو اپنا جیون ساتھی نہیں بناؤں گی۔" یہ کہہ کر انشو سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

رائے صاحب اور ان کی بیوی اپنی بیٹی کا یہ فیصلہ سن کر حیران و پریشان کھڑے رہ گئے۔ انشو نے آج زندگی میں پہلی بار اپنے ڈیڈی سے اس لہجے میں بات کی تھی۔ وہ دونوں سمجھ گئے کہ بیٹی ان کے ہاتھوں سے نکل چکی ہے۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے اور اندھی بھی! رائے صاحب نے سوچا اور پھر انشو کو اس سلسلے میں کچھ سمجھانے کی بجائے وجے سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح وہ ایک ہاری ہوئی بازی جیت لینا چاہتے تھے۔



شام کے چھ بجنے والے تھے۔ وجے نہانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اُس کے گھر کے سامنے ایک سفید کار آ کر رُکی۔ لمبی امپورٹڈ گاڑی۔ وجے اس کار کو دیکھ کر چونک اُٹھا۔ اس وقت انشو کو اس سے ملنے نہیں آنا تھا بلکہ سات بجے کا وقت مقرر تھا۔ پھر وہ ایک

گھنٹہ پہلے کیسے آ گئی؟ وجے یہی سوچ رہا تھا کہ کار کا دروازہ کھلا اور اس میں سے انشو کے بجائے رائے صاحب باہر آ گئے۔ وجے کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُسے ایک انجانے خوف کا احساس ہو چکا تھا۔ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے، یہ سوچتے ہوئے وہ رائے صاحب کا استقبال کرنے گھر سے باہر آ گیا۔ وجے کے "نمستے" کا جواب رائے صاحب نے صرف سر ہلا کر دیا۔ ان کے چہرے پر شفقت کی جگہ سنجیدگی سی تھی۔ وجے انہیں گھر کے اندر لایا اور کرسی پر بیٹھنے کی درخواست کی، مگر رائے صاحب کھڑے رہے۔ وہ ہر چیز کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔

"تو یہ ہے تمہارا گھر؟" رائے صاحب نے کچھ طنز سے کہا۔

"جی۔" وجے بمشکل بولا۔ رائے صاحب کے لہجے نے اُسے پریشان کر دیا تھا۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ زندگی بھر عیش و آرام سے پلنے والی انشو اس گھر میں خوش رہ سکے گی؟"

"پیار یہ سب نہیں دیکھتا رائے صاحب!" وجے نے جواب دیا۔

"پیار یہ سب دیکھتا ہے اور ضرور دیکھتا ہے۔" رائے صاحب نے بھڑک کر کہا۔ "اگر تمہیں انشو سے محبت ہے تو اس کی خوشیوں اور آرام کا خیال رکھنا بھی تمہاری ذمہ داری ہے۔ پیار کا دوسرا نام قربانی ہے۔ کیا یہ پیار ہے کہ تم ایک اچھی بھلی لڑکی کے جیون کو جہنم بنا دو......؟ کیا تم نے یہ سوچا کہ جب بھی تم انشو کے ساتھ باہر نکلو گے تو لوگ کیا کہیں گے؟ لوگ کہیں گے کہ دیکھو یہ وجے ہے جو کبھی مجرم تھا اور...... اس کا باپ بھی مجرم تھا۔"

"نہیں رائے صاحب......!" یہ ایک نئی آواز تھی جسے سن کر وجے اور رائے صاحب دونوں ہی نے گھوم کر دیکھا۔ وہ ڈی آئی جی تھا جو نہ جانے کب کمرے میں آ گیا تھا۔ وہ دونوں اپنی باتوں میں اتنے محو تھے کہ پولیس جیپ کی آواز نہ سن سکے۔ ڈی آئی جی کے ہاتھ میں ایک رسالہ تھا۔ وہ رائے صاحب کی بات سن چکا تھا، اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اُس نے کہا۔ "کوئی بھی اب یہ نہیں کہہ سکے گا کہ وجے مجرم ہے یا اس کا باپ مجرم تھا۔ وجے کا خون تو گنگا جل کی طرح پوتر (پاک) ہے۔ تبھی تو اس نے متعدد مجرموں کو پکڑوا کر انہیں صحیح زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" رائے صاحب کے چہرے سے اُلجھن کا اظہار ہونے لگا۔ وجے بھی کچھ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔

"چندانی کے بنگلے سے ملنے والی ایک ایک چیز پولیس کے قبضے میں ہے۔" ڈی آئی جی بتانے لگا۔ "ہر چیز کی باریک بینی سے جانچ پڑتال ہو رہی ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کون سی چیز کس ملک سے، کب اور کس طرح لائی گئی ہے۔ اس کا مقصد متعلقہ حکومتوں کو آگاہ کرنا ہے کہ وہ مطلوبہ مجرموں کو تحریر کردہ پتوں پر پکڑ سکتی ہیں۔ انہی اشیاء میں سے ایک یہ غیر ملکی میگزین بھی ملا ہے۔" ڈی آئی جی نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا میگزین رائے صاحب اور وجے کو دکھایا، پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ میگزین ہمارے کسی کام کا نہیں ہے، مگر وجے کے لئے یہ نہایت اہم اور بیش قیمت ہے۔ اس میگزین کے صفحات پر دیوان چند نے ایک خط لکھنا شروع کیا تھا جو وہ پورا نہ کر سکے۔ پھر بھی جو کچھ اس نے اس میں لکھا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وجے کا پتا دیوان چند نہیں تھا بلکہ اس کے پتا کا نام جگل پرشاد ہے جو دہلی میں رہتے ہیں۔"

"کیا؟" وجے چیخ اٹھا۔ ڈی آئی جی کی بات سن کر اُس کے ذہن میں زبردست چھناکا ہوا تھا۔ وہ غیر یقینی کی حالت میں کبھی رائے صاحب اور کبھی ڈی آئی جی کو دیکھ رہا تھا۔ اُسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

رائے صاحب کی حالت بھی وجے سے مختلف نہیں تھی۔ وجے نے فوراً ہی وہ میگزین کھولا۔ اس کا ایک صفحہ مڑا ہوا تھا۔ وجے نے اس صفحے کو سیدھا کیا، ایک اشتہار کے نیچے جگہ تھی، اس پر لکھا تھا۔ "وجے! تم میرے بیٹے نہیں ہو بلکہ دہلی کے ایک سیٹھ جگل پرشاد تمہارے پتا ہیں۔ چندانی کی قید میں آنے کے بعد میں تمہیں اس حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا تھا، مگر مجھے اس کا موقع نہیں مل سکا۔ اگر میں چندانی کے آدمیوں کی موجودگی میں کچھ کہہ دیتا تو پھر تمہیں بھی چندانی اپنا قیدی بنا لیتا۔ آج موقع ہے۔ تھوڑی دیر بعد پارٹی شروع ہو جائے گی جس میں تم بھی آؤ گے۔ میں نے اپنی زندگی کی کہانی لکھ کر گھر میں چھپا دی ہے...... اب پارٹی شروع ہو چکی ہے اور...... تم آنے والے ہو...... مجھے امید ہے کہ شراب کا دور چلے گا تو تم سے ملنے کا موقع مل جائے گا۔ اس وقت میں تمہیں بتا دوں گا کہ میری جیون کہانی گھر میں کہاں محفوظ ہے......! شاید کوئی ادھر آ رہا ہے۔"

یہ ایک نامکمل خط تھا جو ایک اشتہار کی خالی جگہوں پر چھوٹے حروف میں لکھا گیا تھا۔ یہ اشتہار دو صفحات پر پھیلا ہوا تھا۔

"وہ ضرور یہ خط لکھ رہے ہوں گے کہ تم نے پارٹی میں پہنچ کر کایا ہی پلٹ دی اس لئے خط نامکمل رہ گیا۔" ڈی آئی جی نے اظہار خیال کیا۔

"جی۔" وجے نے مختصر جواب دیا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ دیوان چند آخری لمحات میں اُسے کیا بتانے والا تھا۔

"اب تم اس گھر کی اچھی طرح تلاشی لو اور دیوان چند کی روداد حیات تلاش کرو جو انہوں نے کہیں چھپائی ہوئی ہے۔" ڈی آئی جی نے مشورہ دیا۔

"جی، میں اس گھر کا کونا کونا چھان ماروں گا۔ مجھے یقین ہے میری تلاش رائیگاں نہیں جائے گی۔" وجے کا لہجہ پُر جوش تھا۔

"اگر اس جیون کتھا میں پولیس کے کام کی کچھ معلومات ہوں تو ہمیں بتانا نہ بھولنا" ڈی آئی جی نے وجے کا شانہ تھپکا۔ وہ مڑا اور پھر چلتے چلتے رائے صاحب سے مخاطب ہوا۔ "اگر کوئی مجرم جرم کا راستہ چھوڑ کر سیدھی راہ اپنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اسے مایوس نہیں کرنا چاہئے۔ پھر وجے نے تو ثابت کر دیا ہے کہ وہ مجرموں کا دشمن ہے۔" ڈی آئی جی یہ کہہ کر چلا گیا۔

رائے صاحب چند لمحے خاموش رہے، پھر سنجیدہ لہجے میں کہنے لگے۔ "دوسروں کو نصیحت کرنا سبھی کو آتا ہے لیکن جب خود پر پڑتی ہے تو سچائی کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔" پھر وہ رُکے اور حتمی لہجے میں بولے۔ "میں انشو کے لئے لڑکا پسند کر چکا ہوں اور......"

"ذرا سنیے رائے صاحب!" وجے نے اُن کی بات کاٹ دی۔

"پہلے تم مجھے اپنی بات پوری کرنے دو، پھر تمہیں بولنے کی آزادی ہو گی۔" رائے صاحب نے کہا۔ "انشو کے لئے لڑکا پسند کرنے کی بات میرے دوست، عزیز، احباب اور رشتے دار سبھی جانتے ہیں۔ انشو کی شادی ہو گی تو صرف ہماری مرضی سے۔ اس میں کسی اور کی مرضی نہیں چلے گی۔"

"یہ فیصلہ آپ نہیں انشو کرے گی۔ میں اس صاف گوئی کے لئے معذرت خواہ ہوں کہ انشو بالغ اور جوان ہے۔ اسے اپنی زندگی کے بارے میں ہر فیصلہ کرنے کا پورا پورا

اختیار ہے۔'' وجے کہنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ انشو صرف اسی کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے۔

''میں نے تمہیں ایک مجرم سے اچھا انسان بننے میں اس لئے مدد نہیں دی کہ تم میری ہی عزت پر ڈاکہ ڈال دو۔''

''رائے صاحب!'' وجے کی آواز میں تیزی آ گئی۔ ''میں نے آپ کی عزت پر ڈاکہ نہیں ڈالا۔ آپ کا یہ سوچنا غلط ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں، ہماری محبت پاکیزہ ہے۔ ہمارے جذبات سطحی نہیں ہیں، ان میں محبت کی گہرائی اور سچائی ہے۔ ہم دونوں ہی کم علم یا جاہل نہیں کہ اپنا اچھا برا نہ سمجھ سکیں۔ ہم مہذب اور تعلیم یافتہ ہیں۔ میں اگر بدکردار ہوتا اور انشو کی عزت سے کھیلنا چاہتا تو......''

''شٹ اپ!'' رائے صاحب نے بھڑک کر کہا۔ ''دو کوڑی کا ایک آدمی ہماری عزت کے بارے میں اس بے باکی سے بات کر رہا ہے!''

پھر رائے صاحب نے اپنی دانست میں وجے کے منہ لگنا پسند نہیں کیا۔ وہ جانتے تھے کہ آج کل کے نوجوان اپنے بڑوں اور بزرگوں کی عزت نہیں کرتے۔ زمانہ بدل چکا ہے۔ انہوں نے سوچ لیا کہ اب جو بھی قدم اٹھانا ہوگا، خود اٹھاؤں گا۔ انشو کے مستقبل کی خاطر کسی سے بھیک نہیں مانگوں گا۔ یہی سوچتے ہوئے وہ وجے سے مزید کچھ کہے بغیر دروازے سے نکل گئے۔

رائے صاحب چلے گئے تو وجے تمام باتوں کو اپنے ذہن سے جھٹک کر دیوان چند کی ''آپ بیتی'' تلاش کرنے میں لگ گیا۔ اُسے انشو سے زیادہ اس خط کی فکر تھی جس نے اس کی زندگی میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ تلاش میں اُسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ ایک لفافہ تھا جو دراز کے اندر بچھے ہوئے کاغذ کے نیچے رکھا تھا۔ وجے نے دھڑکتے دل کے ساتھ وہ لفافہ کھولا۔ دیوان چند کی جیون کہانی ایک خط کی صورت میں تھی جو وجے کے نام لکھا گیا تھا۔ اس میں لکھا تھا۔

''وجے! مجھے ہرگز یہ اختیار نہیں کہ تجھے اپنا بیٹا کہہ سکوں۔ تو میرا خون، میرا بیٹا نہیں ہے۔ یہ بالکل سچ ہے۔ تو دہلی کے ایک سیٹھ جگل پرشاد کا بیٹا ہے۔ جگل پرشاد، شاردا پرشاد اینڈ کمپنی کے مالک ہیں۔ دہلی میں تیری ماں بھی ہے اور ایک بہن بھی۔''

ماں اور بہن کے تذکرے پر وجے کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔ اب تک اُس نے

نہ تو ماں کی ممتا دیکھی تھی نہ بہن کا پیار۔ ماں کے بارے میں پڑھ کر وہ تڑپ اُٹھا۔ بہن کے لئے بھی اُس کے دل میں پیار اُمڈ آیا۔ اپنے حقیقی باپ کو دیکھنے کی خاطر وہ بے چین ہو گیا۔ اگر اُس کے پر ہوتے تو وہ اُڑ کے اپنے ماں باپ اور بہن کے پاس پہنچ جاتا۔ اُس نے بقیہ عبارت پڑھنا شروع کی۔ دیوان چند نے لکھا تھا۔

''اب سے اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے۔ تمہارے ماں باپ نے تمہاری ننھی بہن سورن لتا کی پہلی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی۔ مجھے بھی اس تقریب میں مدعو کیا گیا تھا۔ میں تمہارے والد کی فرم میں اکاؤنٹ اسسٹنٹ تھا۔ میرے پاس فرم کی کافی نقد رقم رہتی تھی۔ اس وقت مجھے فرم میں کام کرتے ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ میرا نام دیوان چند نہیں بلکہ ہریش ورما تھا۔ دیوان چند تو مجھے حالات نے بنا دیا ہے۔ خیر...... تو میں اپنی بیوی کیرتی کے ساتھ سورن لتا کی سالگرہ میں گیا۔ وہاں جگل پرشاد اور اس کی بیوی سے ہم دونوں کی ملاقات ہوئی۔ تمہاری ماں جی بڑی نرم دل، مہربان اور شفیق خاتون ہیں۔ لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تمہارے پتا جی ایک وحشی درندے ہیں۔ وہ شخص انسان کی کھال میں ایک بھیڑیا ہے۔ میری اس صاف گوئی پر مجھے معاف کر دینا وجے......! میں نے تمہارے والد کو کیوں بھیڑیا کہا، تمہیں تمام بات جان کر معلوم ہو جائے گا۔ میری بیوی کیرتی معمولی پڑھی لکھی اور بہت سادہ مزاج تھی، لیکن تھی بے حد حسین۔ ہماری شادی کو صرف ڈیڑھ ماہ ہی گزرا تھا۔ تقریب میں ہم دونوں میاں بیوی کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ اس وقت جگل پرشاد مجھے بہت اچھا لگا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ انتہائی عیاش آدمی ہے۔ پھر بھی مجھے اُس کی عیاشی سے کوئی غرض نہ تھی۔ مجھے اپنے کام سے مطلب تھا، جس کی تنخواہ ملتی تھی۔ ایک ہفتے کے بعد مجھے کمپنی کے منیجر نے بلایا اور کہا کہ تمہیں انبالہ جا کر کمپنی کی ایک بڑی رقم وصول کر کے لانی ہے۔ شادی کے بعد اپنی بیوی سے الگ ہونے کا یہ پہلا موقع تھا، مگر ایک ہی رات کی بات تھی۔ میں نے اپنی آیا سے کہہ دیا کہ وہ صرف ایک رات کے لئے میری بیوی کے پاس رُک جائے۔ میں انبالہ پہنچا اور جس کمپنی سے رقم لینی تھی اس سے رابطہ کیا، لیکن وہاں سے ادائیگی نہ ہوئی۔ منیجر ٹال مٹول سے کام لیتا رہا تو میں نے وہاں رُکنے کے بجائے واپس دہلی آنے کا فیصلہ کیا اور ہفتے کو دہلی پہنچ گیا۔''

جو واقعات دیوان چند نے بیان کئے تھے، بہت دلچسپ تھے۔ وجے پوری یکسوئی اور توجہ سے انہیں پڑھتا رہا۔

''میں اپنی دانست میں جلدی دہلی لوٹ آیا تھا، مگر یہ میری غلط فہمی تھی۔ مجھے دیر ہو چکی تھی۔ اس عرصے میں میری دنیا کو لوٹ لیا گیا تھا۔ مجھے اپنی بیوی زندہ حالت میں نہیں ملی۔ اُس کی لاش دیکھ کر میں دیوانہ ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں پر سوجن تھی اور چہرے پر جگہ جگہ داغ تھے۔ میں بلک بلک کر رونے لگا۔ آیا الگ دھاڑیں مار رہی تھی۔ آیا ہی نے مجھے بتایا کہ میری کمپنی کا چپراسی گزشتہ رات آیا اور میری بیوی کو ساتھ لے گیا۔ کیوں؟ آیا کو یہ معلوم نہ تھا۔ صبح میری بیوی واپس آئی تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ آیا نے وجہ پوچھی تو اُس نے نہ بتائی اور مسلسل روتی رہی۔ اس کے بعد وہ سوئی تو پھر کبھی نہ اُٹھ سکی۔ وہ مر چکی تھی۔ میں اُس چپراسی سے ملنے جانے والا تھا کہ میری نظر اُس خط پر پڑ گئی جو کیرتی کے سرہانے رکھا تھا۔ میں نے خط کھولا۔ لکھا تھا۔

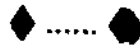
میرے ناتھ!

بہت چاہا کہ صرف ایک بار آپ کے درشن کر لوں اور وہ ساری باتیں آپ کو بتا دوں جو کل رات مجھ پر بیتی ہیں، لیکن پھر سوچا کہ اب مجھے اپنا منہ آپ کو دکھانے کا حق نہیں۔ میں بالکل بے قصور ہوں، مگر مجھ پر کلنک کا ٹیکا تو لگ گیا نا!

کل رات آٹھ بجے میرے پاس کمپنی کا چپراسی آیا۔ اس وقت میں کچن میں تھی۔ چپراسی نے مجھے بتایا کہ کار کے ذریعے اسٹیشن جاتے ہوئے آپ کی گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا تھا۔ آپ زخمی حالت میں اس وقت جگل پرشاد کی کوٹھی پر ہیں، ہوش آ چکا ہے اور آپ نے مجھے بلایا ہے۔ میں فوری طور پر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ سے ملنے کے لئے کوٹھی پہنچ گئی۔ وہاں آپ نہیں تھے بلکہ جگل پرشاد شراب کے نشے میں دھت موجود تھا۔ میں لوٹنے لگی تو اُس وحشی درندے نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ میں دنیا اور آپ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ اس سے پہلے میں نے جگل پرشاد کے آگے ہاتھ جوڑے، اُس کے پاؤں پکڑے، اُس سے رحم کی بھیک مانگی لیکن اُسے رحم نہ آیا۔ میں نے پہلے تو فوراً ہی خودکشی کرنی چاہی، مگر پھر آپ کو حقیقت بتانے کے لئے رُک گئی۔ بعد میں میری ہمت نہ ہوئی کہ آپ کا سامنا کر سکوں لہٰذا میں دنیا سے جا رہی ہوں۔ میں

نے زہر کھا لیا ہے۔ مجھے معاف کر دیجئے گا۔ آپ کے قدموں کی داسی کیرتی۔''

پھر حروف دُھندلا گئے اور وجے فوری طور پر آگے وہ خط نہ پڑھ سکا۔ اُس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ اُسے یہ سوچ کر خود سے گھن آ رہی تھی کہ وہ اسی جگل پرشاد کی اولاد ہے جس کا ''سیاہ کارنامہ'' اُس نے ابھی پڑھا تھا۔ ایسے شخص کو اس دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں، خواہ وہ میرا باپ ہی کیوں نہ ہو۔ وجے نے سوچا۔ اُس کے چہرے پر شدید تناؤ تھا۔



دیوان چند کا لکھا ہوا خط پڑھ کر دجے کے اندر سویا ہوا وہ سرکش نوجوان بیدار ہونے لگا جسے اُس نے تھپکیاں دے کر سلا دیا تھا۔ بڑی مشکل سے اُس نے خود پر قابو پایا اور جیب سے رومال نکال کر آنسو پونچھ لئے۔ اسی وقت اُس کی نگاہ دیوار پر لگی ہوئی تصویر کی طرف اُٹھ گئی۔ وہ تصویر کے قریب پہنچا اور ہاتھ میں موجود رومال سے تصویر کا شیشہ صاف کیا۔ اُسے اپنے باپ جگل پرشاد سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ کچھ دیر رُک کر اُس نے دیوان چند (سریش ورما) کا خط دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ خط میں لکھا تھا۔

"بیٹے دجے! تم سمجھ سکتے ہو کہ اپنی بیوی کیرتی کا خط پڑھ کر مجھ پر کیا گزری ہو گی! میں جیسے پاگل ہو گیا۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں نے اس خط کو مٹھی میں بھینچ لیا اور پھر اسے جیب میں رکھ کر سیدھا جگل پرشاد کے پاس پہنچا۔ اُس کے گھر میں داخل ہوتے ہی چیخ اُٹھا، کہاں ہے وہ نیچ جگل پرشاد......؟ میں اُس کا خون پی جاؤں گا! مگر سامنے بڑے کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ میرے سوال کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ میں دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں ایک کرسی پر جگل پرشاد بیٹھا بڑے اطمینان سے شراب نوشی کر رہا تھا۔ اُس کے قریب ہی دو افراد کھڑے تھے۔ شاید وہ اُس کے پالتو غنڈے تھے۔ میں نے کسی کی کوئی پرواہ نہیں کی اور جگل پرشاد کے سامنے کھڑے ہو کر چیخا۔ کمینے! میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ پھر میں نے لپک کر جگل پرشاد کی گردن دبوچنی چاہی۔ اسی وقت دونوں غنڈوں میں سے ایک نے میرے منہ پر زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ میں چکر کھا کر فرش پر گر پڑا۔ اس کے بعد دونوں غنڈوں نے مل کر مجھے اٹھایا اور میرے ہاتھ سختی سے پکڑ لئے۔ میں ان کی گرفت سے آزاد ہونے کے لئے تڑپنے لگا۔

جگل پرشاد بے فکری سے مے نوشی کرتا رہا۔ اُس نے جام خالی کیا اور کھڑے ہو کر بولا۔ "ہمیں بے حد افسوس ہے کہ تمہاری بیوی نے خودکشی کر لی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو تم

اس قدر غصے کی حالت میں یہاں نہ آتے۔ اُس نے اپنا ارادہ ظاہر کر دیا تھا کہ خودکشی کر لے گی۔ ہم نے اُسے بہت سمجھایا مگر وہ نہ سمجھی۔ وہ اگر حالات سے سمجھوتہ کر لیتی تو نہ اس کی جان جاتی اور نہ وہ اس دولت سے محروم ہوتی جو ہم اُسے دینے والے تھے۔ ہم اُسے مالا مال کر دیتے۔ اسی کے ساتھ تمہیں بھی ترقی دے کر ہم اپنی فرم کا اکاؤنٹس آفیسر بنا دیتے۔"

"نیچ......! پاپی!" میں ان دونوں غنڈوں کی گرفت میں مچلتے ہوئے چیخنے لگا۔

اسی لمحے دوسرے غنڈے نے میری کنپٹی پر مُکا جڑ دیا۔ مجھے چکر آ گئے اور میں دوبارہ نیچے گر پڑا۔ یہ ضرب پہلے سے زیادہ شدید تھی۔ پھر انہوں نے مجھ پر مکوں کی بارش کر دی اور میں تڑپنے لگا۔ میرے ہونٹوں سے خون بہنے لگا۔ مار پیٹ کے دوران ہی میری جیب سے کیرتی کا وہ آخری خط بھی نکل کر فرش پر گر گیا۔ ایک غنڈے نے جھپٹ کر اسے اٹھا لیا اور جگل پرشاد کی طرف بڑھا دیا۔

دونوں غنڈوں نے مجھے فرش سے اٹھایا تو مجھے چکر آنے لگے۔

جگل پرشاد نے خط کھولتے ہوئے کہا۔ "جب ہم بولتے ہیں تو اپنے سامنے کسی کو بولنے کی اجازت نہیں دیتے۔ تم اگر نہ بولتے نہ پٹتے۔"

پھر اُس نے خط پڑھنا شروع کیا اور دھیرے سے مسکرا دیا۔ اُس کا چہرہ شیطان کا چہرہ معلوم ہو رہا تھا۔ خط پڑھ کر جگل پرشاد نے پُرزے پُرزے کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل بھی گویا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ یہ خط جگل پرشاد کے خلاف ایک ناقابل تردید ثبوت تھا جو ضائع کر دیا گیا تھا۔ مجھے اپنی حماقت پر غصہ آیا۔ وہ خط مجھے وہاں لے کر نہیں آنا چاہئے تھا۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

جگل پرشاد نے گھنٹی بجائی۔ ایک نوکر اندر آیا تو اُس نے خط کے ٹکڑے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "انہیں جلتے ہوئے چولہے میں ڈال دو۔"

نوکر چلا گیا تو جگل پرشاد نے اپنے لئے جام میں شراب اُنڈیلی۔ میری نظریں اُسی پر جمی ہوئی تھیں۔

"ہمیں فون کے ذریعے انبالہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ تم کون سی گاڑی سے آ رہے ہو۔" جگل پرشاد نے مجھے مخاطب کیا۔ "ہم نے اسی لئے تمہارے گھر کے پاس اپنا ایک

آدمی کھڑا کر دیا تھا۔ ہم دیکھنا چاہتے تھے کہ گزشتہ رات کے واقعے کا تم پر کیا ردِعمل ہوتا ہے......! آج کل لوگ حالات سے سمجھوتہ کر کے فائدہ اٹھانے ہی میں اپنی بھلائی سمجھتے ہیں، لیکن کچھ لوگ تمہاری طرح بے وقوف بھی ہوتے ہیں۔ آیا کے رونے دھونے سے ہمارے آدمی کو معلوم ہو گیا کہ اُس احمق لڑکی، یعنی تمہاری بیوی نے خودکشی کر لی ہے۔ اس نے ہمیں خبر دی تو ہم اس طرح تمہارے استقبال کے لئے مجبور ہو گئے۔"

یکایک دیوار گیر کلاک نے آٹھ بجائے تو جگل پرشاد اس کمرے میں چلا گیا جہاں ٹیلی فون رکھا تھا۔ وہ کسی کو فون کرنے لگا اور میں اس کمرے میں جا کے اُسے ہلاک کرنے کا منصوبہ بنانے لگا۔ فون پر اُس نے کس سے اور کیا بات کی تھی، یہ مجھے تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا جب وہاں ایک پولیس انسپکٹر اور کچھ سپاہی آ گئے۔ میرا خیالی منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ اس سے قبل جگل پرشاد تجوری سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر میز پر رکھ چکا تھا۔

"انسپکٹر!" جگل پرشاد میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ شخص میری فرم میں اسسٹنٹ کیشئر ہے۔ فرم کا دفتر پانچ بجے بند ہو جاتا ہے۔ مگر یہ سات بجے میرے دفتر گیا تو چوکیدار نے سمجھا کہ......"

جگل پرشاد کی بات سن کر میں چونک اُٹھا اور چلایا۔ "انسپکٹر! یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے آج اس کی کمپنی کی شکل بھی نہیں دیکھی ہے۔ ضرور یہ میرے خلاف کسی سازش کا جال بُن رہا ہے اور اس میں مجھے پھنسانا چاہتا ہے۔ میں اسے جان سے مار دوں گا۔" اس بار میں نے خود کو چھڑانے کے لئے پوری طاقت لگا دی۔ میں شاید ان دونوں غنڈوں کی گرفت سے آزاد بھی ہو جاتا جو مجھے پکڑے ہوئے تھے اگر پولیس والے درمیان میں نہ آتے۔

"آپ سب لوگ تھانے چلیں۔ ہم وہیں سب کے بیانات لیں گے۔" انسپکٹر نے گویا حکم جاری کر دیا۔

ہم سب تھانے پہنچے۔ وجے بیٹا! جانتے ہو تھانے جا کر جگل پرشاد نے مجھ پر کیا الزام لگایا......؟ اُس نے کہا کہ میں سات بجے شام دفتر پہنچا تو چوکیدار سمجھا کہ میں اوور ٹائم لگانے آیا ہوں۔ لیکن جب میں دس منٹ بعد واپس جانے لگا تو اُسے مجھ پر شک ہو

گیا۔ جگل پرشاد کے مطابق شک کی بناء پر مجھے چوکیدار نے روکنا چاہا تو میں بھاگنے لگا۔ پھر چوکیدار نے دو افراد کی مدد سے مجھے پکڑ لیا۔ اُس نے میری تلاشی لی تو میرے پاس سے بیس ہزار روپے برآمد ہوئے۔ اس کے بعد وہ لوگ مجھے جگل پرشاد کے پاس اس کی کوٹھی پر لے آئے۔

غرض وہ ایک سوچی سمجھی سازش تھی جو مجھے پھنسانے کے لئے تیار کی گئی تھی۔ پھر جگل پرشاد نے اسی پر اکتفانہ کیا بلکہ انسپکٹر سے کہا۔ "اس شخص نے کسی بات پر اپنی بیوی کو زہر دے دیا ہے اور اب یہ کمپنی کے روپے چرا کر بھاگنے والا تھا کہ پکڑا گیا۔"

اتنا بڑا الزام کہ میں اپنی بیوی کا قاتل تھا اور میں نے کمپنی کے روپے چرائے تھے، مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے لپک کر جگل پرشاد کی گردن پکڑ لی اور پوری قوت سے دبانے لگا۔ جگل پرشاد کی آنکھیں باہر آنے لگیں۔ کچھ سپاہیوں نے کھینچ کر مجھے الگ کیا۔ کسی سپاہی نے میرے سر پر زور سے ڈنڈا مارا۔ میں چکرا کر گر پڑا۔ انہوں نے مجھے حوالات میں بند کر دیا۔ میں چیختا چلاتا رہا مگر کسی نے میری بات نہ سنی۔

پولیس نے کیرتی کی لاش کو اپنے قبضے میں لے کر پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کر دیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں اس کی موت کا سبب زہر خورانی لکھا تھا۔ کیرتی کی آخری رسوم میں شرکت کی اجازت تو مجھے مل گئی مگر اس طرح کہ مجھے ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔

کیرتی کی جلتی ہوئی چتا کے سامنے میں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک جگل پرشاد سے بدلہ نہ لے لوں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔

پھر مقدمہ چلا۔ میرے گھر والوں نے ہر طرح سے میری مدد کی، مگر میری ضمانت نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ جگل پرشاد نے میری جانب سے قاتلانہ حملے کا خطرہ ظاہر کرتے ہوئے میری ضمانت میں رُکاوٹ ڈال دی تھی۔ کیرتی کے گھر والوں نے البتہ اس مقدمے سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ اس کے برعکس انہوں نے کیرتی کی موت کا ذمہ دار مجھ ہی کو ٹھہرایا۔

مقدمے میں ہر بات میرے خلاف گئی۔ میں انبالہ میں جس شخص کے ساتھ ٹھہرا تھا، اس نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ عدالت میں، میں نے وہی سب کچھ اپنی صفائی کی خاطر کہا تھا جو گزرا تھا۔ لیکن اسے ثابت بھی کرنا میری ذمہ داری تھی۔ یہی نہیں،

میری آپا بھی میری بے گناہی میں کچھ نہ کہہ سکی کیونکہ اُس کا شوہر بھی جنگل پرشاد کی کمپنی میں معمولی سا نوکر تھا آپا کو اپنے شوہر کی نوکری عزیز تھی۔

ان تمام باتوں کے باوجود بھگوان نے میری سن لی۔ مجھ پر اپنی بیوی کے قتل کا الزام ثابت نہ ہو سکا۔ کمپنی کے دفتر سے روپے چرانے اور جنگل پرشاد پر قاتلانہ حملہ کرنے کی کوشش میں البتہ مجھے سات سال کی سزا ہو گئی۔

اس وقت میں جوان تھا۔ میرا خون بھی گرم تھا۔ بدلے کی آگ مجھے جھلسائے دے رہی تھی۔ آخر ایک رات میں جیل سے نکل بھاگا۔ اب مجھے اپنی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ میں نے ایک چھرا لیا اور سیدھا جنگل پرشاد کے گھر پہنچا۔ میں اُس کا قصہ ختم کر دینا چاہتا تھا۔ وہ شراب کے نشے میں دھت سو رہا تھا۔ میں اُسے ختم کرنے والا تھا کہ میری نظر اُس کے ساتھ سوتے دو بچوں پر پڑی۔ ان میں سے ایک لڑکا تھا، دوسری لڑکی۔ دونوں بے حد پیارے تھے۔ لڑکی دو سال سے کچھ کم لگتی تھی اور لڑکے کی عمر ساڑھے تین سال سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔

میں نے سوچا کہ اگر ان دونوں بچوں کو اغوا کر لوں تو جنگل پرشاد ساری زندگی تڑپتا رہے گا۔ نہ جانے اس نے کتنے گھر برباد کئے ہیں اور ابھی مزید کتنے ہی گھر برباد کرے گا! ممکن ہے وہ اپنے بچوں سے بچھڑ جانے کے بعد پھر کسی کو تباہ نہ کرے۔ میرا خیال تھا کہ لڑکے کو مجرم بناؤں گا اور جنگل پرشاد کی بیٹی کو بازاری عورت! میرے انتقام کی آگ اسی طرح بجھ سکتی تھی۔

یہ فیصلہ بھی میں نے کیا کہ جنگل پرشاد کو حقیقت سے آگاہ کر کے اسے تڑپتے دیکھوں گا تاکہ مجھے سکون مل سکے۔ ایسا سوچتے ہوئے مجھے جنگل پرشاد کی بیوی پر بھی رحم نہ آیا کیونکہ اُس نے مقدمے کی سماعت کے دوران ایک بار بھی اپنے شوہر کے خلاف لب کشائی نہیں کی تھی۔ اسی بناء پر میں نے اُس کی ممتا کا گلا گھونٹنے کا ارادہ کر لیا۔ میں جنگل پرشاد کو ہر قیمت پر تڑپتے، سسکتے اور روتے دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے دونوں بچوں کو ایک کپڑے میں لپیٹا اور وہاں سے نکل بھاگا۔ میں سیدھا دہلی سے بنارس پہنچا۔ ارادہ یہ تھا کہ بنارس میں ''اس بازار'' میں کسی سے بات کر کے لڑکی کو اس کے حوالے کر دوں گا۔ مگر نہ جانے کیوں ایسا کرتے ہوئے میری روح لرزنے لگی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ

ابھی میرے اندر کا انسان مرا نہیں تھا، زندہ تھا۔ انتقام کی آگ نے سب کچھ نہیں جلایا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں! جھگڑا میرا اور جنگل پرشاد کا تھا اور نشانہ ایک معصوم بچی بننے والی تھی۔ اس بچی کا تو کوئی قصور بھی نہیں تھا۔

مجھے سوچنے کے لئے وقت چاہئے تھا۔ میں نے بنارس کے علاقے بنگالی ٹیلہ کی ایک گلی میں کرائے پر ایک کوٹھڑی حاصل کر لی۔ پھر دو روز بعد ہی اخبارات میں تمہاری اور سورن لتا کی تصویریں چھپیں۔ تم دونوں کے بارے میں اطلاع دینے والے کے لئے جنگل پرشاد نے پچاس ہزار روپے کے انعام کا اعلان کیا تھا۔ اب مجھے جلد ہی سورن لتا کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا تھا۔

مسئلہ صرف یہ تھا کہ میرا ضمیر اس بچی کو بازار کی زینت بنانے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں خود کو کوسنے لگا کہ اسے کیوں اغوا کیا۔

تیسرے روز صبح میری آنکھ کھلی تو پتہ چلا کہ میری کوٹھڑی کو بہت سے لوگوں نے گھیرے میں لے لیا ہے۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو میرے اندیشے کی تصدیق ہو گئی۔ باہر پولیس موجود تھی۔ میں نے تمہیں اور سورن لتا کو لے کر وہاں سے فرار ہو جانے کا قصد کر لیا۔ اس کے لئے میں نے تم دونوں کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور خاموشی سے اپنے مکان کے پیچھے والی چھت پر کود گیا۔ وہاں سے میں ایک ایک کر کے کئی مکانوں کی چھتیں پار کر گیا۔ کیونکہ لوگ ابھی بیدار نہیں ہوئے تھے اس لئے کسی کو پتہ نہیں چلا۔ آخری چھت پار کر کے میں اندھیری گلی میں اُتر گیا۔

اب میرا رُخ گنگا جی (دریائے گنگا) کی طرف تھا، لیکن پولیس میری تمام تر احتیاط کے باوجود میرے پیچھے لگ چکی تھی۔ ایک اور گلی عبور کر کے میں دریائے گنگا کے گھاٹ کی سیڑھیوں پر پہنچ گیا۔ اس وقت پو پھٹ رہی تھی۔ اندھیرا چھٹ رہا تھا۔ گھاٹ پر یاتری (زائر) اشنان (غسل) کے لئے آ رہے تھے۔ گلی میں واپس جانا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے میں سیڑھیوں پر اُترنے لگا۔ گھاٹ سے گھاٹ گزرتا ہوا میں وشاشو میگھ گھاٹ پہنچ گیا۔

اس وقت تک خاصا اجالا ہو چکا تھا۔ بچوں کو اٹھائے اٹھائے میرے ہاتھ تھک گئے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر کا جائزہ لے کر بچوں کو نیچے اتارا اور ان کے منہ میں ٹھنسے ہوئے کپڑے نکالے۔ اس کے ساتھ ہی تم دونوں رونے لگے۔

میں نے تم دونوں کے ہاتھ پکڑے اور بھیڑ کی آڑ لے کر نکل بھاگنا چاہا، لیکن اس عرصے میں بھیڑ بڑھ چکی تھی۔ ایک موقع پر سورن لتا کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میرے کانوں میں پولیس کی سیٹی گونجی۔ میں نے جلدی سے تمہیں گود میں اٹھا لیا۔ میں سورن لتا کو بھی اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ بھیڑ کے ایک زوردار دھکے کے باعث وہ مجھ سے دُور ہو گئی۔

تم نے شاید بنارس کا نام سنا ہو۔ اگر تم نے اس شہر کی صبح دیکھی ہوتی تو اندازہ ہوتا کہ وہاں کتنی بھیڑ ہوتی ہے!

سورن لتا مجھ سے بچھڑ گئی تو میں نے اُس کی فکر چھوڑ دی اور تمہیں گود میں لے کر بھاگنے لگا۔ بھیڑ کے باعث میں پولیس کو جُل دینے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے سوچا، جگل پرشاد کی بیٹی بھلے اُسے واپس مل جائے مگر اس کے بیٹے کو ہاتھ سے نہیں نکلنے دوں گا۔

وجے بیٹا! میں تمہیں بنارس سے لے کر بمبئی چلا آیا۔ میں ایک مفرور قیدی تھا۔ میں نے جیل توڑی تھی۔ پولیس کو میری تلاش تھی۔ اب میرے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ نام بدل کر اور چھپ کر رہوں۔ میں نے اسی لئے اپنا نام سریش ورما سے بدل کر دیوان چند رکھ لیا۔ اس کے بعد میں چندانی سیٹھ کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ کچھ برسوں تک میں چھپ کر رہا اور چھپ کے ہی کام کرتا رہا۔ اس کے لئے میں بار بار بھیس بدلتا تھا۔

پھر تو بڑا ہونے لگا اور آخر بارہ برس کا ہو گیا۔ اس وقت تک میرے دل سے جگل پرشاد اور پولیس کا خوف بالکل نکل چکا تھا۔ اب میں نے بمبئی شہر میں چھوٹا سا ایک گھر خرید لیا۔ اس طرح میرے ساتھ رہتے اور کام کرتے کرتے تو بھی ایک قانون شکن، ایک مجرم بن گیا۔

بیٹا وجے! تو جب اکیلا خطروں سے کھیلتا تو میرا ضمیر مجھے بڑی لعنت ملامت کرتا تھا۔ میں نے تجھے جرم کی راہ پر ڈال کر اچھا نہیں کیا، مجھے اس کا پوری طرح احساس تھا۔ یہ احساس ہی تو ہے جو آدمی کو انسان بناتا ہے!

میں سوچتا تھا کہ میں نے تیرے باپ کا بدلہ تجھ سے کیوں لیا؟ وقت اور حالات ہی ہر آدمی کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کوئی پیدائشی طور پر برا نہیں ہوتا بلکہ اُسے

جیسا ماحول ملتا ہے وہ ویسا بن جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال تم ہو وجے بیٹے! جو کچھ تیرے باپ نے میرے ساتھ کیا، اس میں تیرا کیا قصور تھا؟ بیٹا! جب تو مجھے اپنا باپ جان کر مجھ پر اپنی محبت نچھاور کرتا ہے تو میں خود سے نفرت محسوس کرنے لگتا ہوں۔ میرا دل بار بار کہتا ہے کہ میں تجھے تیری اصلیت بتا دوں تاکہ تو اس خطرناک گروہ کو چھوڑ کر اپنے ماں باپ، اپنی بہن کے پاس چلا جائے، لیکن ہر بار میری آنکھوں میں اپنی بیوی کیرتی کا چہرہ گھومنے لگتا ہے۔ میں نے اس کی چتا کے سامنے جو عہد کیا تھا، اسے یاد کر کے میرا دل سخت ہو جاتا۔ میں بھگوان کا مذاق اسی لئے تو اُڑاتا ہوں کہ جس بھگوان کے آگے میری بیوی ہر وقت اپنا ماتھا ٹیکتی تھی، وہ اگر چاہتا تو حالات کبھی منفی رُخ اختیار نہ کرتے...... بھگوان چاہتا تو اُس معصوم اور بے قصور کو ایک پاپی اور وحشی درندے سے بچا سکتا تھا۔ بھگوان نے میری بیوی کو دن رات کی پرارتھنا (عبادت) کا یہ انعام دیا کہ وہ بے آبرو، بے عزت ہو کر اس دنیا سے چلی گئی...... یہی سبب ہے کہ بھگوان پر سے میرا اعتبار ختم ہو چکا تھا۔ سچ بات یہ ہے کہ مذاق اُڑا کر مجھے دلی سکون ملتا ہے۔

وجے بیٹا! میں نے اس خط کے ذریعے تجھ پر اپنا سارا بھید کھول دیا ہے۔ لیکن میں تجھے یہ خط...... یہ اپنی جیون کہانی پڑھنے کو کب دوں گا؟ دوں گا بھی یا نہیں؟ مجھے بالکل نہیں معلوم۔ اصل کہانی جاننے کے بعد تجھے مجھ سے یقیناً نفرت ہو جائے گی۔ نہ جانے میں نے تجھ سے تیرے باپ کا بدلہ کیوں لیا......؟ تجھے تیری ماں اور بہن سے کیوں دور کیا......؟ سوچتا ہوں، مرنے سے پہلے تجھے سب کچھ بتا دوں تو بہتر ہے ورنہ اگلے جنم میں بھگوان نہ جانے مجھے کیا سزا دے...... دیکھو حالات ہمیں کہاں لے جاتے ہیں۔

تمہارا...... دیوان چند (سریش ورما)''

پورا خط پڑھنے کے بعد وجے گم صم ہو گیا۔ اپنے باپ کے ساتھ ساتھ اُسے دیوان چند سے بھی نفرت ہونے لگی تھی۔

وہ سوچنے لگا، کیسے ہوتے ہیں یہ لوگ جو اپنے انتقام کی آگ میں پھول جیسے بچوں کو بھی جھونک دیتے ہیں اور انہیں رحم نہیں آتا......! دیوان چند نے میرے باپ کا بدلہ مجھ سے کیوں لیا......؟ اگر سورن لتا اُس بازار کی زینت بن جاتی تو کیا ہوتا؟

پھر وجے نے خود کو دیوان چند کی جگہ اور انشو کو کیرتی کی جگہ رکھ کر سوچا کہ اگر اُس

کے ساتھ ایسا ہوتا تو کیا ہوتا؟ یہ سوچنے کے باوجود وجے کے دل میں دیوان چند کے لئے کوئی ہمدردی پیدا نہ ہو سکی۔ وجے کے نزدیک دیوان چند کو انتقام کی آگ نے اندھا کر دیا تھا۔

اُس کا دل بوجھل ہو گیا۔ ماں اور بہن سے ملنے کی خوشی پر باپ کے گناہوں کا بوجھ حاوی ہو گیا۔ کیا میں اُس شخص کا سامنا کر سکوں گا جو میرا باپ ہے اور مجھے اس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے؟ وجے نے سوچا۔ شاید میں اپنے باپ کو کبھی معاف نہ کر سکوں، کبھی نہیں! وہی تو ساری بربادی کی جڑ ہیں۔ میں ان کی صورت بھی نہیں دیکھوں گا۔ وجے اپنے باپ سے نالاں تھا، مگر ماں اُس کے لئے قابلِ تعظیم تھی۔ اسی سبب ماں کی ممتا کا بھوکا دل ماں سے ملنے کے لئے تڑپ اٹھا۔ وہ بہن جسے اُس نے کبھی بچپن میں دیکھا تھا، اب اس بہن کا چہرہ بھی یاد نہ تھا۔

ماں اور بہن کی محبت میں ایسی کشش تھی کہ وہ اسی روز پہلی ٹرین سے دہلی جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

بمبئی چھوڑنے سے پہلے وجے نے انشو سے ملنا چاہا، مگر یہ ممکن نہ تھا۔ انشو نے اُسے فون کرنے سے منع کر رکھا تھا۔ اب اُس کے ممی ڈیڈی کو سب کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں انشو کی کڑی نگرانی کی جا رہی ہو گی۔

حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے وجے نے اپنی دانست میں ایک راہ نکال ہی لی۔ وہ انشو کی قریبی سہیلی مینا کے گھر گیا۔ برآمدے میں کھڑے ہو کر اُس نے کال بیل بجائی اور کسی کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

دروازہ کھولنے والی مینا ہی تھی۔ وجے کے ہاتھ میں سوٹ کیس دیکھ کر وہ حیرت سے کہنے لگی۔

"وجے بابو! آپ کہاں جا رہے ہیں؟" پھر اُس نے ایک طرف ہٹتے ہوئے وجے کو راستہ دیا۔ "پہلے آپ اندر تو آیئے۔"

"نہیں مینا!" وجے نے سنجیدگی اختیار کی۔ "میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے دہلی جانے کے لئے ٹرین پکڑنی ہے۔"

مینا نے وجے کے سنجیدہ چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تم انشو سے کہہ دینا کہ میں دہلی جا رہا ہوں اور جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔" وجے نے مینا سے کہا۔

"ارے ایسا کون سا ضروری کام پڑ گیا ہے کہ انشو سے ملے بغیر ہی جا رہے ہیں؟" مینا کہنے لگی۔ "آپ اُس سے مل کر بھی تو جا سکتے ہیں۔ کل چلے جایئے گا۔"

"شاید انشو سے کل بھی نہ مل سکوں۔" وجے بوجھل سی آواز میں بولا۔ "ہماری باتیں اُس کے ممی ڈیڈی کو پتہ چل گئی ہیں۔ اب وہ انشو کی نگرانی کر رہے ہیں۔"

یہ سن کر مینا نے ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا۔ "تو گویا جس بات کا ڈر تھا، وہ ہو گئی۔"

"تم انشو کو یہ بھی بتا دینا کہ میرے پتا دیوان چند نہیں تھے بلکہ میرے اصل پتا تو دہلی میں ہیں۔ ان کا پتہ چل گیا ہے۔ میں اپنی ماں اور چھوٹی بہن سے ملوں گا۔ وہ سب دہلی میں ہیں۔ میں اسی لئے دہلی جا رہا ہوں۔"

"یہ تو بہت ہی خوشی کی بات ہے۔" مینا نے مسرت کا اظہار کیا۔

"ہے تو۔" وجے بولا۔

"لیکن معاف کیجئے گا...... اتنی بڑی حقیقت جاننے کے باوجود آپ خوش نظر نہیں آ رہے، اس کی کیا وجہ ہے؟" مینا نے سوال کیا۔

"ہے کوئی بات۔" مینا کے سوال کو وجے ٹال گیا۔ وہ مینا کو کیسے بتاتا کہ ایسے باپ کا بیٹا ہے جس کے دامن پر نہ جانے کتنی بے بس و مجبور عورتوں کے خون کے چھینٹے ہیں۔ ماں اور بہن سے ملنے کی خوشی باپ کے کردار کے سامنے کچھ اس طرح دب گئی تھی کہ وہ کھل کر مسکرا بھی نہ سکا تھا۔ اگر ماں اور بہن سے ملنے کی آرزو نہ ہوتی تو وہ اپنے باپ کی شکل بھی نہ دیکھتا۔

"اینی وے...... مبارک ہو۔" مینا نے کہا۔

"شکریہ!" وجے نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ "اچھا، بائے۔"

"بائے!" مینا بھی بولی اور وجے چلا گیا۔



وجے دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر اترا تو سیدھا ٹیلیفون بوتھ کی طرف بڑھا۔ بوتھ میں رکھی ٹیلیفون ڈائریکٹری میں اُس نے "شاردا پرشاد لمیٹڈ" کا نمبر ڈھونڈا اور اس کا

پتہ بھی نوٹ کر لیا۔ پھر اُس نے جگل پرشاد کا فون نمبر اور اُس کے گھر کا پتہ بھی تلاش کر لیا۔ یہ فون نمبر اور پتہ بھی اُس نے اپنی ڈائری میں لکھ لیا۔ اس کے بعد وہ فون بوتھ سے باہر آ گیا۔

اپنے باپ کے سیاہ اور گھناؤنے کرتوت کے باعث وجے کو ان کے پاس جاتے ہوئے شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وجے نے خود پر قابو پا لیا۔ ماں اور بہن سے ملنے کی خواہش، باپ سے نفرت پر غالب آ چکی تھی۔

نہ جانے میری ماں اور بہن کیسی ہوں گی؟ کس حال میں ہوں گی؟ وہ مجھے پہچان بھی سکیں گی یا نہیں؟ کیا ماں جی مجھے پہچان کر اپنا بیٹا تسلیم کر لیں گی؟ اُنہیں میری باتوں پر یقین آ جائے گا......؟ وہ اعتبار کر لیں گی کہ میں انہی کا بیٹا ہوں جسے اٹھارہ سال پہلے ان کے ملازم سریش ورما نے اغواء کر لیا تھا؟ وجے کے ذہن پر مختلف سوالوں نے جیسے یورش کر دی تھی۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ ماں جی کو بہرصورت مجھ پر اعتبار کرنا پڑے گا۔ آخر کو وہ میری ماں ہیں۔ ایک ماں اپنے لہو کی خوشبو کو خوب جانتی پہچانتی ہے۔ اسے اپنے بیٹے کو پہچاننے کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ویسے ان کو یقین دلانے کے لئے سریش ورما کا خط ہی کافی تھا جو وجے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔

کوٹھی کے مین گیٹ پر وہ رکشا سے اُترا، آگے بڑھا اور گیٹ کے قریب رُک گیا۔ اُس کا دل بے قابو ہونے لگا تھا۔ مین گیٹ کے ستون پرانے اور ٹوٹے پھوٹے تھے۔ لوہے کا صرف ایک ہی دروازہ تھا، وہ بھی ٹیڑھا ہو کر ایک طرف جھک گیا تھا۔ وجے نے ستون پر لکھا ہوا کوٹھی کا نمبر دیکھا۔ وہ کوٹھی جگل پرشاد ہی کی تھی۔ کوٹھی کا نمبر وجے کو زبانی یاد تھا۔ وہ صحیح پتے پر پہنچا تھا۔

اُس نے اندر جھانکا۔ دو منزلہ عمارت جیسے گزرے دنوں کی شان و شوکت کا حال رو رو کر بتا رہی تھی۔ برسوں سے اس عمارت پر سفیدی نہیں کی گئی تھی۔ جگہ جگہ سے پلاسٹر اُکھڑا ہوا تھا۔ بعض جگہوں پر کائی بھی جمی ہوئی تھی۔ اینٹوں کے جوڑوں میں گھاس اُگ آئی تھی۔ لان کے درخت بے حد گھنے ہو گئے تھے اور لان کی گھاس نہ جانے کب سے کاٹی نہیں گئی تھی۔ کیاریاں بے ترتیب تھیں۔

وجے نے سامنے نظر ڈالی تو پورٹیکو کے نیچے ایک جیپ دکھائی دی۔

دھڑکتے دل کے ساتھ وجے آگے بڑھا۔ راستہ بھی ٹوٹا پھوٹا تھا اور مرمت کے لئے گویا ترس رہا تھا۔ ابھی وہ چند ہی قدم بڑھا تھا کہ اُسے کوٹھی کے پہلو میں کچھ اندر کی طرف ایک بوڑھا کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ نل کے نیچے ایک بالٹی رکھی تھی۔ بوڑھا اس میں پانی بھر رہا تھا۔

بوڑھے نے وجے کو دیکھا تو وہ جلدی سے اُس کی طرف آیا۔ وجے نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔

''کیا جگل پرشاد جی کا مکان یہی ہے؟'' بوڑھا قریب آ گیا تو وجے نے اُس سے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' بوڑھے نے سرد آہ بھری۔ ''سورگ باشی جگل پرشاد جی کی کوٹھی یہی ہے، مگر اب اس مکان میں اُن کی دھرم پتنی شریمتی اوما دیوی جی رہتی ہیں۔'' بوڑھے نے تفصیل کے ساتھ وجے کے سوال کا جواب دیا۔

اپنے باپ کی موت کے بارے میں جان کر نہ چاہتے ہوئے بھی وجے کے دل کو ٹھیس سی پہنچی۔ شاید یہ ایک فطری ردِعمل تھا۔ اُس نے دل ہی دل میں اپنی ماں کا نام دہرایا، اوما دیوی۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ میں کتنا بدقسمت ہوں کہ اپنی ماں کا نام تک نہیں جانتا تھا۔

''میں جگل پرشاد جی کی دھرم پتنی سے ملنا چاہتا ہوں۔'' وجے نے بوڑھے سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''اس وقت وہ گھر پر نہیں ہیں، باہر گئی ہوئی ہیں، آنے ہی والی ہوں گی۔'' بوڑھے نے جواب میں بتایا، پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''اگر آپ کو ان سے ضروری ملنا ہے تو برآمدے میں کرسی رکھی ہے، آپ وہاں بیٹھ کے اُن کا انتظار کر لیں۔''

وجے چند لمحے خاموش رہا، پھر بولا۔ ''کوٹھی میں سورن لتا بھی تو ہو گی...... اُسے ہی بلا دو۔ میں اُس سے بھی ملنا چاہتا ہوں۔''

''سورن لتا؟'' بوڑھے نے اپنے ذہن پر زور ڈالا اور پھر اُس نے وجے کو بڑے غور سے دیکھا، اوپر سے نیچے تک! کچھ دیر توقف کے بعد بوڑھے نے وجے سے دریافت کیا۔ ''کہیں آپ بے بی کے بارے میں تو نہیں پوچھ رہے؟''

"بے بی......؟ کون بے بی؟" وجے کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

اسی وقت صدر دروازے سے ایک کار اندر داخل ہوئی اور بوڑھا جلدی سے بولا۔ "مالکن آ گئی ہیں۔"

پھر بوڑھا اپنی بالٹی کی طرف متوجہ ہو گیا جو پانی سے بھر چکی تھی۔ وجے سوٹ کیس ہاتھ میں لئے آگے بڑھ گیا، پورٹیکو کی طرف! کار اُس کے سامنے سے گزر کر دھول اُڑاتی ہوئی پورٹیکو میں جا کر رُک گئی۔ کار میں پیچھے والی سیٹ پر ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھ پر چشمہ اور بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ اس عورت کے حلیے سے وقار کا اظہار ہو رہا تھا۔ وجے نے بغور اُس کا جائزہ لیا۔

ڈرائیور نے کار کا دروازہ کھولا۔ وجے اس وقت تک کار کے قریب پہنچ چکا تھا۔

وہ باوقار خاتون کار سے اُتریں۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے انہوں نے پلٹ کر وجے کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں وجے کو ممتا کی جگہ سختی نظر آئی۔ اُن کے ماتھے پر بل تھے اور چہرے پر تناؤ۔ سفید ساڑھی میں وہ بیوہ سے زیادہ سنگ مرمر کا کوئی مجسمہ لگ رہی تھیں۔ وجے نے ان سے کچھ کہنا چاہا، مگر وہ بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے برآمدے کی طرف بڑھیں اور پھر کوٹھی کے اندر چلی گئیں۔ وجے حیران کھڑا انہیں دیکھتا رہ گیا۔

ڈرائیور کار میں سے سامان نکال رہا تھا۔ وجے اُس کے پاس جا کر بولا۔ "میں اوما دیوی سے ملنا چاہتا ہوں۔"

ہاتھوں میں پیکٹ اٹھاتے ہوئے ڈرائیور نے اُس کا سر سے پیر تک جائزہ لینے کے بعد کہا۔ "کیا کام ہے اُن سے؟"

"یہ میں اُنہی کو بتاؤں گا۔" وجے اپنی ماں کے چہرے کی سختی دیکھ چکا تھا اس لئے اُس نے ڈرائیور کو کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا۔

"جب تک تم وجہ نہیں بتاؤ گے، اس وقت تک ان سے نہیں مل سکتے۔" ڈرائیور بولا۔

"شٹ اَپ!" وجے اپنے غصے کو قابو میں نہ رکھ سکا۔

ڈرائیور اُس کے رعب میں آ گیا۔

"میں اُن سے خود ہی مل لوں گا۔" وجے یہ کہہ کر برآمدے کی سیڑھیوں کی طرف

بڑھ گیا۔

"ارے ٹھہرو......ٹھہرو!" ڈرائیور اُس کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ "ارے بھئی اس میں ناراض ہونے کی کون سی بات ہے......ٹھہرو، میں ابھی بیگم صاحبہ سے تمہارے لئے وقت لے کر آتا ہوں۔ دراصل میں تو تمہارے بھلے کے لئے ہی یہاں آنے کی وجہ پوچھ رہا تھا۔" ڈرائیور نے رازداری سے کہا۔ "کہیں تم اُن کے بیٹے ہونے کا دعویٰ لے کر تو یہاں نہیں آئے؟" ڈرائیور کی نظریں وجے کے چہرے پر تھیں۔

"اُن کے بیٹے ہونے کا دعویٰ؟" وجے نے حیرت سے کہا۔ "مگر تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟"

ڈرائیور نے اپنے خیال کی تصدیق پر اپنی ہوشیاری کی داد دیتے ہوئے قہقہہ لگانا چاہا، مگر آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ اس کی وجہ وجے کا اُسے گھورنا تھا۔

"پچھلے دو برسوں میں میم صاحب کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں یہاں آ چکی ہیں۔" ڈرائیور نے بڑے پراسرار انداز میں بتایا۔ "کچھ تو اپنی جان بچا کے یہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئے اور کچھ ابھی تک جعل سازی و فریب دہی کے الزام میں سزا بھگت رہے ہیں۔"

یہ سن کر وجے کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نظر آنے لگے۔ اس کا مطلب ڈرائیور کچھ اور ہی سمجھا۔

"بولو، ملو گے میم صاحب سے؟" ڈرائیور نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ضرور ملوں گا۔" وجے نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

ڈرائیور سامان لئے اندر چلا گیا۔ پھر جب وہ کچھ دیر کے بعد واپس آیا تو وجے کو اندر جانے کی اجازت مل چکی تھی۔

وجے نے تیزی کے ساتھ دھڑکتے دل سے برآمدے کی سیڑھیاں پار کیں۔ دروازے پر رُک کر اُس نے گہرے گہرے سانس لئے اور اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک بڑا کمرہ تھا۔ یہاں بہت پرانا قالین بچھا ہوا تھا جس کا رنگ اُڑ چکا تھا۔ اس کے کنارے اور گوشے بھی پھٹے ہوئے تھے۔ سیاہ لکڑی کا پرانا فرنیچر، پیتل کے بڑے بڑے گلدان، بڑی بڑی تصویریں! ان تصویروں کے رنگ بھی پھیکے پڑ چکے تھے۔ پھر بھی ہر چیز اپنے

عہد کی شان دکھا رہی تھی۔

اوما دیوی دروازے کی طرف پیٹھ کئے کچھ تن کر کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے سامنے ایک میز پر دو بچوں کی تصویریں ایک فریم میں جڑی ہوئی رکھی تھیں۔ وجے چپ چاپ اُن کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا واپس چلا جائے۔ مگر ان حالات میں اُسے بہرصورت صبر کرنا تھا۔

''ماں!'' کچھ دیر بعد وجے نے کہا۔ اُس کا لہجہ جذبات میں ڈوبا ہوا تھا۔

اوما دیوی ایک دم چونک اٹھیں، مگر انہوں نے پلٹ کر وجے کی طرف نہ دیکھا۔

''ماں!'' وجے نے پھر انہیں پکارا۔ ''میں تمہارا بیٹا ہوں وجے۔''

اوما دیوی پلٹیں۔ انہوں نے وجے کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ان کے چہرے سے شک وشبے کا اظہار ہو رہا تھا۔

''ماں! تم نے مجھے پہچانا نہیں؟'' وجے بولا۔

''پہچاننے کا کام ہم نے پولیس کو سونپ رکھا ہے۔'' اوما دیوی نے رُوکھے لہجے میں کہا۔

''ماں! جب پولیس تمہارے بچے کا پتہ نہ لگا سکی تو پھر اسے پہچانے گی کیسے؟'' وجے نے اوما دیوی کے چہرے کی طرف متوقع نظروں سے دیکھا۔

''یہ پولیس اچھی طرح جانتی ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے میری دولت کے لالچ میں جو بھی میری اولاد کا رُوپ دھار کر آیا تو اسے مجھ سے پہلے پولیس ہی نے جعل ساز ثابت کر دیا۔'' اوما دیوی کہنے لگیں۔

اُن کی بات سن کر وجے کو دھکا لگا۔ وہ جس ماں کی ممتا کو تلاش کرنے آیا تھا، بالکل اجنبیوں بلکہ دشمنوں کی طرح پیش آ رہی تھی۔ وجے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بولا۔

''کتنے ارمان لے کر میں یہاں آیا تھا۔ سوچا تھا، مجھے دیکھتے ہی میری ماں اپنے سینے سے لگا لے گی۔ ایک ماں کو اپنے بیٹے کی پہچان کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی...... خیر......'' وجے کے ہونٹوں پر ایک اُداس سی مسکراہٹ تیر گئی۔ اُس نے کہا۔

''اپنی ماں کو تو میں نے دیکھ لیا۔ تمہارے چرن چھونے کے بعد میں یہاں رُکوں گا بھی نہیں۔ مگر جانے سے پہلے میں ایک بار...... صرف ایک بار اپنی بہن کو دیکھ سکتا ہوں؟

میں جانتا ہوں ماں کہ وہ...... وہ بھی تمہاری طرح مجھے نہیں پہچانے گی۔''

''تمہاری بہن؟'' اوما دیوی چونکیں۔ ''یہ کوئی نیا ناٹک ہے کیا؟'' اُن کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

''ناٹک؟'' وجے کو ایسا لگا جیسے انہوں نے اُسے سینے سے لگانے کی بجائے منہ پر زوردار تھپڑ مار دیا ہو۔ ماں اگر تھپڑ ہی مار دیتی تو وہ برداشت کر لیتا لیکن اس پر یوں شک کرنا اور الزام لگانا اُسے اچھا نہیں لگا۔ اُس کی آنکھوں سے اب آنسو نکلنے ہی والے تھے۔ اُس نے آہستگی سے اپنا نچلا ہونٹ کاٹا اور اُداس لہجے میں بولا۔ ''ٹھیک ہے ماں، میں جا رہا ہوں۔ جا کر تمہیں ثبوت بھیج دوں گا، لیکن اس کے بعد تم مجھے تلاش مت کرنا۔'' وجے نے ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھ کر ماں کے چرن چھوئے اور پلٹ کر باہر کی طرف چل پڑا۔

''ٹھہرو!'' اوما دیوی نے تحکمانہ آواز میں کہا۔

وجے کے قدم جہاں تھے وہیں رُک گئے۔ اُس نے پلٹ کر ماں کی طرف دیکھا۔ ماں کے چہرے کے تناؤ میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

اوما دیوی چند قدم آگے بڑھ کر اُس کے قریب آئیں اور بولیں۔ ''تم اپنی بہن کو دیکھنا چاہتے ہو؟'' اُن کا لہجہ پُراسرار تھا۔

وجے نے بڑی امید کے ساتھ ماں کی طرف دیکھتے ہوئے اقرار میں اپنا سر ہلا دیا۔

''بے بی تو تمہارے ساتھ ہی اغواء ہوئی تھی۔ پھر وہ یہاں کیسے ہو سکتی ہے؟'' اوما دیوی نے اپنی دانست میں وجے کا جھوٹ پکڑ لیا۔ ''اُسے تو اب تک تمہارے ہی ساتھ ہونا چاہئے تھا۔ تم اُسے تلاش کرنے یہاں کس طرح آ گئے؟ بے بی یہاں کیوں ہونے لگی؟''

''بے بی؟'' وجے چونکا۔ ''میں سورن لتا کی بات کر رہا ہوں، اپنی بہن کی بات!''

''اچھا......'' اوما دیوی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ وجے کا جھوٹ پکڑنے کا گویا انہیں ایک اور موقع مل گیا۔ ''تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم سورن لتا ہی کو بے بی کہتے ہیں؟''

وجے کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ اُس نے حیرت سے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ سورن لتا بنارس میں پولیس کے ہاتھ نہیں لگی تھی؟''

"بنارس میں؟" اوما دیوی نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے سوال کیا۔

"جی ہاں۔" وجے بولا۔ "دیوان چند نے مجھے بھی بتایا تھا کہ جب پولیس اُس کا تعاقب کر رہی تھی تو دشاشومیگھ گھاٹ پر سورن لتا کا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ سورن لتا، پولیس کے ہاتھ لگنے کے بعد آپ لوگوں تک پہنچ گئی ہوگی۔"

"دیوان چند...... کون دیوان چند؟" اوما دیوی یہ کہہ کر اپنے ذہن پر زور دینے لگیں۔

"سریش ورما۔" وجے نے بتایا۔ "پولیس سے بچنے کے لئے اُس نے اپنا نام دیوان چند رکھ لیا تھا۔"

"بنارس...... دشاشومیگھ گھاٹ!" اوما دیوی نے اپنی آنکھوں سے چشمہ اُتار کر بہت دھیان سے سوچا۔ پھر اُنہیں یاد آ گیا۔ "ہاں ہاں، پولیس نے یہ خبر تو دی تھی کہ سریش ورما کو بنارس میں دیکھا گیا ہے۔ دشاشومیگھ گھاٹ تک اُس کا پیچھا بھی کیا گیا تھا مگر وہ بھاگ نکلا تھا۔"

اوما دیوی نے چشمہ لگا کر وجے کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ وجے کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اُن کے ذہن میں اس وقت آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ ماضی اُن کی آنکھوں میں گھوم رہا تھا، خاص طور پر اُنہیں وہ زمانہ یاد آ رہا تھا جب وجے کو اغوا کیا گیا تھا۔

وجے کی طرف دیکھتے ہوئے اوما دیوی کی نظر دُھندلانے لگی۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ اُن کا دل تیزی سے دھڑک کے جیسے تصدیق کر رہا تھا کہ جو نوجوان اُن کے سامنے کھڑا ہوا ہے، انہی کا کھویا ہوا بیٹا وجے ہے۔ عرصۂ دراز کے بعد اُن کے آنسو آج سوتوں کی طرح پھوٹ نکلے تھے ورنہ تو اُن کی آنکھیں آنسو بہا بہا کر خشک ہو چکی تھیں۔ روتے روتے اُن کا دل بہت سخت ہو گیا تھا۔ وقت نے اُن کے دل پر اتنے زخم لگائے تھے کہ جنہیں برداشت کرتے کرتے وہ خود بے حس ہو کے رہ گئی تھیں۔

"بیٹا وجے!" اُنہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔

وجے اپنی ماں کی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ اُس نے اُن کے دل میں اُمڈتے طوفان کو محسوس کر لیا تھا۔ اُس کی بھی آنکھیں بھر آئیں اور ہونٹ لرزنے لگے۔ اُس نے بڑی

مشکل سے کہا۔ "ماں!" پھر وہ لپک کر ماں سے لپٹ گیا۔

اوما دیوی دیوانوں کی طرح اُسے پیار کرنے لگیں۔ ایک زمانے کے بعد اُن کی آنکھوں کا تارا واپس آیا تھا۔ اب اُنہیں اُمید ہو چلی تھی کہ دوسرا تارا بھی واپس آ جائے گا۔ اس دوران اوما دیوی کے سارے ہی نوکر چاکر وہاں آ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے آنچل سے وجے کے آنسو پونچھے اور آنکھیں بھی صاف کیں۔

"ہمارے بچے کے لئے اچھے اچھے کھانے تیار کرو!" اوما دیوی نوکروں کی طرف مڑ کر بولیں۔ "ہمارا کھویا ہوا بیٹا آج اپنے گھر لوٹ کر آیا ہے، اسے ہم اپنے ہاتھ سے کھانا کھلائیں گے جیسے پہلے کھلایا کرتے تھے۔"

اوما دیوی کا لہجہ بڑا رُعب دار تھا۔ شاید طویل عرصے تک غم اُٹھا کر اُن کا رویہ ایسا ہو گیا تھا، دُکھ سہتے سہتے اُن کے لہجے کی نرمی غائب ہو گئی تھی۔ وہ غالباً اسی لئے بیٹے کے ملنے پر اپنی خوشی کا کھل کے اظہار بھی نہ کر سکیں، خوشی سے چیخ چیخ کے آسمان سر پر نہ اُٹھا سکیں۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کی لڑکی اب تک نہیں ملی تھی۔ نہ جانے وہ کہاں ہوگی؟ کس حال میں ہوگی؟ وجے اپنی ماں کے رویے اور اُن کی مجبوری کو کافی حد تک سمجھ چکا تھا۔

نوکر چاکر اوما دیوی کے حکم کی تعمیل میں لگ گئے۔ اوما دیوی نے بڑے پیار سے وجے کا بازو پکڑا اور اسے صوفے پر بٹھایا۔ پھر وہ خود بھی اُس کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ انہوں نے وجے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ میں جا کر ثبوت بھیج دوں گا، لیکن اس کے بعد مجھے تلاش مت کرنا؟"

وجے نے جواب میں کہا۔ "ماں جی! تمہارے سلوک کے باعث میرا دل ٹوٹ گیا تھا۔ بس اس لئے یہ بات کہہ دی تھی، مگر میں ایسا کر نہیں سکتا تھا۔ تمہیں ثبوت بھیجتا، اس کے بعد جب تمہیں یقین آ جاتا اور تم مجھے بلاتیں تو دوڑا چلا آتا۔"

"میں جانتی ہوں بیٹے!" اوما دیوی کہنے لگیں۔ "تو میرے بلانے پر یقیناً آ جاتا۔ کیا کروں بیٹا، پچھلے کئی برسوں میں نہ جانے میرے کتنے جعلی بیٹے اور بیٹیاں مجھ سے آ کر مل چکے ہیں۔ شروع میں ایک لڑکے کو روتا ہوا دیکھ کر میرا دل پسیج گیا تھا۔ میں اُسے واقعی اپنا بیٹا سمجھ بیٹھی تھی۔ کمبخت مجھ سے کہنے لگا کہ سورن لتا بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ وہ

تو مجھے اُس کی گندی عادتوں کی وجہ سے شک ہو گیا۔ جب میں نے پولیس کی مدد حاصل کی تو پتہ چلا کہ وہ عادی مجرم ہے۔ پولیس کو وہ دیگر کیسوں میں بھی مطلوب تھا۔ وہ میری جائیداد حاصل کرنے کے لئے میرا بیٹا بنا تھا۔"

"ماں!" وجے اپنے بارے میں بتانے لگا۔ "مجرم تو میں بھی رہ چکا ہوں۔"

"تو کچھ بھی رہا ہو مگر اب تو میرا بیٹا ہے۔ تیری نئی زندگی اب شروع ہو گی، میری ممتا کی چھاؤں تلے۔" اوما دیوی نے وجے کو بولنے نہ دیا۔ "ایک بار تو ایک لڑکا اور لڑکی میرا بیٹا اور بیٹی بن کر چلے آئے۔ دونوں آتے ہی مجھ سے لپٹ گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ پھر انہوں نے کئی من گھڑت کہانیاں سنائیں۔ انہوں نے کہا کہ جب سریش ورما مرنے لگا تو اُس نے ان دونوں کو حقیقت سے آگاہ کیا۔ یوں انہیں معلوم ہوا کہ وہ جگل پرشاد کی اولاد ہیں۔ اس پر بھی میں ان کی باتوں میں نہ آئی۔ وہ لڑکی میری بیٹی نہیں ہو سکتی تھی۔"

"وہ کیسے ماں؟" وجے نے یقین کی وجہ پوچھی۔

"بے بی کی زلفیں سنہری بلکہ غیر معمولی سنہری اور چمکدار تھیں۔ وہ کچھ گھنگھریالی بھی تھیں۔" اوما دیوی نے بتایا۔ "اُس کی آنکھیں بھی سنہری مائل تھیں۔ پلکیں اتنی لمبی تھیں جیسے آنکھوں پر کوئی بوجھ رکھا ہو۔" اوما دیوی تفصیل سے سورن لتا کا حلیہ بیان کر رہی تھیں۔

"ماں!" معاً وجے بول اٹھا۔ سورن لتا کا حلیہ سن کر وہ پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔ اُس کا دل تیزی کے ساتھ دھڑکنے لگا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں انشو کا حسین چہرہ گھومنے لگا تھا۔ انشو کا رنگ روپ اور خاص طور پر اُس کی لمبی گھنیری پلکیں بھی تو ایسی ہی تھیں۔

"ہاں بیٹا!" اوما دیوی بولیں۔ "اُس کی پلکیں واقعی اتنی لمبی اور گھنی تھیں کہ جب وہ سونے کے بعد جاگتی تو اس طرح اپنی پلکیں کھولتی تھی جیسے اُسے پلکیں کھولنے کے لئے طاقت لگانی پڑ رہی ہو۔ کم از کم اُس کی یہ بات تو کبھی نہیں بدل سکتی۔"

وجے کا شک بڑھنے لگا۔ کیا انشو ہی...... اس سے آگے وہ نہ سوچ سکا۔ اس نہج پر سوچنا بھی اُس کے لئے سوہانِ رُوح تھا......!

◆ ...... ◆

وجے کی آنکھوں میں انشو کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر اُس کے ہونٹ حرکت کر رہے تھے، مگر آواز بہت دھیمی تھی۔ "نہیں نہیں...... ایسا کبھی نہیں ہو سکتا...... یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔ انشو تو رائے صاحب کی بیٹی ہے اور...... اور میری بہن کا نام سورن لتا ہے...... رہے سنہری بال تو ایسے بالوں والی لڑکیاں ملک بھر میں نہ جانے کتنی ہوں گی!" بڑبڑاتے ہوئے وہ ایک دم چونک اُٹھا۔ اوما دیوی کی سوالیہ نظریں اُس کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔

"کیا بڑبڑا رہے ہو تم؟" اوما دیوی نے اُس سے پوچھا۔ "اگر تمہیں کچھ کہنا ہے تو بلند آواز میں کہو۔"

"میں... میں دراصل یہ کہہ رہا تھا ماں!" وجے سنبھل کر بولا۔ "آپ نے جو نشانی بتائی ہے، یہ تو کوئی خاص پہچان نہیں ہے۔ مان لیں آپ کے پاس سنہری بالوں، سنہری مائل آنکھوں کی رنگت اور لمبی پلکوں والی کوئی لڑکی آ جائے تو کیا اُسے اپنی بیٹی تسلیم کر لیں گی؟"

"نہیں۔" اوما دیوی نے جواب دیا، پھر بتایا۔ "میری بیٹی کی ایک اور نشانی بھی ہے۔"

"وہ کیا؟" وجے نے بیتابی کے ساتھ سوال کیا۔

"اُس کے دائیں بازو پر ایک سیاہ تل ہے، بہت نمایاں! یہ ایسی نشانی ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتی...... بلکہ وہ تل عمر کے ساتھ بڑھ کر اب تک اور بھی نمایاں ہو جانا چاہئے۔ ایسا تو ہر لڑکی کے ساتھ...... میرا مطلب ہے کہ ہر لڑکی کے دائیں بازو پر تو اس طرح نمایاں تل نہیں ہو گا۔" اپنی دلیل کو درست ثابت کرنے کے لئے اوما دیوی اور نہ جانے کیا کیا کہتی رہیں! مگر وجے تو جیسے سب کچھ سن کر بھی انجان اور لاتعلق سا بنا ہوا تھا۔

وجے کو وہ منظر یاد آ رہا تھا جب وہ انشو اور اُس کے دوستوں کے ساتھ پکنک پر گیا

تھا۔ وہ اور انشو ڈاک بنگلے کے برآمدے میں الگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ یہ رات کا وقت تھا مگر برآمدے میں روشنی تھی۔ جس وقت انشو نے وجے کی طرف کھانے کی پلیٹ بڑھائی تو اُس کی ساڑھی کا پلّو ڈھلک گیا تھا۔ اسی سبب انشو کا دایاں بازو کھل گیا تھا۔ وجے کو وہ حسین اور نمایاں تل اسی وقت نظر آ گیا تھا۔ پھر جب انشو نے محسوس کیا کہ وجے کی نظریں بازو کے تل پر جمی ہوئی ہیں تو اُس نے جلدی سے ساڑھی کے پلّو کو بازو پر لپیٹ لیا تھا۔

وہ ابھی انہی سوچوں میں گم تھا کہ اُسے پولیس سائرن کی آواز سنائی دی۔ زندگی بھر وہ پولیس سائرن کی آواز سنتا آیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس آواز کو سنتے ہی کیا کرنا ہے، مگر اس وقت صورتحال قطعی مختلف تھی۔ وہ اطمینان کے ساتھ بیٹھا رہا کیونکہ اس وقت اپنی ماں کے پاس تھا، ایک بیٹے کے روپ میں! وہ اس وقت چندانی سیٹھ کے گروہ کا کوئی جرائم پیشہ فرد نہیں تھا کہ پولیس کا سائرن سن کر بھاگ کھڑا ہوتا۔

"ماں! یہ پولیس یہاں کیوں آئی ہے؟" وجے نے اوما دیوی کی طرف گھوم کر دریافت کیا۔ اُس کی آواز پُرسکون تھی۔

"اس کی وجہ گزشتہ تلخ تجربات ہیں۔" اوما دیوی بتانے لگیں۔ "مجھے جب معلوم ہوا کہ کوئی نوجوان مجھ سے ملنے آیا ہے تو میں سمجھ گئی اسے بھی میرا بیٹا ہونے کا دعویٰ ہوگا۔ اس وقت تک تم سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اسی لئے پولیس کو فون کر کے بلانے کو کہہ دیا تھا...... مگر اب...... اب مجھے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں رہی۔ پولیس کو میں واپس کئے دیتی ہوں۔" یہ کہہ کر اوما دیوی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

وجے بھی اوما دیوی کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اُس کے چہرے سے کسی طرح کی فکر مندی کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

پولیس والے جیپ سے اُتر کر برآمدے میں پہنچ چکے تھے۔ اس سے قبل کہ وہ اوما دیوی سے اندر آنے کی اجازت لیتے، وہ خود ہی اُن سے کہنے لگیں۔ "آئیے انسپکٹر صاحب، آئیے۔" وردی سے اوما دیوی نے پولیس افسر کو پہچان لیا تھا اور اُسی سے مخاطب تھیں۔ "تشریف لائیے۔"

انسپکٹر کے ساتھ چھ کانسٹیبل تھے۔ اُس نے وجے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور اندر

آ گیا۔ اسی کے ساتھ کانسٹیبل بھی اندر گھس آئے۔ انہوں نے وجے کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ انسپکٹر مشتبہ انداز میں وجے کو دیکھ رہا تھا۔ اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پر لکڑی کا موٹا رول مارتے ہوئے وہ وجے کے سراپا کا جائزہ لے رہا تھا۔

"انسپکٹر!" اس سے پہلے کہ وجے سے انسپکٹر کچھ کہتا، اوما دیوی بول اُٹھیں۔ "یہ واقعی میرا اصل بیٹا وجے ہے۔ بھگوان کو آخر مجھ پر رحم آ ہی گیا اور میرے اغواء ہونے والے بیٹے کو میرے پاس بھیج دیا۔ ورنہ تو میں بالکل مایوس ہو چکی تھی۔"

"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" پولیس انسپکٹر حیرت سے کہنے لگا۔ "پہلے بھی شاید ایک مرتبہ آپ نے کسی نوجوان کے بارے میں ایسا ہی کہا تھا، لیکن پھر وہ بات غلط ثابت ہوئی۔ کہیں اس بار بھی آپ کے ساتھ دھوکا نہ ہو جائے۔"

"نہیں انسپکٹر! مجھے پورا وشواش ہے کہ اس مرتبہ ایسا نہیں ہوگا۔" اوما دیوی نے پولیس انسپکٹر کو یقین دہانی کرائی اور پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "یہ ہے میرا بیٹا وجے جس کا روپ اختیار کر کے نہ جانے کتنے فریبی اس سے پہلے میرے پاس آئے تھے۔ ان سب کا دعویٰ یہی تھا کہ وہ میرے گمشدہ بیٹے ہیں۔ ان کی جانچ کے لئے ہی مجھے آپ کی مدد لینی پڑی تھی۔"

"میڈم! آپ یہ نہ بھولیں کہ اس سے پہلے دھوکا کھا چکی ہیں۔" انسپکٹر کہنے لگا۔ "سوچ لیجئے!"

"یہ ٹھیک ہے کہ پہلے مجھے فریب دیا جاتا رہا ہے، لیکن اس بار مجھے کوئی دھوکا نہیں ہوا ہے۔ یہ لڑکا میرا بیٹا ہی ہے، میرا وجے!" اوما دیوی نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"پھر بھی......" انسپکٹر بولا۔ "جو کام آپ نے پولیس کو سونپا ہے، وہ کام پولیس ہی کرے تو اچھا ہے۔ آپ بہرحال ایک گھریلو عورت ہیں اور جرائم پیشہ افراد کی ذہنیت کو سمجھنا آپ کے لئے مشکل ہے جبکہ ہمارا واسطہ دن رات جرائم پیشہ عناصر ہی سے پڑتا ہے۔ ہم ان کو اچھی طرح پہچان سکتے ہیں۔ جہاں تک ان صاحب کا تعلق ہے تو ان کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ یہ آپ ہی کے بیٹے ہیں۔"

"اب مجھے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔" اوما دیوی نے جلدی سے کہا۔ "میرا دل کہتا ہے کہ......"

''ٹھہرو ماں!'' یکایک وجے بول اٹھا اور اوما دیوی کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ وجے بولا۔ ''میں ابھی انسپکٹر صاحب کو پورا ثبوت دکھاتا ہوں۔''

''ثبوت؟'' اوما دیوی بڑبڑا کے رہ گئیں۔ اُن کی نظریں وجے پر مرکوز تھیں۔

وجے نے اپنا سوٹ کیس کھولا، اس میں سے کاغذات کا ایک پلندا نکالا اور پولیس انسپکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ کاغذات کا یہ پلندا اُس خط پر مشتمل تھا جو دیوان چند نے اُسے لکھا تھا۔ وجے وہ خط دیتے ہوئے پولیس انسپکٹر سے کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ اُس نے خط والا ہاتھ پیچھے کر لیا۔

''لیکن یہ خط میں آپ کو کیسے دے سکتا ہوں انسپکٹر!'' وجے بولا۔ ''اس میں تو میرے خاندان کی عزت پوشیدہ ہے۔ یہ...... میں یہ خط آپ کو کبھی نہیں دوں گا۔ اس خط کو صرف میری ماں جی پڑھ سکتی ہیں، صرف ماں جی!'' آخری الفاظ پر وجے نے زور دیا۔

انسپکٹر ہاتھ جھٹک کر رہ گیا۔ وجے نے اب وہ خط اوما دیوی کی طرف بڑھا دیا تھا۔

''انسپکٹر صاحب!'' وجے نے انسپکٹر کی جانب پلٹ کر کہا۔ ''آپ کو اپنا شک دور کرنے کے لئے جو کچھ بھی پوچھنا ہے بلا جھجک مجھ سے پوچھئے۔ میں آپ کے ہر سوال کا تسلی بخش جواب دوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ میں آپ کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

چند لمحے توقف کے بعد پولیس انسپکٹر نے سوال کیا۔ ''آپ مجھے صرف یہ بتا دیجئے کہ بچپن میں جب آپ کو اغواء کر لیا گیا تھا تو آپ کی زندگی کہاں اور کس طرح بسر ہوئی؟ اس کے علاوہ آپ یہ بھی جواب دیں کہ آپ کو کیسے پتہ چلا آپ اوما دیوی جی کے بیٹے ہیں؟''

وجے نے جواب دینے میں زیادہ دیر نہیں کی۔ ''جو شخص مجھے اغواء کر کے لے گیا تھا وہ دہلی سے فرار ہو کے پہلے بنارس پہنچا۔ پھر جب بنارس میں پولیس اُس کے پیچھے پڑ گئی تو وہ بمبئی فرار ہو گیا۔ بمبئی پہنچ کر وہ چندانی سیٹھ نامی ایک اسمگلر کے ساتھ کام کرنے لگا۔''

''چندانی......؟ یہ کچھ سنا ہوا سا نام لگتا ہے۔'' انسپکٹر خود کلامی کے انداز میں بولا۔

''جی ہاں، وہ بمبئی کی بڑی مشہور شخصیت تھا۔ مگر وہ ایک بہت بڑا اسمگلر تھا۔'' وجے نے بتایا۔ ''اُس کا پورا گروہ حال ہی میں پکڑا گیا ہے۔''

''اچھا اچھا...... یاد آیا۔'' انسپکٹر کہنے لگا۔ ''وہی چندانی جس کے متعلق اخبارات میں بڑی تفصیلی خبریں شائع ہوئی تھیں؟''

''جی...... جی ہاں وہی چندانی۔'' وجے نے تصدیق کی۔

''وہ...... وہ تو بہت خطرناک اسمگلر تھا۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''میں نے اُس کے متعلق کسی اخبار میں یہ بھی پڑھا تھا کہ اُس نے چیتے بھی پال رکھے تھے۔ اُس کے گروہ کا کوئی آدمی اگر غداری کرتا تھا تو وہ اُسے ان چیتوں کے آگے ڈال دیتا تھا۔''

''آپ نے ٹھیک ہی پڑھا ہے۔'' وجے نے بتایا۔ ''ان چیتوں کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں۔ چندانی کے گینگ کو میں نے ہی پکڑوایا تھا۔''

پولیس انسپکٹر کے چہرے سے بے یقینی کا اظہار ہو رہا تھا۔ اُس نے کہا۔ ''واقعی......؟ اتنے بڑے گینگ کو آپ نے پکڑوایا تھا؟'' انسپکٹر کو اب وہ ساری باتیں یاد آ گئی تھیں جو اخبارات میں پڑھی تھیں۔ تفصیلات کے مطابق بمبئی میں چندانی سیٹھ نامی ایک اسمگلر کے گروہ کا پولیس نے صفایا کر دیا تھا۔ اس دوران چندانی مارا گیا تھا۔ وہ خود اپنے ہی پالتو چیتوں کی خوراک بن گیا تھا۔ چندانی کے ساتھ ہی اور بہت سے لوگ مارے گئے تھے۔ کافی لوگ زخمی ہوئے تھے۔ گروہ کے متعدد افراد کو قانون کی گرفت میں لے لیا گیا تھا۔ چندانی کے پالتو چیتے اب بمبئی کے چڑیا گھر میں تھے۔

وجے، پولیس انسپکٹر کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے اُس کے جذبات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ہاں یاد آیا۔'' انسپکٹر چونک کر بولا۔ ''اخبار میں آپ کی تصویر بھی چھپی تھی اور لکھا تھا کہ اس نوجوان کی وجہ سے پولیس چندانی کے گروہ پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہوئی۔''

''جی...... میری تصویر چھپی تھی اخباروں میں۔'' وجے نے انسپکٹر کی بات کو درست قرار دیا۔

''دراصل ہم پولیس والے اخباروں میں چھپنے والی تصویروں کو آسانی سے نہیں بھول سکتے، خاص طور پر ایسی خبریں اور تصویریں عموماً ہمارے حافظے میں محفوظ رہتی ہیں جن کا

کوئی تعلق جرائم کی دنیا سے ہو۔ آپ اسے ہماری پیشہ ورانہ عادت کا نام بھی دے سکتے ہیں۔" انسپکٹر یہ کہہ کر اوما دیوی سے مخاطب ہوا۔ "اوما جی! ایسے شخص پر شبہ کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یقیناً یہی آپ کے بیٹے ہیں۔ میں اب اور کچھ نہیں پوچھوں گا۔ آپ بڑی خوش قسمت ہیں کہ آپ کا بیٹا اس قدر بہادر، نڈر، باہمت اور دلیر ہے جس نے اسمگلروں کے ایک خطرناک گروہ کو پکڑوا کر ملک کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔"

اس کے بعد انسپکٹر نے آگے بڑھ کر وجے سے ہاتھ ملایا اور کہا۔ "مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ کسی وقت میں آپ سے ملنے ضرور آؤں گا۔"

"موسٹ ویلکم انسپکٹر!" وجے نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

"شکریہ!" انسپکٹر بولا اور پھر اوما دیوی سے "نمستے" کہہ کر اپنے ساتھیوں سمیت واپس چلا گیا۔

اوما دیوی نے فخریہ انداز میں وجے کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولیں۔ "اچھا...... میرا بیٹا اتنا بہادر ہے کہ اس نے تن تنہا چندانی جیسے بڑے اور خطرناک مجرم کے گروہ کو پکڑوا دیا۔ آخر خون کا اثر آتا ہی ہے، خاندانی شرافت رنگ ضرور لاتی ہے۔"

"خون کا اثر" اور "خاندانی شرافت" ان الفاظ نے وجے کے دل پر ایک چرکا سا لگایا، مگر اُس نے اوما دیوی پر کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیا۔

"یہ سب تمہارے آشیرواد کی وجہ سے ہوا ہے ماں!" وجے نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"میں نے اخبار میں صرف سرخی پڑھی تھی، مگر جہاں بھی گئی وہاں اس خبر کے بڑے چرچے تھے۔ اب مجھے بھی وہ پرانے اخبارات تلاش کرا کے پڑھنے پڑیں گے۔ میں بھلا اپنے بیٹے کے اس کارنامے کو کیسے نظر انداز کر سکتی ہوں۔ میرے لئے تو یہ بڑے فخر کی بات ہے۔" اوما دیوی نے اظہارِ خیال کیا۔ پھر وہ وجے کا ہاتھ پکڑ کر اُسے دوسرے کمرے میں لے گئیں اور کہنے لگیں۔ "پہلے ہاتھ منہ دھو کر کچھ کھا لے، اس کے بعد دونوں ماں بیٹا خوب جی بھر کے باتیں کریں گے۔"

وجے اپنی ماں کے ساتھ ہولیا، مگر اُس کے ذہن میں اپنی بہن سورن لتا کے بارے میں دوبارہ اُلجھن پیدا ہو گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا، کیا دو لڑکیوں کے درمیان اس قدر

مشابہت ہو سکتی ہے؟ انشو اور سورن لتا ایک تو نہیں ہو سکتیں۔

پھر جب وجے غسل کر رہا تھا تو اس وقت بھی ذہن اسی مسئلے میں اُلجھا ہوا تھا۔ انشو اور سورن لتا الگ الگ دو ہستیاں ہیں یا ایک ہی ہیں؟ اُس کا دل یہ سوچتے ہوئے تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اگر انشو اور سورن لتا ایک ہی نکلیں تو قیامت آ جائے گی، زمین پھٹ جائے گی، آسمان گر پڑے گا۔ وجے کے وجود میں طوفان اُٹھتے رہے۔ اگر ایسا ہی ہوا تو وہ بے قصور ہو کر بھی بہت بڑا گنہگار بن جائے گا۔ ایسا گنہگار جسے کسی بھی جنم میں معافی نہیں ملے گی۔ اُس نے اپنے آپ کو زبردستی یقین دلانے کی کوشش کی۔ سنہری زلفیں، سنہری آنکھیں اور لمبی پلکیں تو بہت سی لڑکیوں کی ہوتی ہیں۔ یوں بھی انشو اور سورن لتا کا آپس میں کیا تعلق! انشو تو رائے صاحب کی بیٹی ہے، وہ اُس کی بہن کیسے ہو سکتی ہے؟ وجے نے خود کو اطمینان دلانا چاہا مگر ناکام رہا۔ ایک انجانا خوف اُس کے دل کو دہلا رہا تھا۔ ہر لمحے اس خوف میں اضافہ ہوتا رہا۔ اُس نے ارادہ کر لیا تھا کہ بمبئی واپس جاتے ہی انشو سے مل کر اُس کے دائیں بازو کو ایک بار پھر غور سے دیکھے گا۔ ممکن ہے بازو پر نمایاں سیاہ تل کے بارے میں اُسے غلط فہمی ہوئی ہو۔

نہا دھو کر جب وہ کمرے میں اپنی ماں کے پاس پہنچا تو اُن کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں وجے کا دیا ہوا خط تھا۔ یہ وہی طویل خط تھا جو دیوان چند (سریش ورما) نے وجے کو لکھا تھا۔ اوما دیوی اس خط کو پڑھ چکی تھیں۔ پرانے زخم تازہ ہو جائیں تو تکلیف اور بھی زیادہ ہوتی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اوما دیوی آنکھوں میں آنسو لئے گم صم سی اپنے پلنگ پر بیٹھی تھیں۔

وجے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جانے کے بجائے اوما دیوی کے پاس جا کر بیٹھ گیا، پلنگ پر ان کے بالکل قریب۔ اُسے بخوبی اندازہ تھا کہ دیوان چند کا لکھا ہوا خط پڑھنے کے بعد اُس کی ماں کے دل پر کیا گزری ہوگی! وجے نے اسی لئے ماں کی بانہیں تھام کر انہیں تسلی دینی چاہی۔

اوما دیوی نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور بولیں۔ "بیٹا! میں نے بڑی کوشش کی کہ تیرے پتا جی کو غلط راہ پر نہ چلنے دوں۔ میں نے انہیں راہِ راست پر لانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا، مگر وہ نہیں بدلے۔ ہاں بے بی کی پیدائش کے بعد وہ کسی قدر

بدل گئے تھے، لیکن صرف ایک سال کے لئے۔ یقیناً بے بی (سورن لتا) کی پہلی سالگرہ کے موقع پر سریش ورما کی بیوی کیرتی کو دیکھ کر ان کی نیت خراب ہوئی تھی۔ انہوں نے اسی لئے کچھ دن بعد مجھے بچوں سمیت میکے بھیج دیا تھا۔ مجھ سے انہوں نے کہا تھا کہ وہ کلکتے جانے والے ہیں۔ وہاں سے وہ سیدھے میکے آجائیں گے۔ یوں مجھے میکے جانا پڑا اور......''

''مگر ماں، آپ مجھے اور میری بہن کو پتا جی کے پاس کیوں چھوڑ گئیں؟ ہمیں اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئیں؟'' وجے نے پوچھا۔

''میں ایک دفعہ تو میکے ہو آئی۔ تم دونوں بھائی بہن پہلی بار میرے ساتھ تھے۔'' اوما دیوی نے بتایا۔ ''مگر میکے سے آنے کے بعد مجھے دوبارہ ہنگامی طور پر وہاں جانا پڑ گیا۔ دراصل میرے بھائی کی ایک بچی چیچک کے مرض میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو چکی تھی مجھے اسی لئے مجبوراً دونوں بچوں کو اپنے گھر ہی چھوڑنا پڑا۔ بچوں کی صحت و تندرستی کی خاطر یہ ضروری تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ انہی دنوں سریش ورما جیل سے بھاگ نکلے گا اور میرے دونوں بچوں کو اغواء کر کے لے جائے گا۔''

اوما دیوی کی آنکھیں پھر چھلک پڑیں۔ کچھ دیر وہ بول نہ سکیں۔ وجے بھی چپ رہا۔

پھر خود ہی اوما دیوی نے اپنے آنسو پونچھے اور کہا۔ ''تیرے پتا جی کچھ زیادہ ہی بے بی سے پیار کرتے تھے۔ بے بی اغواء ہو گئی تو انہیں اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ وہ دن رات آنسو بہاتے اور تڑپتے رہتے تھے۔ ان کی بری عادتوں کی وجہ سے ہمیشہ میرے اور ان کے درمیان اختلاف رہا۔ ان سے میری کبھی نہیں بنی۔ ہم تو دنیا دکھاوے کو اپنے تعلقات نبھاتے رہے۔ ہم نے مجبوراً یہ رشتہ استوار رکھا۔ پھر جب تمہارا اور بے بی کا کچھ پتہ نہ چلا تو ان کی صحت روز بروز گرتی چلی گئی۔ میرے دل میں بھی ان سے چھوٹا زخم نہ تھا۔ اس کے باوجود مجھ سے ان کی تڑپ اور ان کا کرب دیکھا نہیں جاتا تھا۔ جب وہ انتہائی غمزدہ ہو کر دیواروں سے ٹکریں مارنے لگتے تو میرا کلیجہ پھٹنے لگتا۔ ان کی حالت پاگلوں جیسی ہوتی جارہی تھی۔ راتوں کو وہ سوتے سوتے اُٹھ کر بیٹھ جاتے اور دیوانوں کی طرح چیخنے لگتے، بے بی! میری بچی کہاں ہے؟ اس وقت مجھے ان سے بڑی ہمدردی محسوس ہوتی۔ میں ایک عورت ہوں نا...... مشرقی عورت! اسی لئے میں اپنے شوہر کا دُکھ

برداشت نہیں کر پاتی تھی۔ میں نے انہیں دل سے معاف کر دیا تھا۔ میں خود اس حالت میں تھی کہ مجھے کوئی تسلی دیتا، مگر ان کی خاطر صبر کر لیا تھا۔ ماضی میں انہوں نے جو غلطیاں کی تھیں، ان کے تصور کو بھی میں نے اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ میں اُن کے سارے گناہوں اور غلطیوں کو بھول گئی تھی۔ میں نے اُنہیں معاف کر کے بھگوان سے ان کی صحت و سلامتی کے لئے دن رات دُعائیں کیں۔ بھگوان کی مورتی کے آگے روئی، گڑگڑائی مگر بھگوان نے انہیں معاف نہ کیا۔ وہ اپنی اولاد کی جدائی میں ایسے بیمار پڑے کہ پھر بستر سے نہ اُٹھ سکے۔ بھگوان نے اسی حالت میں اُنہیں اُٹھا لیا۔ مجھے آج بھی...... یاد ہے بیٹے کہ...... کہ مرتے وقت بھی اُن کی آنکھوں میں اپنے جگر کے ٹکڑوں کو دیکھنے کی آرزو تھی اور ہونٹوں پر بے بی کا نام تھا۔'' اوما دیوی کی آواز بھرا گئی۔

ماں کی زبان سے اپنے باپ کی جیون کہانی سن کر وجے کی آنکھوں میں بھی آنسو تیرنے لگے۔ وہ شخص جیسا بھی سہی، بہرصورت اُس کا باپ تھا۔ اُسے اُس کی کرنی کا پھل مل گیا تھا۔ وجے کو اب اُس کے لئے اپنے دل میں نفرت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

اس رات وجے سونے کی بہت کوشش کرتا رہا مگر اُسے نیند نہ آئی۔ پھر اُسی رات کیا، وہ پورے ایک ہفتے تک انتہائی مضطرب رہا۔ گھڑی دو گھڑی کو اُس کی آنکھ لگتی اور دوبارہ کھل جاتی۔ نہ اُسے دن کو چین تھا نہ رات کو آرام! ہر وقت اُسے انشو کی یاد ستاتی رہتی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے شک میں اضافہ ہو گیا تھا کہ کہیں انشو ہی سورن لتا نہ ہو! یہ خیال آتے ہی وجے خود کو تسلی دینے لگتا، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔ اس کے باوجود اُسے چین نہ آتا تھا اور دل تھا کہ اُس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ ایک عجیب سا خوف اُس کے اعصاب پر مسلط رہنے لگا تھا۔ یہ خوف اُسے پریشان کئے رہتا۔

وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد بمبئی جائے اور اپنے اس شک کو دُور کر لے۔ انشو سے ملے بغیر، اُس کے دائیں بازو کو دیکھے بغیر، دوبارہ بغور دیکھے بنا وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ اُس کی زندگی کا عجیب موڑ تھا۔ اُس نے اوما دیوی سے بمبئی جانے کا ذکر کیا تو انہوں نے ضد کر کے اُسے چند دنوں کے لئے روک لیا۔ وہ بھی تو بیٹے کی محبت کے لئے برسوں ترسی ہوئی تھیں۔ اُن کی یہ خواہش بے جا نہیں تھی کہ ایک مدت کے بعد بیٹا ملا ہے تو زیادہ سے زیادہ آنکھوں کے سامنے رہے۔ وجے نے ماں سے اپنے دل کا حال بیان

نہیں کیا۔ وہ بتاتا بھی کیسے؟ اگر انشو ہی اُس کی بہن نکلتی تو ماں جی کیا سوچتیں! پہلے وہ اپنا شک دُور کرنا چاہتا تھا، اس کے بعد ہی وہ ماں کو کچھ بتا سکتا تھا کہ اُسے انشو نامی ایک لڑکی سے پیار ہوگیا ہے جو بمبئی میں رہتی ہے۔

اس ایک ہفتے کے دوران وجے کو پتہ چلا کہ اُس کی ماں اوما دیوی نے ''شاردا پرشاد اینڈ کمپنی (پرائیویٹ) لمیٹڈ'' کے بہت سے شیئرز فروخت کر دیئے ہیں۔ دراصل وہ اپنے بعد اپنی تمام دولت اور جائیداد کا ٹرسٹ بنانے والی تھیں، لیکن وجے کی آمد پر انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ اب وہ اپنا سب کچھ وجے کے نام کر رہی تھیں۔ وجے نے اس معاملے پر بھی اپنی ماں سے کوئی بات نہ کی۔ اُسے حقیقتاً دولت و جائیداد کا لالچ نہیں تھا۔

ایک ہفتے کے بعد وجے واپس بمبئی پہنچ گیا۔ وہ سیدھا اپنے گھر گیا۔ وہ انشو کو فون کر کے بلانا چاہتا تھا، لیکن پھر اُس نے فون کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ انشو کے گھر والوں نے اس عرصے میں انشو پر نہ جانے کیا کیا پابندیاں لگا دی ہوں گی۔ اگر میں نے فون کیا تو کہیں اس بے چاری پر کوئی نئی مصیبت نازل نہ ہو جائے۔ اُس نے ایک اور راستہ نکال لیا کہ وہ انشو کی سہیلی مینا سے رابطہ کر کے اُس کے ذریعے انشو کو بلوائے گا، لیکن اس کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ وہ گھر سے نکلنے ہی والا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔

''ہیلو!'' وجے نے ریسیور اُٹھا کر کہا۔

''ہیلو وجے!'' دوسری جانب سے بولنے والی انشو ہی تھی۔ اُس کی آواز سے بے انتہا مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

''ہاں انشو، میں وجے بول رہا ہوں۔'' وجے بولا۔ مگر اُس کی آواز بوجھل تھی۔

''میں تمہیں کئی دنوں سے فون کر رہی ہوں وجے......! تم نے دہلی میں اتنی دیر کیوں لگا دی؟ مجھے مینا سے معلوم ہوگیا تھا کہ تم کہاں گئے ہو!'' انشو کی آواز سے ناراضگی جھلکنے لگی۔ ''تم نے دہلی میں اتنے دن رہ کر ایک بار بھی شاید مجھے یاد نہیں کیا۔ اگر تمہیں میرا خیال ہوتا تو وہاں اتنے دن رُکتے ہی کیوں!'' وجے یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ اس ناراضگی میں بھی پیار تھا۔ وہ پھر پوچھنے لگی۔ ''بولو نا! میرے سوال کا جواب دو۔''

''بس یوں ہی دیر ہوگئی۔'' وجے نے ٹالنے کی کوشش کی۔

''گھر والوں سے ملاقات ہوئی؟'' انشو نے پوچھا۔

''ہاں ہوگئی۔'' وجے نے جواب دیا۔

''مبارک ہو!'' انشو بولی۔ جواب میں وجے کچھ نہ کہہ سکا اور خاموش کھڑا رہا۔ اس پر انشو نے کہا۔ ''ارے تم نے میرا شکریہ تک ادا نہیں کیا؟''

''شکریہ؟'' وجے بڑبڑا کے رہ گیا۔

''کیا بات ہے؟ تم ٹھیک تو ہو؟'' دوسری طرف سے انشو نے سوال کیا۔ شاید اُس نے وجے کی سنجیدگی کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ اسی لئے خود بھی سنجیدہ ہوگئی تھی۔ اُس نے وجے سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں اپنے گھر والوں سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوئی؟''

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وجے نے جواب دیا۔

''تمہارے گھر والے اچھے تو ہیں نا؟''

''ہاں ٹھیک ہیں۔''

''وجے!'' انشو پھر چہکی۔ ''تمہیں ایک بڑی خوشخبری سناؤں؟''

''سناؤ!'' وجے کا دل اُس کی باتوں میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ کچھ پریشان اور بیزار سا تھا۔ اس کے باوجود وہ انشو کی جانب سے ''خوشخبری'' سننے کو تیار ہوگیا۔

''میں نے اپنے ڈیڈی اور ممی کو تمہارے لئے راضی کر لیا ہے۔'' انشو نے اچانک انکشاف کر دیا۔

وجے کے لئے یہ انکشاف موجودہ حالات میں کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ اُس نے حیرت ظاہر کی۔ ''اچھا؟'' اُس کے دل میں جاگزیں شک کا آتش فشاں پھٹ رہا تھا۔ اُس نے اسی لئے کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ پہلے وہ اپنا شک دُور کر لینے کا خواہشمند تھا۔

''ہاں۔'' انشو کی آواز سے بدستور خوشی ظاہر ہو رہی تھی۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''جس دن ڈیڈی تم سے مل کر آئے، بس اُسی دن سے میں نے بھوک ہڑتال کر دی تھی، کھانا پینا سب بند! میں دن رات اپنے کمرے میں پڑی آنسو بہاتی رہتی تھی۔ آخر ممی ڈیڈی نے شکست تسلیم کر لی اور وہ میری خوشی کے لئے مان گئے۔ ڈیڈی نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ دہلی سے تمہارے آتے ہی دو چار دن میں ہماری منگنی کریں گے تاکہ وشال کے بارے میں ان کے ملنے جلنے والوں، دوستوں، عزیزوں

اور رشتے داروں کے ذہن صاف ہو جائیں۔ سب کو معلوم ہو جائے کہ میرے ہونے والے پتی تم ہو، وشال نہیں ہے۔ اپنے بہت سے دوستوں کو انہوں نے ہونے والی اس منگنی کے بارے میں بتا بھی دیا ہے۔ وجے! اس وقت میں اپنے ہی بنگلے سے تمہیں فون کر رہی ہوں۔ اچھی طرح جان لو کہ اب ہمارے ملنے جلنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔"

انشو کی آواز سے یوں لگ رہا تھا کہ وہ خوشی سے بے قابو ہو رہی ہے۔ اُس کا دل جیسے چاہ رہا تھا، ساری دنیا کو چیخ چیخ کر بتا دے، عشق میں وہ کامیاب ہو گئی ہے۔ وہ فون پر کہہ رہی تھی۔ "وجے! میں کس قدر خوش نصیب ہوں...... میری خوشی کی کوئی حد نہیں ہے۔ مجھے میری زندگی نے سب کچھ دے دیا ہے اور تمہیں بھی...... ہے نا وجے؟"

"انشو!" وجے نے اُس کی بات کا جواب دیئے بغیر کہا۔ "میں تم سے ملنا چاہتا ہوں، ابھی فوراً۔"

"ارے اگر تم نہ بھی بلاتے تب بھی میں اُڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاتی۔" انشو سرشاری کے عالم میں کہنے لگی۔

"میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" وجے کا لہجہ بے حد گمبھیر تھا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں اُس کے ساتھ انشو کے سپنوں کا محل بھی گر کر چکنا چور نہ ہو جائے۔

"آل رائٹ ڈارلنگ، آل رائٹ! بس میں فوراً روانہ ہو کر فوراً پہنچ رہی ہوں۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی انشو کی طرف سے سلسلہ منقطع ہو گیا۔

وجے نے بھی ریسیور کو کریڈل پر رکھ دیا۔ اب اُسے انشو کے آنے کا انتظار کرنا تھا۔ بے چینی اور اضطراب نے اُسے بیٹھنے نہ دیا اور وہ اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر واقعی انشو کے دائیں بازو پر سیاہ تل موجود ہوا تو کیا ہوگا؟ یہ سوچ اُس کے لئے انتہائی اذیت ناک تھی۔ اُس کا وجود جیسے کسی نادیدہ آگ کی زد پر تھا جس کی تپش اُسے محسوس ہو رہی تھی۔ میں انشو سے کس طرح کہوں گا کہ ذرا اپنا دایاں بازو کھول کر تو دکھاؤ؟ اُس کے ذہن پر سوالوں نے گویا یلغار کر دی تھی۔ اس پر انشو برا مان گئی تو؟ وہ پوچھ سکتی ہے کہ میں اس کا بازو کیوں دیکھنا چاہتا ہوں؟ ایسی صورت میں میرا کیا جواب ہوگا؟ انشو مجھے گھٹیا اور عامیانہ طرزِ فکر رکھنے والا بھی تو سمجھ سکتی ہے...... مگر کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں ہے۔ اُسے ہر حالت میں اپنا شک دُور کرنا تھا۔ حالانکہ اُسے اچھی طرح

یاد تھا کہ اُس نے پکنک کے دوران انشو کے دائیں بازو پر گہرا سیاہ تل دیکھا تھا، پھر بھی وہ خود کو تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے یہ بھی سوچا کہ میں انشو سے صاف صاف بات کر لوں گا۔ ایسی صورت میں وجے کو یہ خوف تھا کہ اگر واقعی انشو اُس کی بہن نکلی تو وہ خودکشی کر لے گی۔ انشو جیسی خود دار لڑکی اس ہولناک حقیقت کے بعد زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اگر انشو اس دنیا میں نہ رہی تو پھر وہ کس طرح جی سکے گا؟ اُس کے لئے تو زندگی مسلسل عذاب بن کے رہ جائے گی۔ اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ انشو کی خودکشی کے بعد خود وجے بھی زندگی سے بیزار ہو جاتا اور وہ بھی زندہ نہ رہتا۔

کچھ ہی دیر بعد انشو آ گئی۔ وہ وجے کے گھر کے دروازے سے جب اندر داخل ہوئی تو وجے کچھ دُور کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔ اُس کا دل پھر ایک بار کسی انجانے خوف سے تیزی کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ اُس کے دل کی ہر دھڑکن جیسے کہہ رہی تھی، یہ سورن لتا ہرگز نہیں، انشو ہے۔

وجے کو دیکھ کر انشو کے چہرے پر گویا خوشی کے رنگ بکھر گئے۔ خود بخود اُس کے خوبصورت ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ خوشی سے اُس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا۔ جواب میں وجے کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ بھی نہ آ سکی۔ وجے کے چہرے پر گہری سنجیدگی بلکہ اُداسی تھی۔

"تم مجھے کچھ تھکے تھکے سے لگ رہے ہو وجے!" انشو نے فکر مندی کے ساتھ کہا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں تھکن...... تھکن تو ہے۔ ٹرین کا سفر کر کے میں آج ہی تو آیا ہوں۔" وجے نے بات بنا دی۔

"تمہیں اپنے گھر والوں سے مل کر خوشی تو ہوئی؟"

"بہت زیادہ۔" وجے کا لہجہ الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

"ان لوگوں کو بھی خوشی ملی ہوگی؟" انشو بولی۔

"ہاں بہت خوش تھے وہ۔"

"پھر بھی تم اس قدر بجھے بجھے سے کیوں ہو وجے؟" انشو نے پوچھ ہی لیا۔

"وہاں جا کر معلوم ہوا میرے پتا جی کو مرے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے اور......"

"اوہ!" انشو بھی سنجیدہ نظر آنے لگی۔ "یہ تو بڑے دُکھ کی بات ہے...... اور ماں جی؟"

"وہ ٹھیک ہیں۔" وجے نے جواب دیا۔ "میرے غم میں رو رو کر وہ بھی بیمار ہو چکی تھیں، لیکن اب بہتر ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وجے نے انشو کو غور سے دیکھا۔

انشو نے وجے کے رویے میں تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس عجیب رویے کی آخر وجہ کیا ہے؟ وجے کی آنکھوں میں محبت کی جگہ پریشانی اور اُلجھن دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سوچ کر آئی تھی کہ منگنی کی خبر سن کر وجے خوشی سے کھل اُٹھے گا۔ اس کے برعکس وہ اُداس نظر آ رہا تھا۔ ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے، انشو نے سوچا۔ وہ بات کیا تھی؟ اس کا انشو کو پتہ چلانا تھا۔ دونوں کافی دیر تک خاموش کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

"بیٹھو۔" معاً وجے بول اُٹھا۔

"پہلے تم بیٹھو!" انشو نے جواباً کہا۔

"تم بیٹھو تو سہی، میں تمہارے لئے چائے بنا کر لاتا ہوں۔" وجے کہنے لگا۔

"نہیں۔ تم ایک لمبے اور تھکا دینے والے سفر سے لوٹ کر آئے ہو، چائے میں بناؤں گی۔ ویسے بھی اب یہ فرض مجھ ہی کو ادا کرنا ہے۔" انشو مسکرا کر بولی۔

وجے پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔ انشو خوشی خوشی کچن میں چلی گئی اور چائے بنانے لگی۔ اُس نے دو ایک بار مڑ کر بھی دیکھا شاید وجے اُس کے پیچھے کچن میں چلا آئے، مگر ایسا نہ ہوا۔ وہ تو اپنی سوچوں میں گم صوفے پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔

آخر وجے کو کیا غم ہے؟" انشو نے سوچا۔ ممکن ہے میری ڈیڈی نے اس کی جو توہین کی تھی، اسے اس کا افسوس ہو یا پھر کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ وہ سوچتی رہی۔ اسی دوران چائے تیار ہو گئی۔ وہ دو پیالوں میں چائے نکال کر اور انہیں ایک ٹرے میں رکھ کے وجے کے پاس آ گئی۔ ٹرے اُس نے میز پر رکھ دی۔ یہی وہ لمحات تھے کہ جب اُس کی ساڑھی کا پلو سرک گیا۔ وجے کے سامنے بازو پر موجود وہ گہرا اور نمایاں سیاہ تل آ گیا جو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ تل خاصا بڑا، واضح اور چمکدار تھا۔ ماں جی نے اس کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، تل بالکل ویسا ہی تھا۔

اب کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی۔ وجے کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اُس کا

سانس رُکنے لگا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اُس کا جی چاہا کہ چیخ چیخ کر ساری دنیا کو بتا دے، یہ غلط ہے، یہ جھوٹ ہے! انشو اور سورن لتا دو الگ الگ وجود ہیں جو کسی صورت میں ایک نہیں ہو سکتے۔ اُس کا دل اس "حقیقت" کو ماننے پر آمادہ نہیں تھا۔ اگر میرا دل انشو کو سورن لتا نہیں مانتا تو اس کی کوئی نہ کوئی تو وجہ ہو گی۔

انشو کے بازو کا وہ سیاہ تل وجے کو کوئی ایسا خوفناک ناگ لگ رہا تھا جس نے اُس کی ساری خوشیوں کو ڈس لیا تھا، اُس کے دل کی دنیا اُجاڑ دی گئی تھی، اُس کی آرزوؤں اور اُمنگوں کا تاج محل گرا دیا گیا تھا۔ اُس کے اندر سے جیسے کسی نے کہا، اس سیاہ تل کو نوچ کر پھینک دے، مگر وہ اپنے اندر کی آواز پر عمل نہ کر سکا۔ اس حقیقت کو بدلنا ممکن نہیں، وجے کو اس کا احساس تھا۔

اچانک اپنی بے بسی پر وجے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ خود کو سنبھالنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"وجے......! کیا ہوا وجے؟" انشو اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تڑپ اُٹھی۔

انشو نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر وجے کے آنسو پونچھنا چاہے مگر وجے نے اُس کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے پیٹھ موڑ لی۔

انشو حیران تھی۔ اُس نے ایک مرتبہ پھر وجے کو مخاطب کیا۔ "وجے..... مجھے بھی تو بتاؤ کیا بات ہے؟ کیا تم مجھ سے بھی اپنا دُکھ نہیں کہو گے؟" انشو کی آواز میں عاجزی تھی۔ "تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں؟"

وجے کسی سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ تو اب انشو سے نظریں ملاتے ہوئے شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ پھر وہ اپنے دل کی بات اُسے کس طرح بتاتا؟ اگر وہ ایسا کرتا تو اس کے ساتھ انشو کی زندگی بھی برباد ہو جاتی۔ وجے جانتا تھا کہ انشو اس سے اتنا پیار کرتی ہے کہ حقیقت حال جاننے کے بعد اس کا دماغی توازن بگڑ جاتا۔ وہ پاگل ہو سکتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس خبر کے صدمے سے اس کے دل کی دھڑکن رُک جاتی۔

وجے سوچ رہا تھا، آج جبکہ اس کی محبت کے راستے میں کوئی رُکاوٹ نہیں رہی تھی، جب وہ دونوں اپنی منزل کے قریب کھڑے تھے تو قسمت نے ان کے درمیان ایک گہری خلیج حائل کر دی تھی، اتنی گہری خلیج کہ وجے اپنی تمام تر کوششوں اور عزائم کے

باوجود اسے عبور نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کے دل کا درد اور بڑھ گیا۔ درد کی شدت میں اتنا اضافہ ہوا کہ وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹنے لگا۔

انشو اُٹھ کر اُس کے قریب آئی اور دھیرے سے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''میرے ہاتھ کی چائے نہیں پیو گے، اپنی ہونے والی پتنی کے ہاتھ کی!''

''انشو پلیز!'' یکایک وجے چیخ اٹھا۔

''وجے! مجھ سے کیا غلطی ہوگئی ہے؟'' انشو نے حیرت سے کہا۔

وجے نے زبان سے کچھ بھی نہ کہا البتہ سر کی جنبش سے انکار کر دیا۔ اُس کا دل پھٹا جا رہا تھا اور زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ایسی کسی کیفیت سے وجے زندگی میں پہلی بار آشنا ہوا تھا۔ چندانی کے گروہ میں رہ کر اُس نے بڑے بڑے معرکے سر کئے تھے لیکن اس وقت وہ خود کو قطعی مجبور و بے بس محسوس کر رہا تھا۔ ایسی بے بسی سے اُسے پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا کہ بولنے سے بھی قاصر تھا۔

انکار کا اشارہ سمجھ کر انشو نے کہا۔ ''تو پھر کیا بات ہے؟'' انشو اُس کے سامنے آ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں پیار بھرا غصہ تھا۔ اُس نے اپنے غصے کو چھپایا نہیں اور اس کا اظہار کر دیا۔ ''آخر تم کچھ بتاتے کیوں نہیں؟ میں تمہاری ہونے والی جیون ساتھی ہوں۔ کیا مجھے اس ناتے سے یہ پوچھنے کا حق بھی نہیں؟''

''انشو!'' وجے بلند آواز میں بولا، مگر آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

''کیا میرا تمہارا کوئی رشتہ، کوئی تعلق نہیں؟'' انشو نے تڑپ کر سوال کیا۔

''تعلق ہے! تمہارا میرا بڑا گہرا تعلق ہے۔'' وجے نے جب یہ الفاظ ادا کئے تو لہجے میں بڑا دُکھ تھا۔ ''تم سے بڑھ کر اس دنیا میں میرے لئے کوئی اور نہیں لیکن......'' وجے کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جو بات اُسے معلوم ہوئی ہے، وہ انشو کو کس طرح بتائے؟

''لیکن......؟ لیکن کیا؟'' انشو نے پوچھا۔

معاً انتہائی مایوسی کے اندھیرے میں وجے کو اُمید کی ایک روشن کرن دکھائی دی۔ اُس نے اسی اُمید کی بناء پر سوچا، شاید میں نے غلط نتیجہ اخذ کیا ہے۔ وجے نے اس احساس کے ساتھ ہی خود کو سنبھالا اور انشو سے مخاطب ہوا۔ ''انشو! میں کل ہی تمہارے

ڈیڈی سے اُن کے دفتر جا کر ملوں گا۔ اُن کی اور میری اس ملاقات میں کسی تیسرے فرد کو نہیں ہونا چاہئے۔ مجھے کل تک کا وقت دے دو پلیز!'' وجے نے ملتجی آواز میں یہ کہتے ہوئے انشو کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

انشو کی سمجھ میں نہ تو وجے کا رویہ آ سکا اور نہ وہ وجے کے دُکھ کا سبب جان سکی۔ اُس نے وجے کے رویے میں اچانک ہی تبدیلی محسوس کی تھی۔ سختی کے بجائے اب اُس کا رویہ عاجزانہ تھا۔ ایسا کیوں ہوا؟ انشو اس سلسلے میں کوئی اندازہ لگانے سے قاصر تھی۔ آخر وجے کل تک کا وقت کیوں مانگ رہا ہے؟ وہ ڈیڈی سے تنہائی میں کس لئے ملنا چاہتا ہے؟ ایسی کیا بات ہے جو وجے اُس کے سامنے بھی نہیں کر سکتا؟ انشو یہ سب سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہی، لیکن بالآخر اُسے کچھ جانے بغیر ہی وجے کے گھر سے واپس جانا پڑا۔

جب انشو چلی گئی تو وجے خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ تقدیر نے اُس کے ساتھ بڑا بھیانک مذاق کیا تھا۔ وہ اپنا سر دیوار سے ٹکرانے لگا۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسی طرح دیواروں سے سر ٹکرا کر وہ جان دے دے، مگر اُمید کی جو کرن کچھ دیر قبل اُسے دکھائی دی تھی، اس کے سبب وہ ایسا کرنے سے رُک گیا۔ کیا خبر اُمید کی یہ کرن میرے لئے نشانِ منزل بن جائے! اُس نے سوچا۔

وجے فیصلہ کر چکا تھا کہ رائے صاحب سے ضرور ملے گا۔ ہو سکتا ہے انشو، رائے صاحب ہی کی بیٹی ہو، ان کی اپنی اور اصل بیٹی! ضروری نہیں کہ صرف سورن لتا کی زلفیں ہی سنہری ہوں، اس کی آنکھوں کی رنگت سنہری مائل ہو، اس کے دائیں بازو پر سیاہ تل کا واضح نشان ہو، اسی کی پلکیں بوجھل اور بھاری ہوں۔ کسی اور لڑکی میں بھی تو یہ خصوصیات ہو سکتی ہیں! وہ اس اُمید کی ڈور سے بندھا مستقبل کے لئے اچھے اچھے خواب بنتا رہا۔ ان خوابوں کی ملکہ انشو تھی۔

اُس رات انشو کو بھی بہت دیر تک نیند نہ آ سکی۔ وہ اپنے محبوب اور ہونے والے شوہر وجے کا درد بانٹ لینا چاہتی تھی۔ وجے کے دُکھ کو اپنا دُکھ بنا لینے کی اُسے آرزو تھی۔ اُس کی خواہش تھی کہ وجے کے سارے دُکھ، تمام کرب اُسے مل جائیں اور وجے ہر وقت خوش رہے، کوئی دُکھ اُس کے قریب بھی نہ پھٹکے۔ وجے کی حالت یاد کر کے وہ

بار بار تڑپ رہی تھی۔ وجے کا دُکھ، اُس کے آنسو انشو کی برداشت سے یقیناً باہر تھے۔

انشو سوچنے لگی، ہوسکتا ہے کہ وجے کے گھر والوں نے اُسے بیٹا تسلیم نہ کیا ہو، اُسے فریبی جان کر گھر سے نکال دیا ہو! وجے کی پریشانی کا سبب ضرور اُس کے گھر سے ہے۔ اپنے لوگوں کے رویے ہی نے اُسے دُکھی کیا ہے۔ سوچتے سوچتے انشو کی پلکیں بھیگ گئیں۔



دوسرے دن وجے رائے صاحب سے ملنے اُن کے دفتر پہنچا تو اُس کا دل بوجھل تھا۔ رات بھر تڑپنے، جاگنے اور روتے رہنے کی وجہ سے وجے کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اُس نے گزشتہ رات بڑے کرب کے عالم میں گزاری تھی۔ اُس کی آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ رائے صاحب اُسی کے منتظر تھے۔ انشو اُنہیں وجے کی پریشانی کے بارے میں بتا چکی تھی۔ اُس نے بتایا تھا کہ وجے، رائے صاحب سے ملنے ان کے دفتر آئے گا۔

وجے کی آمد پر رائے صاحب نے بڑی خوش دلی سے اُس کا استقبال کیا اور اس سے بیٹھنے کو کہا۔ وجے کا سنجیدہ اور اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر رائے صاحب کے دل پر چوٹ سی لگی۔ وجے کی خوشی، انشو کی خوشی اور انشو کو خوش دیکھنا اُن کی زندگی کا حاصل تھا۔

''بات کیا ہے بیٹا؟'' رائے صاحب نے بڑے پیار سے وجے کو مخاطب کیا۔ ''انشو کہہ رہی تھی کہ تم بہت پریشان ہو!''

''جی ہاں۔'' وجے نے اقرار کیا۔ ''اسی سبب میں آپ سے ایک اہم سوال کرنے آیا ہوں، اگر آپ اجازت دیں تو۔''

''ضرور ضرور بیٹا، تمہیں اجازت ہے۔'' رائے صاحب فوراً بولے۔ ''پوچھو، تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ اس میں اتنے ہچکچانے کی کیا بات ہے؟ اگر تمہارے سوال کا جواب میرے پاس ہوا تو تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔'' رائے صاحب نے اپنا سگار ایش ٹرے سے اُٹھایا اور کرسی کی پشت سے ٹک گئے۔

''جی میں..... وہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں.....'' وجے اپنے دل کی بات کہنے کے لئے ہمت کرنے لگا۔ اُس نے گہرا سانس لیا، پھر رائے صاحب کے چہرے کی طرف دیکھتے

ہوئے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''کیا انشو آپ کی بیٹی ہے؟''

اُمید کی یہی وہ کرن تھی جو مایوسی کے اندھیرے میں وجے کو نظر آئی تھی۔ اگر انشو رائے صاحب کی بیٹی ہوتی تو سورن لتا اور انشو کے درمیان ایک واضح لکیر کھنچ جاتی۔ رائے صاحب جو سگار کا کش لینے والے تھے، وجے کا سوال سن کر چونک اُٹھے۔ انہیں وجے سے کسی ایسے سوال کی توقع ہرگز نہیں تھی۔''

''ہاں وہ میری بیٹی ہے۔'' چند لمحے رُک کر رائے صاحب ناگوار لہجے میں بولے۔ ''کیوں؟ کیا تمہیں اس پر کوئی شک ہے؟''

''دیکھئے رائے صاحب!'' وجے اپنے دل کی تسلی کے لئے ہر بات صاف صاف کرنا ضروری سمجھ رہا تھا۔ اُس نے بڑے عاجزانہ لہجے میں اپنی بات جاری رکھی۔ ''آپ مجھ سے..... کم از کم مجھ سے یہ بات نہ چھپائیے، ورنہ ایک طوفان آ جائے گا، ایک بہت بڑا المیہ ہو جائے گا۔ ایک ایسا گناہ ہو جائے گا جس کا کفارہ نہ میں ادا کرسکوں گا نہ آپ۔ رائے صاحب! آپ کو بتانا ہی پڑے گا کہ انشو کون ہے۔ پلیز! میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں، مجھے حقیقت سے آگاہ کر دیں۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ مجھے پورا یقین ہے، انشو آپ کی بیٹی نہیں ہے۔''

رائے صاحب نے چند لمحے خاموش رہ کر وجے کا بغور جائزہ لیا۔ وہ وجے کی فکر و تشویش کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پہلی بار جب یہ لڑکا مجھ سے ملا تھا تو کس قدر بے پرواہ اور مطمئن تھا! اپنے پیار پر اُسے کتنا بھروسہ تھا۔ مگر دہلی سے واپس آنے کے بعد یہ اس قدر پریشان ہے۔ بچپن میں یہ اپنے ماں باپ سے بچھڑ گیا تھا اور اب ملا ہے تو خوش ہونے کی بجائے پریشان ہے، لیکن اسے انشو پر یہ شک کیوں ہوا کہ وہ میری بیٹی نہیں ہے؟ آخر کیوں؟

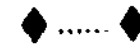
''رائے صاحب!'' وجے نے انہیں خاموش دیکھ کر آہستگی سے کہا۔ ''بچپن میں دیوان چند نے صرف مجھ ہی کو نہیں بلکہ میری بہن کو بھی اغواء کیا تھا۔ اُس وقت وہ محض دو سال کی تھی۔ اس لڑکی کی شناخت کی سبھی علامات انشو میں موجود ہیں۔''

وجے سے یہ سن کر رائے صاحب تقریباً اُچھل پڑے۔ انہیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ قسمت کسی کے ساتھ اس قدر بھیانک مذاق بھی کرسکتی

ہے؟ وجے کے دل کی کیفیت کا انہیں بخوبی اندازہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے اب کوئی بات بھی چھپانا مناسب نہ سمجھا۔ ایسا نہ ہو کہ انجانے میں کوئی بڑا گناہ ہو جائے! ایک گہرا سانس لے کر وہ اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کے دفتر میں ایک بوڑھی عورت کی تصویر خوبصورت فریم میں لگی ہوئی تھی۔ تصویر پر پھولوں کا ہار پڑا ہوا تھا۔ رائے صاحب نے اس تصویر پر نگاہ ڈالی۔

''یہ تصویر دیکھ رہے ہو!'' رائے صاحب نے وجے کو مخاطب کیا۔ ''یہ میری سورگ باشی ماں کی تصویر ہے۔ یہ اپنی بہو، یعنی میری بیوی سے بے حد پیار کرتی تھیں۔ شادی کے ایک سال بعد جب میرے باپ بننے کا موقع آیا تو ہسپتال میں میری بیوی کی طبیعت خراب ہوگئی۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ ماں یا بچے میں سے کسی ایک کی جان بچائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ بچے کو ماں کی خاطر قربان کر دیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد جب میری بیوی کی حالت بہتر ہوئی تو اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے بچی پیدا ہوئی تھی جو بچ نہ سکی۔ اس سے میری بیوی کو بہت صدمہ پہنچا، مگر اُس نے دھیرے دھیرے خود کو سنبھال لیا۔ اس کے بعد سات سال تک میری بیوی کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ میں نے اُس کا ہر علاج کرایا، پیسہ پانی کی طرح بہایا مگر کچھ نہ ہوا۔ پھر ایک پنڈت جی نے میری ماں کو مشورہ دیا کہ وہ بہو کو ساتھ لے کر تیرتھ یاترا پر جائیں، ہوسکتا ہے بھگوان کو ان پر رحم آ جائے۔ یہ لگ بھگ اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے۔ کئی مقدس مقامات کی یاترا کے بعد میری ماں اور بیوی ایک روز بنارس پہنچیں۔''

وجے کے ذہن میں یہ سن کر چھناکا سا ہوا۔ دیوان چند بھی تو اٹھارہ برس پہلے ہی اُسے اور اُس کی بہن کو اغواء کر کے بنارس پہنچا تھا۔ وجے کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ اُسے یوں لگا جیسے اُس کا سانس رُکنے لگا ہو......!



رائے صاحب کو اس بات کا قطعی احساس نہیں ہو سکا کہ اُن کے بیان سے وجے پر کیا گزر رہی ہے! اُن کے چہرے سے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ماضی کی یادوں میں گم بولے جا رہے ہوں۔ ان کی نظریں بھی وجے پر نہیں تھیں۔

''ایک دن میری ماں جی اور بیوی، دونوں صبح کے وقت دشاشومیگھ گھاٹ پر پہنچیں۔'' رائے صاحب کہہ رہے تھے۔ ''دونوں ساس بہو وہاں پوتر ہونے کی غرض سے اشنان کرنے گئی تھیں۔ اس وقت گھاٹ پر لوگوں کا خاصا ہجوم تھا۔ عورت، مرد، جوان، بوڑھے اور بچے سبھی پورے اہتمام کے ساتھ گنگا جی میں نہانے جا رہے تھے۔ اچانک اسی اثناء میں ایک طرف سے شور سا اُٹھا۔ یکایک لوگوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ پھر کچھ لوگ ایک دوسرے کو دھکے دینے لگے۔ اسی عرصے میں پولیس کی سیٹی بھی سنائی دی۔ وہ شاید کسی مجرم کا پیچھا کر رہی تھی۔ یہی وہ لمحات تھے جب میری بیوی اور ماں جی کو روتی ہوئی ایک بچی ملی۔ اُس بچی کی عمر مشکل سے دو سال ہوگی۔ غالباً وہ اپنے ماں باپ سے بچھڑ گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ خود بچی یہ بتانے کی اہل نہیں تھی کہ اُس پر کیا گزری ہے!''

''اُس...... بچی کا حلیہ...... آپ کو اُس کا حلیہ معلوم ہے؟'' وجے بول اُٹھا۔

''وہ بھی بتا دوں گا۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ پوری بات سن لو۔'' رائے صاحب نے جواب دیا۔ پھر وہ چند لمحے توقف کے بعد کہنے لگے۔ ''اس بچی کو دیکھ کر میری بیوی کی سوئی ہوئی ممتا جاگ اُٹھی۔ میری بیوی نے اس بچی کو گود میں اٹھا کر سینے سے چمٹا لیا۔ بچی اس طرح میری بیوی سے لپٹ گئی جیسے اُسے کسی کا خوف ہو۔ میری ماں جی نے بھی اپنی بہو کی اندرونی کیفیت اور خوشی بھانپ لی تھی۔ انہوں نے سوچا، ہوسکتا ہے بھگوان ان دونوں کو اسی لئے یہاں لایا ہو کہ بچی بھگوان کے تحفے کے روپ میں انہیں مل جائے۔ شاید...... ایسا تھا بھی!''

پھر رائے صاحب نے جو بقیہ واقعات بیان کیے، ان کا خلاصہ یہ تھا۔

پولیس سیٹیاں بجاتی ہوئی ہجوم میں گھس آئی اور ایک ایک یاتری کو دیکھنے لگی۔ اُس کی توجہ کا مرکز مرد یاتری تھے جن کے ساتھ چھوٹے بچے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پولیس کو اُس کا مطلوبہ مجرم نہیں مل سکا۔ رائے صاحب کی بیوی نے اس بچی کو گود میں لے رکھا تھا۔ بچی اس طرح ان سے چمٹی ہوئی تھی کہ کوئی دیکھنے والا اسے اُسی کی اولاد سمجھتا۔ غالباً اسی بناء پر پولیس نے اس پر دھیان نہیں دیا۔ پولیس والے اپنے مطلوبہ مجرم کی تلاش میں اس جگہ سے آگے نکل گئے۔ رائے صاحب کی ماں اور بیوی نے اس ''تحفے'' کو سنبھالا اور بڑی عجلت میں واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

شروع شروع میں بڑی کوشش کی گئی کہ بچی کی زبان سے کوئی ایسا لفظ نکل جائے جو اس کے ماضی سے پردہ اٹھا سکے۔ کسی بھی صورت یہ پتہ چل جائے کہ اس بچی کے ماں باپ کون ہیں! مگر ظاہر ہے اتنی سی بچی بھلا کیا بتا سکتی تھی۔ رائے صاحب اور ان کے گھر والے کچھ بھی نہ جان پائے کہ وہ بچی کون ہے۔ اپنی توتلی زبان میں وہ صرف ''بے بی'' کہہ دیتی تھی۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

وجے کو یاد آیا، اُس کی ماں اوما دیوی بھی تو سورن لتا کو ''بے بی'' ہی کہہ رہی تھی، لیکن وہ درمیان میں کچھ بولا نہیں۔ رائے صاحب کا بیان جاری رہا۔ ''بعد میں ہم نے بنارس کے ایک گھاٹ سے ملنے والی اُس بچی کا نام انشو رکھ دیا۔''

''نہیں!'' وجے بے اختیار کہنے لگا۔ اُسے اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا تھا۔ بات جیسے جیسے آگے بڑھتی جا رہی تھی، یہی واضح ہو رہا تھا کہ سورن لتا اور انشو ایک ہی ہیں۔ وہ بڑبڑانے لگا۔ ''اگر...... اگر ایسا ہے تو پھر میرا دل انشو اور سورن لتا کو ایک ماننے پر کیوں آمادہ نہیں؟''

''کیا ہوا وجے......؟ تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟'' رائے صاحب نے اُس کے چہرے کی اُڑی ہوئی رنگت کا جائزہ لیا اور پوچھا۔

''نن...... نہیں...... کچھ بھی نہیں، آپ اپنی بات پوری کریں۔'' وجے بولا۔

''خیر...... اُس وقت سے انشو ہمارے ساتھ ہے۔'' رائے صاحب بتانے لگے۔

''بے شک وہ ہمارا خون نہیں ہے، مگر ہم نے اسے اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر چاہا ہے،

اسے پیار دیا ہے، ایسا پیار جو شاید اس کے ماں باپ بھی اسے نہیں دے سکتے تھے۔ ہم نے اس کی خوشی کے لئے ہر قربانی دی، اس کی ہر ضد کے آگے سر جھکا دیا، اس کے ناز و نعم میں کوئی کمی نہیں کی۔ دیکھ لو، ہم نے اُس کی مرضی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور تم سے اُس کی شادی پر راضی ہو گئے۔ ہم انشو کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتے۔ اُس نے یہاں...... اس شہر میں تمہاری غیر موجودگی میں کھانا پینا بند کیا تو ہمارے کلیجے کٹ گئے۔ بہرحال ہماری تم سے درخواست ہے، انشو کو کبھی یہ مت بتانا کہ وہ ہماری بیٹی نہیں ہے ورنہ اس کے اور ہمارے پیار کے بیچ ایک دیوار کھڑی ہو جائے گی۔'' یہ کہہ کر رائے صاحب رُکے اور کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد بولے۔ ''کہیں حقیقت میں انشو تمہاری بہن تو نہیں؟''

وجے کے پاس شاید رائے صاحب کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ رائے صاحب کی میز پر سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رو رہا تھا۔ اُس کی اُمیدوں کا وہ آخری اور ٹمٹماتا ہوا تارا بھی ڈوب گیا تھا جو اُس نے وقت و حالات کی گردشوں سے گزرتے ہوئے سیاہ بادلوں کے درمیان دیکھا تھا۔ اُس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ بار بار اُس کے ذہن میں انتہائی مایوسی کے سبب خودکشی کا خیال آ رہا تھا۔ کیا رکھا ہے اس جیون میں جو محبت کے بغیر ہو! وہ سوچتا، زہر کھا لوں، پھر ٹرین کے نیچے آ کر مر جانے کو ترجیح دیتا۔ رفتہ رفتہ اُس کے دل و دماغ پر جنون سا طاری ہونے لگا تھا۔ اُس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ ایسا کس طرح ہو گیا؟ تقدیر نے میرے ساتھ اس قدر سنگین مذاق کس لئے کیا؟

رائے صاحب وجے کے قریب آ گئے۔ وجے کی حالت دیکھ کر وہ سب کچھ سمجھ گئے تھے۔ انہیں وجے پر ترس بھی آ رہا تھا اور پیار بھی۔ انہوں نے وجے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا! تمہاری کیفیت دیکھ کر مجھے صورت حال کا اندازہ ہو گیا ہے۔ تم سے میری صرف ایک التجا ہے کہ انشو تو کیا، کسی کو بھی اس حقیقت سے آگاہ مت کرنا......! کچھ باتیں زندگی میں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں اپنے سینے کے اندر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کر دینا پڑتا ہے۔ تم...... تم زندگی بھر اس معاملے میں اپنی زبان بند رکھنا۔ تم جانتے ہو کہ ہم نے انشو کو بڑے پیار اور دلار سے پالا ہے، بالکل اپنی سگی بیٹی سمجھ کر! ہو

سکتا ہے کہ حقیقت کا علم ہو جانے کے بعد وہ زندگی...... اپنی زندگی ختم کر لے...... کسی کو منہ نہ دکھائے...... یوں بھی ایسی حالت میں کون لڑکی ہوگی جو زندہ رہنا پسند کرے گی۔"

وہ خاموش رہا۔ اُس نے اپنی زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہ کیا۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا اور اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ ڈالے۔ اُس نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے چہرہ دوسری جانب پھیر لیا۔ اسی لمحے اُس ایک زوردار ہچکی آئی اور اُس کا پورا جسم ہل کر رہ گیا۔

اس کے بعد وجے نے رائے صاحب سے کچھ کہے بغیر "نمستے" تک نہیں کہا اور تیزی کے ساتھ اُن کے دفتر سے نکل گیا۔

رائے صاحب چپ کھڑے اُسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ انہوں نے وجے کو نہیں روکا، نہ اُس سے مزید کچھ کہا۔

وہ سڑک پر آیا تو اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا ہو۔ اُس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال تھا، اپنی زندگی ختم کر لینے کا خیال۔ اب اُس کے زندہ رہنے کا مقصد ہی کیا بچا تھا! وہ کس لئے زندہ رہتا؟ انجانے میں اُس نے انشو سے محبت کر کے جو گناہ کیا تھا، اس سے نجات کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ موت کو گلے لگا لے۔ اس سے پہلے وجے نے انشو کے ساتھ زندگی گزارنے کے جو خواب دیکھے تھے، انشو کے لئے اُس کے دل میں جس طرح کے جذبات تھے، اس کے بعد وہ اس لڑکی کو اپنی بہن کے روپ میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُس کے نزدیک بہن کا رشتہ بہت نازک اور مقدس تھا۔ ایسی صورت میں انشو کو وہ کیسے بہن کہہ سکتا تھا کہ جب اُس کے ساتھ شادی کی بات بھی چل چکی تھی! وہ مانتا یا نہ مانتا، انشو اُس کی بہن تھی۔ اگر وہ اس حقیقت کو تسلیم بھی نہ کرتا تو کیا فرق پڑ جاتا! حقیقت اپنی جگہ اٹل تھی۔ وہ اس سے نظریں نہیں چرا سکتا تھا۔ ایسا ناممکن تھا۔ ہرچند کہ حقیقت بے حد تلخ، کرب ناک اور ناقابل قبول تھی، مگر دن کو تو دن کہنا ہی پڑتا ہے۔

اپنے دل کے گوشے گوشے میں بسے ہوئے انشو کے پیار سے وہ صرف اس طرح جان چھڑا سکتا تھا کہ دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائے، بصورتِ دیگر اندوہناک ماضی کی یادیں خنجر بن کر اُس کے وجود میں اُترتی رہتیں۔

میں کسی ٹرک کے نیچے آ جاؤں گا۔ اُس نے سوچا، مگر اس طرح تو انشو کو دلی صدمہ ہوگا اور وہ بھی اپنی جان دے دے گی۔

اور تمہاری ماں کا کیا ہوگا؟ اُس کے اندر سے ایک آواز اُبھری۔

"ہاں یہ تو اس ماں کے لئے اور بھی زیادہ دردناک تجربہ ہوگا جو اٹھارہ سال بعد اپنے بیٹے سے ملی ہے۔" وہ جواب میں بڑبڑایا۔

سوچتے سوچتے اُس کی کنپٹیاں درد سے پھٹنے لگیں تو اُس نے خودکشی کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

"میری زندگی پر میری ماں کا بھی انحصار ہے اور انشو کی زندگی کا بھی!" وہ پھر بڑبڑانے لگا۔ "اب انشو کی زندگی کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔ میں...... میں اُس کا بھائی ہوں...... پھر میرا دل...... میرا دل اس بات کو کیوں نہیں مانتا؟"

وہ انتہائی تذبذب، اُلجھن اور پریشانی کے عالم میں مسلسل چلتا رہا اور سوچتا رہا۔ اب مجھے زندہ رہنا ہے، مگر گھٹ گھٹ کر، تڑپ تڑپ کر ایک ایک سانس لینا ہے۔ یہ صدمہ آخر میں کیسے برداشت کر سکوں گا؟ جیتے جی مر جانے کا صدمہ! میں تو ایک چلتی پھرتی لاش بن جاؤں گا!

چلتے چلتے اُس کے قدم خودبخود ایک شراب خانے کی طرف اُٹھنے لگے۔ اُس نے شراب خانے میں یکے بعد دیگرے دو پیگ چڑھائے۔ وہ خود کو جیسے شراب کے نشے میں ڈبو دینا چاہتا تھا۔ جانے کتنے پیگ پی کر اُس کے دل کی تڑپ اور چبھن کچھ کم ہوئی۔ اُسے کسی قدر سکون سا ملا تو اُس نے اپنا سر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

اپنی ایک انجانی بھول کے باعث اُس کا پورا وجود درد بنا ہوا تھا۔ اس درد سے نجات پانے کے لئے وہ اس قدر پی گیا کہ مدہوش ہو کر ایک طرف ڈھے گیا۔ اسٹول پر بیٹھے بیٹھے وہ لڑھکنے والا تھا کہ ایک ویٹر نے اُسے سنبھال لیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

نصف شب کے بعد جب شراب خانے کے بند ہونے کا وقت آ گیا تو مالک نے بیہوش و مدہوش وجے کو دیکھا، اُس نے بیرے کو پانی لانے کے لئے کہا۔ بیرا پانی لے آیا تو اُس نے وجے کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا تو اس نے پورا جگ لے کر وجے کے سر پر اُلٹ دیا۔ وجے نے ایک جھرجھری لے کر آنکھیں کھول

دیں اور پھر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ درد سے اُس کا سر پھٹا جا رہا تھا، مگر دل کی تڑپ ہوش میں آتے ہی پھر اُسے ستانے لگی تھی۔ اُس نے شراب خانے کے مالک سے مزید ایک پیگ کے لئے کہا۔ وہ مان گیا اور ویٹر کو اشارہ کر دیا۔

آخری پیگ اپنے حلق میں اُنڈیلنے کے بعد وہ نشے میں چور لڑکھڑاتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

وجے کے پاس اب انشو کو بھلانے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ انشو کو بھی اُسے ہر صورت میں بھول جانا تھا، ایک بھولا بسرا خواب سمجھ کر! انشو اُسے کس طرح بھول سکتی تھی، اس کی ایک ہی صورت تھی۔ وہ یہ کہ وجے اپنے لئے انشو کے دل میں نفرت پیدا کر دیتا۔ اسی کے ساتھ ساتھ خود اُسے بھی اپنے دل میں انشو کے لئے نفرت کے جذبات پیدا کرنے تھے۔ اپنی محبت کو وہ ہر حال میں نفرت کا روپ دینا چاہتا تھا۔

وہ ابھی اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر تھا کہ اُسے رائے صاحب کی سفید کار نظر آئی جو اُس کے گھر کے سامنے کھمبے سے ذرا فاصلے پر کھڑی تھی۔ وجے کو شک ہوا کہ شاید نشے کے سبب ایسا لگ رہا ہے۔ اُس نے اسی خیال سے کئی بار آنکھیں بند کر کے کھولیں مگر کار اپنی جگہ موجود رہی۔

وہ چند قدم اور آگے بڑھا تو منظر کچھ واضح ہوا۔ کار کے اندر رائے صاحب ہی نہیں انشو بھی بیٹھی ہوئی تھی۔

وجے ٹھٹک گیا، مگر پھر انہیں نظر انداز کر کے اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

انشو لپک کر کار سے اُتری اور آندھی طوفان کی طرح وجے کے قریب آ گئی۔ وجے گھر کا تالا کھولنے لگا تو اُسے مشکل پیش آئی۔ نشے کے سبب اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور وہ چابی، تالے کے سوراخ میں نہیں لگا پا رہا تھا۔ انشو نے اُس کی حالت کا اندازہ لگا لیا۔ قریب آنے کی وجہ سے اُسے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ وجے نے شراب پی رکھی ہے۔ اُس نے اسی بناء پر وجے سے چابی لے کر تالا کھولا اور پھر اُسے سہارا دے کر اندر لے گئی۔

"تم نے شراب پی ہے؟" انشو نے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

"ہاں پی ہے۔" وجے نے اقرار میں سر ہلایا۔

"مگر کیوں؟ کس لئے تم نے شراب پی؟"

"کیوں نہ پیوں!" وجے نے دانستہ چڑچڑے پن کا مظاہرہ کیا۔ "میں نے کیا تمہارے باپ کے پیسے سے شراب پی ہے؟"

"وجے!" انشو چونک اُٹھی۔ اس کے لئے وجے کا یہ لہجہ بالکل نیا اور حیرت انگیز تھا۔ اُسے وجے سے کسی ایسے رویے کی ہرگز اُمید نہیں تھی۔ ذرا سی دیر میں اُس کے باپ تک جا پہنچنا، انشو کے لئے حیران کن تھا۔ پھر بھی اُس نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا اور اپنے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہنے لگی۔ "تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو وجے...؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ اس سے پہلے تو کبھی تم نے ایسی باتیں نہیں کیں، پھر اب...... خیر میں تمہیں فون ملا ملا کر تھک گئی۔ کئی بار تمہارے گھر کے چکر بھی لگائے... ڈیڈی کو بھی ساتھ لے کر آئی لیکن تم نہ ملے اور اب ملے ہو تو۔" یہ کہتے ہوئے انشو نے اُس کا بازو پکڑنا چاہا۔

وجے نے انشو کا ہاتھ جھٹک دیا۔ انشو کے دل پر چوٹ سی لگی۔ پھر بھی وہ برداشت کر گئی اور پیار سے بولی۔ "اس وقت بھی ڈیڈی میرے ساتھ ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ تم نے میرے ساتھ شادی سے انکار کر دیا ہے، مگر مجھے ان کی بات پر یقین نہیں آیا۔ بھلا ایسا کس طرح ہو سکتا ہے کہ تم مجھے ٹھکرا دو؟" انشو نے یہ کہہ کر اپنے خوبصورت ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا لی۔ پھر کہنے لگی۔ "میں ڈیڈی کو لے کر آئی ہوں۔ تم ان سے کہہ دو کہ انہیں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے اور...... اور تم مجھ سے شادی پر آمادہ ہو۔ ہو سکتا ہے، تم نے نشے کی حالت میں ایسی کوئی بات ڈیڈی سے کہہ دی ہو۔ ٹھہرو، میں ابھی ڈیڈی کو یہاں لے کر آتی ہوں۔ وہ باہر کار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔" انشو باہر جانے کے لئے پلٹی۔

وجے نے اُسے آواز دی۔ "رُک جاؤ انشو! باہر جانے کی ضرورت نہیں۔" وہ سمجھ گیا کہ انشو کی ضد کے آگے رائے صاحب مجبور و بے بس ہو گئے تھے، اسی لئے وہ انشو کے ساتھ آ گئے ورنہ تو انہیں سب کچھ معلوم تھا۔ ہاں، انہوں نے انشو کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے وجے نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ رُک رُک کر ادا کئے۔

"ان...... انشو! تمہارے ڈیڈی نے تم سے جو کہا ہے، وہ سچ ہے۔"

"وجے؟" انشو جیسے مجسم سوال بن گئی۔ "کیا کہہ رہے ہو تم؟" اُس کا دل تیزی سے

دھڑکنے لگا، آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ ''نہیں...... ہرگز نہیں!'' وہ زور زور سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''تم...... تم ایسا کبھی نہیں ہونے دو گے۔ اس...... اس لئے کہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ...... کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گی۔ میں...... میں اگر تم سے پیار کرتی ہوں تو تمہیں بھی مجھ سے پیار ہے نا!''

''انشو!'' وجے کی درد بھری آواز اُبھری۔ اُس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ اُس نے بڑی مشکل سے کہا۔ ''تم یہاں سے چلی جاؤ...... فوراً پلیز انشو! یہاں سے چلی جاؤ...... تمہارے اور میرے حق میں یہی بہتر ہے۔'' پھر وہ زور سے چیخا۔ ''چلی جاؤ اور آئندہ کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا...... ہم دونوں کے راستے الگ الگ ہو چکے ہیں۔ تمہارا راستہ الگ ہے، میرا الگ۔'' وجے نے اُس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا اور دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

''میں کہتی ہوں......''

وجے نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''مجھے کچھ نہیں سننا۔ سمجھ لو کہ میں نے تم سے مذاق کیا تھا۔''

''اگر وہ مذاق تھا تو...... تو پھر تمہارے لہجے میں یہ بتاتے ہوئے اتنا دُکھ کیوں ہے؟'' انشو کہنے لگی۔

''تمہارا خیال ہے...... وہم ہے یہ! ورنہ تو میرا پیار محض ایک ناٹک تھا...... ڈرامہ تھا وہ! میں نے تمہیں دھوکا دیا تھا انشو!''

''یہ نہیں ہو سکتا۔'' انشو نے زور دے کر کہا۔ ''میں نہیں مان سکتی کہ تم مجھے دھوکا دے سکتے ہو۔ ایسا مت کہو وجے...... پلیز!'' یہ کہتے ہوئے انشو کی آواز بھرا گئی اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ وجے کے بالکل سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور التجائیہ لہجے میں بولی۔ ''وجے! میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں، پلیز ایسا مت کہو...... میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں دیکھو۔''

''انشو!'' وجے بول اٹھا۔ ''میری بات کا یقین کرو، میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' وجے کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ ''یقین کرو، ہماری منزل ایک نہیں ہے۔ ہم دونوں الگ الگ راستوں کے مسافر ہیں۔'' وجے کہنے کو تو یہ سب کچھ کہہ رہا تھا مگر اُسے درد کی شدت

محسوس ہو رہی تھی۔ انشو کی حالت اُس سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ ان آنکھوں میں اُس نے آنسوؤں کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

''نہیں!'' اس بار انشو بولی تو اُس کی آواز میں سختی تھی۔ وہ بڑی دیر سے وجے کی دل دُکھانے والی باتیں سن رہی تھی۔ مگر اب یہ معاملہ اُس کی برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ اُس نے تڑپ کر قہر آلود لہجے میں پوچھا۔ ''اگر ہمارے راستے الگ الگ تھے تو پھر تمہیں میرے راستے میں آنے کا حق کس نے دیا تھا......؟ تم نے میری خوشگوار اور مطمئن زندگی میں ہلچل کیوں مچائی؟ میری زندگی میں تم نے زہر کیوں گھولا؟ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ تم نے مجھ سے مذاق کیا تھا... دھوکا دیا تھا مجھے! تم میرے ارمانوں سے کیوں کھیلتے رہے؟ کس لئے؟''

''سنو انشو!'' وجے بہ مشکل بولا۔ ''اس...... اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں جگل پرشاد کا بیٹا ہوں، دہلی کے ایک بہت بڑے سیٹھ کا بیٹا!''

''سیٹھ؟'' انشو نے حیرت سے کہا۔ ''کیا کسی سیٹھ کا بیٹا ہونے سے آدمی بدل جاتا ہے......؟ بولو، کیا فرق پڑ جاتا ہے ایسے سے؟''

وجے نے جو کچھ کہا، وہ اُس کے دل کی آواز نہیں تھی۔ شاید اسی لئے اُسے احساس ہوا کہ یہ بات نہیں کہنی چاہئے تھی۔ پھر اُس نے سوچا، میں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ میرا مقصد یہی تو تھا کہ کسی طرح انشو کے دل میں اپنی نفرت پیدا کر دوں۔ اس کے بعد ہی انشو مجھے بھول سکتی ہے۔ اُسے ایک بہانہ مل گیا اور پھر وہ انشو سے نظریں چراتے ہوئے کہنے لگا۔ ''انشو! میرے سورگ باشی پتا جی دہلی کے ایک بہت بڑے سیٹھ تھے۔ وہ شاردا پرشاد اینڈ کمپنی کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنی موت سے پہلے میرے لئے ایک لڑکی پسند کی تھی اور میری ماں سے یہ وچن لیا تھا کہ اگر میں کبھی واپس آ جاؤں تو میری شادی اسی لڑکی سے کی جائے ورنہ مرنے کے بعد بھی ان کی آتما کو شانتی نہیں ملے گی۔''

''وجے! مرنے کے بعد آتما کی شانتی میرے نزدیک ایک دھوکا ہے۔'' انشو پُرجوش آواز میں بولی۔

''مگر میں...... میں ایسا نہیں سمجھتا۔'' وجے نے کہا۔

انشو نے اُسے زخمی سی نظروں سے دیکھا، پھر کہنے لگی۔ ''تم ایک ایسے شخص کی بات کو

اہمیت دے رہے ہو جسے چند روز پہلے جانتے تک نہیں تھے۔"

"جاننے یا نہ جاننے سے یہ حقیقت تو نہیں بدل سکتی کہ مرنے والا بہرحال میرا باپ تھا!" وجے زور دے کر بولا۔

"تو اس کا مطلب یہی ہے کہ تم ایک مُردہ شخص پر ایک زندہ انسان کو قربان کر دینا چاہتے ہو!"

"میں مجبور ہوں۔"

"ایک بات بتاؤ وجے!" انشو نے تیز لہجے میں کہا۔ "اگر تمہیں اپنے بچھڑے ہوئے ماں باپ کا پتہ نہ چلتا تو کیا ہوتا......؟ اگر اس دوران ہماری شادی ہو جاتی تو کیا تم اپنے سورگ باشی باپ کا وچن نبھانے کے لئے مجھے چھوڑ دیتے؟"

"تب؟" یہ سوال گویا وجے نے خود سے بھی کیا تھا۔ "تب تو بات ہی دوسری ہوتی انشو!" وجے نے اپنی دلی کیفیت پر بمشکل قابو پایا تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد وہ پھر بولا۔ "تمہیں کیا معلوم میرے پتا جی نے میرے لئے کتنی دولت چھوڑی ہے۔ اگر میں اس لڑکی سے شادی نہیں کروں گا تو اس تمام دولت اور جائیداد سے محروم ہو جاؤں گا۔ ممکن ہے تم یہ سوچ رہی ہو کہ محض دولت ہی سب کچھ نہیں، لیکن میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ کہتے ہیں دولت کچھ نہیں، وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے، لیکن اس لئے نہیں کہ اسے تڑپ تڑپ کر گزار دیا جائے اور عیش نہ کئے جائیں۔ جب عیش کرنا دسترس میں ہو تو پھر کیوں اس سے محروم رہا جائے؟"

"وجے...... یہ...... تمہارے خیالات یہ ہیں!" انشو حیرت سے کہنے لگی۔

"ہاں انشو!...... اور میرے خیالات کی بنیاد سچائی پر ہے۔"

وجے کی بات سن کر انشو اُسے حیرت سے دیکھتی رہی۔ اُس کی زبان نے مزید کچھ کہنے کے لئے ساتھ نہ دیا۔ اُس کے ذہن میں چھناکے سے ہو رہے تھے۔ اُس کا دل کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ اُسے وہ جگہ، وہ کمرہ سب کچھ گھومتا محسوس ہو رہا تھا۔ شاید اُسے زور کا چکر آیا تھا۔ اُس نے کتنے ارمانوں سے پیار کا ایک محل بنایا تھا اور اس محل کے بام و در کو سجانے کی غرض سے کیا کیا سہانے خواب دیکھے تھے۔ وجے نے تو صرف ایک ہی ٹھوکر سے محبت کے اس شیش محل کو چکنا چور کر دیا تھا۔

انشو اتنی بڑی چوٹ برداشت نہ کر سکی۔ وہ بولی۔ "دولت کے حصول کی خاطر کام کرنے والا ایک مجرم آخر ڈھیروں دولت دیکھ کر پھسل ہی گیا!"

"اگر دولت حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنا جرم ہے تو یقیناً میں مجرم ہوں۔" وجے نے کہا۔

"تم...... تم ایک لالچی انسان ہو وجے!" انشو کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔ "اچھا ہوا کہ تمہارے چہرے سے محبت کی نقاب جلد اُتر گئی۔ تم نے میرے ارمانوں کا یہ حشر کیا...... میرے پیار کے ساتھ ایسا مذاق کیا۔ تم میرے ساتھ محبت کا ناٹک رچاتے رہے اور...... اور میں تمہیں سمجھ نہ سکی۔"

"اگر تم مجھے نہ سمجھ سکیں تو یہ قصور بھی تمہارا ہے، میرا نہیں۔" وجے نے انشو کے احساس پر ایک اور تازیانہ لگایا۔

انشو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ دولت اور جائیداد کی خاطر وجے اس حد تک گر سکتا ہے، مگر اُسے یقین کرنا ہی پڑا۔ وجے نے اپنی زبان ہی سے تو اعتراف کیا تھا کہ اس کے نزدیک دولت محبت سے بڑھ کر ہے۔ اب کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ انشو کو اندازہ ہو چلا تھا کہ وجے کے باپ نے اُس کے لئے اتنی دولت و جائیداد چھوڑی ہے جس کے سامنے رائے صاحب کی دولت کچھ بھی نہیں تھی۔ اتنی دولت دیکھ کر ایک مجرم صفت انسان کا پھسل جانا فطری تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اس شخص کی اصلیت جلد کھل گئی۔ افسوس یہ ہے کہ اسے شرمندگی کا احساس تک نہیں۔

انشو کی پیشانی پر سلوٹوں کا جال سا نظر آ رہا تھا۔ وہ گہری سوچ میں تھی۔ موجودہ حالات کی روشنی میں وہ وجے کی شخصیت اور کردار کا تجزیہ کر رہی تھی۔ پھر وہ وجے کے بالکل نزدیک اُس کے سامنے آ گئی۔ اُس کی آنسو بھری آنکھوں سے جیسے قہر کے شعلے نکل رہے تھے۔

"نیچ...... پاپی...... دھوکے باز!" انشو نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ پھر اُس کا ہاتھ زور سے ہوا میں لہرایا اور وجے کے رخسار پر ایک زوردار تھپڑ پڑا۔ اس کے ساتھ ہی وہ پلٹی اور روتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ کچھ ہی دیر میں اُس نے گھر کے باہر کھڑی ہوئی کار کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ کر زور زور سے رونے لگی۔ آنکھوں سے بہنے والے

آنسو اُس کی محبت کا نوحہ تھے۔

رائے صاحب نے بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اُن کی آنکھیں بھی چھلک اُٹھیں۔ پھر انہوں نے کار اسٹارٹ کر دی۔ وجے اور انشو کے درمیان کیا بات ہوئی، رائے صاحب نے اس سلسلے میں کچھ نہیں پوچھا۔ انہیں اندازہ تھا کہ وجے کے گھر سے جب انشو لوٹے گی تو اس کی آنکھوں میں آنسو ہوں گے۔ خود انشو نے بھی انہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اُس کے آنسو جو بہت کچھ بتا رہے تھے! کچھ باتیں کہنے کی نہیں سمجھنے کی ہوتی ہیں۔

وجے ابھی تک اپنے کمرے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔

انشو جا چکی تھی لیکن وجے کی آنکھوں میں اب بھی اُس کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ انشو کے آنسو، اُس کا بین ابھی تک وجے کے دل کو پارہ پارہ کر رہا تھا۔ یکایک وجے نے دیوانوں کی طرح اپنے سر کے بالوں کو نوچنا شروع کر دیا اور پھر وہ زور زور سے اپنا سر دیوار سے ٹکرانے لگا۔ اُس پر دیوانگی طاری تھی اور وہاں کوئی نہیں تھا جو اُسے دیوانگی کے اس خطرناک مظاہرے سے روک سکتا۔ اپنے سر کو وہ دیوار سے مارتا رہا۔ اس کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہئے تھا۔ اُس کے سر اور پیشانی سے خون بہنے لگا اور پھر وہ بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑا۔

فرش پر بہنے والا خون کس کا تھا؟ یہ فیصلہ کرنا آسان نہ تھا۔ یہ خون وجے کا بھی ہو سکتا تھا، انشو کا بھی اور ان دونوں کی محبت کا بھی!



وجے دہلی واپس آ چکا تھا۔ اُس کے دل کی دنیا ان حالات میں پھنس کر اُجڑی تھی جن کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا، خواب میں بھی نہیں! وہ ایک ایسے جرم کی سزا بھگت رہا تھا جس میں اُس کا رتی بھر بھی قصور نہیں تھا۔ ایسا ''گناہ'' تو انجانے میں کسی بھی شخص سے سرزد ہو سکتا تھا۔ خودکشی کا خیال ابھی اُس کے دماغ سے نہیں نکلا تھا۔ صرف اپنی بوڑھی ماں کی وجہ سے وہ اب تک ایسا نہیں کر سکا تھا۔ برسوں کی بچھڑی ہوئی ماں کے خیال نے وجے کو ایسا کرنے سے روک دیا تھا۔ اُسے ہر حال میں جینا تھا مگر اس کے لئے دن رات شراب کی ضرورت تھی۔ خود فراموشی کے بغیر جینا اُس کے لئے

عذاب ہو جاتا۔ شراب اُس کے لئے یوں ضروری تھی کہ وہ ماضی کے قصوں اور خوابوں کو بھول سکے۔ وہ خواب جو اُس نے انشو کی محبت میں دیکھے تھے، وہ خواب جو اُس کی زندگی کا سرمایہ تھے! اب وہ ان سارے خوابوں کو بھلا دینا چاہتا تھا۔ اُس کے دل کے اطمینان کی خاطر اتنا کافی تھا کہ بالکل ٹھیک وقت پر وہ انجانے میں ایک ایسا گناہ کرتے کرتے بچ گیا جس کا کفارہ مر کر بھی ادا نہیں کر سکتا تھا۔

وجے کو پورا یقین تھا کہ انشو نے اُسے فریبی اور بے وفا سمجھ لیا ہوگا اور اب اس سے نفرت کرنے لگی ہوگی۔ وقت کا مرہم اُس کے دل کے زخم کو آہستہ آہستہ بھر دے گا۔ وہ اُسے ایک دن بھول ہی جائے گی اور پھر اپنے ڈیڈی اور ممی کی خواہش پر وشال سے شادی کر لے گی۔

رات کے وقت وجے کو شراب کی ضرورت کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی تھی۔ جب رات کا سناٹا اور تاریکی اُس کے کمرے میں ڈیرہ ڈالتے تو وہ لائٹ بھی نہیں جلاتا۔ وہ تاریک کمرے میں پلنگ یا کرسی پر بیٹھ کر اپنے دل کے اس گوشے کو ٹٹولتا جس میں ابھی تک انشو کی محبت کا چراغ روشن تھا۔ وہ اس چراغ کو بجھا نہیں سکا تھا۔ اُس کا دل اب تک اس حقیقت کو ماننے پر آمادہ نہ تھا۔ وجے نے انشو کو اب بھی بہن کے روپ میں تسلیم نہیں کیا تھا۔

وجے کی نظروں کے سامنے اب بھی وہ لمحات آ جاتے جو اُس نے انشو کے ساتھ گزارے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں سارے مناظر جاگنے لگتے تھے۔

سب کچھ یاد ہونے کے باوجود وجے کی خواہش تھی کہ اسے کچھ بھی نہ یاد رہے، مگر ضروری نہیں آدمی کی ہر خواہش پوری ہو جائے۔ یہی صورتحال وجے کے ساتھ تھی۔ یادیں اُس کے ذہن کے دریچوں پر آ کھڑی ہوتیں، دستک دیتیں اور ایک ایک کر کے اندر آ جاتیں۔ یہ یادیں اُسے خوب ستاتیں، خوب پریشان کرتیں۔ بار بار اُس کا دل مشورہ دیتا وہ خودکشی کر لے۔ کیونکہ انشو کی یادوں سے نجات حاصل کرنے کا یہی واحد حل تھا، مگر وہ اپنی ماں کی خاطر زندہ رہنے پر مجبور تھا۔ ماں کی خاطر ہی اُس نے زہر کا یہ پیالہ ہونٹوں سے لگایا تھا۔ معلوم نہیں کب تک اُسے اسی عذاب سے گزرنا تھا! شاید زندگی کے آخری سانس تک! کبھی کبھی وہ سوچتا۔

اُس نے شراب میں اسی لئے پناہ ڈھونڈ لی تھی۔ وہ شراب پیتا، خوب پیتا، اتنی کہ اُسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہتا۔ جب نشے کی وجہ سے اُس کی آنکھیں بوجھل ہو کر بند ہونے لگتیں تو وہ پلنگ پر گر کے دنیا سے بے خبر ہو جاتا۔ رات کے کسی حصے میں اُس کی آنکھ کھل جاتی تو وہ دوبارہ اُٹھ کر شراب پینے لگتا تا کہ لامحدود اور شدید تڑپ کے کچھ لمحے کم ہو سکیں۔

دن میں تو وجے اپنے دل کا بھید اپنی ماں سے ہمیشہ ہی چھپا لیتا تھا۔ اُس نے کوشش کی تھی کہ ماں جی کو کچھ پتہ نہ چلے۔ وہ خیال رکھتا تھا کہ ماں جی کو اندازہ نہیں ہونا چاہئے کہ ان کا بیٹا اندر سے بہت دُکھی ہے۔

وجے کی تمام تر احتیاطوں کے باوجود اوما دیوی اس کی کیفیت کو بھانپ چکی تھیں۔

اوما دیوی سوچتیں کہ وجے کے چہرے پر ہمیشہ اُداسی اور سوگواری کیوں چھائی رہتی ہے؟ اُسے آخر کس چیز کا غم ہے؟

آخر ایک روز اوما دیوی نے وجے سے اس سلسلے میں بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ انہوں نے بڑے پیار سے وجے کو اپنے پاس آنے کو کہا۔ وجے اُن کے پاس پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا تو انہوں نے کہا۔ ''کیا بات ہے بیٹا، جب سے تو بمبئی سے واپس آیا ہے، ہر وقت اُداس اُداس سا رہتا ہے؟ کیا تجھے یہاں دہلی میں اپنی ماں کے ساتھ رہنا اچھا نہیں لگا؟''

''ماں!'' وجے نے خود کو سنبھالا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ ماں نے اُس کے دل کا چور پکڑ لیا ہے۔ وہ اسی لئے اپنی ماں کو مطمئن کرنے کے لئے کہنے لگا۔ ''کیسی بات کرتی ہو! اس دنیا میں تمہارے سوا میرا اور کون ہے جو مجھے یہاں رہنا اچھا نہیں لگے گا۔''

''اچھا تو میرے ایک سوال کا جواب دے۔'' اوما دیوی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''بولیں، کیا پوچھنا چاہتی ہیں؟'' وجے بولا۔

''یہ بتا کہ تو شراب کیوں پیتا ہے؟'' اوما دیوی نے سوال کیا۔

''ماں میں......'' وجے نے کچھ کہنا چاہا مگر نہ کہہ سکا۔

''تجھے بمبئی سے آئے اتنے دن ہو گئے ہیں۔'' اوما دیوی کہنے لگیں۔ ''ان دنوں میں جب بھی تو میرے پاس آ کر بیٹھتا ہے، تیرے منہ سے شراب کی بو آتی ہے۔''

اس دوران وجے اپنی شراب نوشی کی تاویل کے متعلق سوچ چکا تھا۔ وہ بولا۔ ''ماں! میری زندگی...... بلکہ ساری ہی زندگی سمجھ لو، مجرموں اور اسمگلروں کے ساتھ رہتے ہوئے گزری ہے۔ مجھے اسی لئے شراب پینے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اگر نہ پیوں تو تکلیف ہونے لگتی ہے۔ مجھے معلوم ہے ماں کہ شراب کوئی اچھی چیز نہیں ہے لیکن تم...... تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بہت جلد اس لعنت سے جان چھڑا لوں گا۔''

وجے نے اپنی ماں کو اطمینان دلانے کی خاطر جو کچھ کہا حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ شراب نوشی کبھی اُس کی عادت نہیں رہی تھی، نہ کبھی اُس نے پہلے اتنی کثرت سے شراب پی تھی۔ اس کی وجہ تو یادوں اور خوابوں سے نجات حاصل کرنا تھا، وہ یادیں اور خواب جن کا تعلق انشو سے تھا۔

اوما دیوی نے بھی اپنے بال دُھوپ میں سفید نہیں کئے تھے۔ وہ اسی لئے بولیں۔ ''چل میں نے تیری بات مان لی کہ شراب پینا تیری عادت ہے، مگر تیرے چہرے کی اُداسی تو کچھ اور ہی کہتی ہے۔ تیرے دل میں کوئی غم ضرور چھپا ہے۔ تیری آنکھیں تیرے اندرونی کرب کی کہانی سناتی ہیں۔ تو مجھے ہر وقت کھویا کھویا سا دکھائی دیتا ہے۔ پہلی بار جب تو بمبئی سے آیا تھا تو ایسا نہ تھا۔ اس وقت تو شراب بھی نہیں پیتا تھا۔''

اپنی ماں کی باتیں سن کر وجے لاجواب ہو گیا۔ اُس کے پاس ماں کے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ ناچار اُس نے نظریں جھکا لیں۔

''بیٹا!'' اوما دیوی نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بتا تو سہی کہ آخر تو اتنا اُداس کیوں ہے؟ مجھ سے ملنے کے بعد تو کہیں کسی اُلجھن میں تو گرفتار نہیں ہو گیا؟ کیا کسی لڑکی نے تجھے دھوکا دیا ہے؟ تجھ سے بے وفائی کی ہے؟''

وجے چونک اُٹھا۔ اُس نے تڑپ کر انکار میں زور زور سے سر ہلایا اور بولا۔ ''نہیں ماں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا بات ہے؟'' اوما دیوی اُس کی جان چھوڑنے پر آمادہ نہیں لگتی تھیں۔

''کچھ...... کچھ بھی نہیں ماں......! کوئی بات نہیں۔'' وجے نے جلدی سے کہا۔ ''بس کچھ قریبی دوست بچھڑ گئے ہیں اس لئے اُداس رہنے لگا ہوں۔ وہ تو خیر انسان ہیں، جانوروں کے ساتھ رہ کر بھی انسان ان کا عادی ہو جاتا ہے۔'' وجے نے جھوٹ کا سہارا

لینے کی کوشش کی۔

وجے اپنی ماں کو آخر بتاتا بھی کیا! آخر وہ اُسے کیسے بتا سکتا تھا کہ جس لڑکی سے اُس نے پیار کیا ہے وہ کون ہے؟ اور یہ کہ وہ لڑکی بے وفا نہیں، وقت اور حالات نے اس سے بے وفائی کی ہے۔ اگر وہ انشو کے بارے میں اوما دیوی کو سب کچھ سچ سچ بتا دیتا تو وہ اپنی برسوں سے بچھڑی ہوئی بیٹی سے ملنے کے لئے تڑپ اُٹھتیں۔ پھر جب انشو کو پتہ چلتا کہ جس نوجوان نے اُس سے ٹوٹ کر محبت کی ہے، جس کی رفاقت کے اُس نے دن رات سپنے دیکھے ہیں، وہ کوئی غیر نہیں ہے۔ اس نوجوان سے اس کا کیا رشتہ ہے، کیا وہ اس حقیقت کو جان کر زندہ رہ پاتی؟ جو گناہ انشو سے انجانے میں سرزد ہوا، اس کے بعد کیا وہ دنیا کا سامنا کر سکتی؟ پھر رائے صاحب کا گھر الگ برباد ہوتا۔ ان کی خوشیوں پر بجلی گر پڑتی۔ خود وجے بھی اپنی ماں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ دراصل وجے کے چپ رہنے پر بہت سی ہستیوں کی خوشی اور زندگی کا انحصار تھا۔ وجے نے اس لئے یہی مناسب سمجھا کہ اپنے راز کو دل ہی میں رکھے، زبان پر نہ لائے۔ یہ معاملہ صرف اُس کی ذات تک محدود نہیں تھا۔

وجے نے اپنی ماں اوما دیوی کو جو کچھ بتایا تھا، اس کے نزدیک قابل یقین نہیں تھا۔ اُس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ بات کچھ اور ہے جو وجے نے ابھی تک انہیں نہیں بتائی، لیکن وہ کرتیں بھی کیا! اُنہیں وجے کی بات ماننی ہی پڑی۔ انہوں نے سوچا، اگر کوئی ایسی بات ہے جو وجے انہیں بتانا نہیں چاہتا تو اس کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہو گی۔ انہیں وہ بات جاننے کے لئے ضد نہیں کرنی چاہئے۔ وہ اپنے بیٹے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھنا چاہتی تھیں۔

''اگر یہ بات ہے تو اب تو تیار ہو جا!'' اوما دیوی آخر بولیں۔ ''تو میری کمپنی کو سنبھال لے، اس کو دیکھنا شروع کر دے۔ اس طرح تیرا دل بھی لگ جائے گا اور میرا بوجھ بھی کم ہو جائے گا۔'' انہوں نے پھر ایک بار وجے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور کہنے لگیں۔ ''آخر ایک نہ ایک دن تو تجھے میرا کام سنبھالنا ہی ہے۔ کب تک سارے کام منیجر پر چھوڑتی رہوں گی۔''

وجے نے اپنی ماں کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، لیکن اُسے یہ تجویز بہر حال پسند

آئی۔ اس پسندیدگی کی وجہ متوقع مصروفیت تھی۔ اُسے اندازہ تھا کہ جب وہ اپنی کمپنی کو سنبھال لے گا تو اتنا مصروف ہو جائے گا کہ انشو کی یاد اتنا نہیں تڑپائے گی جتنا اب تڑپاتی تھی۔

کہتے ہیں کہ وقت ہر زخم کو بھر دیتا ہے اور شاید غلط نہیں کہتے۔ وقت پَر لگا کر اُڑنے لگا۔ اس کے گزرنے کے ساتھ وجے کے دل کی تڑپ میں دھیرے دھیرے کمی آنے لگی۔ اُس نے کسی نہ کسی طرح حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا اور اس طرح زندگی ایک ڈگر پر چل پڑی تھی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو یقیناً اُس کے لئے جینا مشکل ہو جاتا۔ اُس نے خود کو اس قدر مصروف کر لیا تھا کہ اُسے کسی اور چیز کا ہوش ہی نہیں رہتا تھا۔

وہ کمپنی سے آتا تو کوٹھی کی مرمت اور دیکھ بھال میں لگ جاتا۔ شاید اسی لئے کوٹھی کی حالت پہلے کی نسبت بہتر ہو گئی تھی۔ لان ٹھیک ٹھاک دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کی سبز گھاس اب باقاعدگی سے تراشی جا رہی تھی۔ پھولوں کی کیاریاں بھی سلیقے اور ترتیب سے سنوری ہوئی نظر آتی تھیں۔ ان میں رنگ برنگے پھول بہار دکھانے لگے تھے۔ کوٹھی کے بڑے دروازے کی جگہ اب لوہے کا ایک بڑا گیٹ لگ گیا تھا۔ گیٹ پر رنگ و روغن بھی کرایا گیا تھا۔ ستون بھی مضبوط اور نئے ہو گئے تھے۔

رات کا کھانا کھا لینے کے بعد دونوں ماں بیٹا خوب باتیں کرتے تھے۔ کبھی وہ ماں کو اپنے بچپن کی باتیں بتاتا۔ ایسے ہی ایک موقع پر دیوان چند (سریش ورما) کا ذکر نکل آیا۔ وجے کہنے لگا۔ ''ماں! کسی نے سچ کہا ہے کہ کبھی کبھی آنکھوں دیکھا بھی سچ نہیں ہوتا۔ اب یہی دیکھ لو کہ جس شخص نے مجھے اغواء کیا تھا، میں اُسی کو اپنا سب کچھ سمجھتا تھا۔ آج اُس کے بارے میں سوچتا ہوں تو عجیب سا لگتا ہے۔''

''ہاں بیٹا، تو ٹھیک کہتا ہے۔'' اوما دیوی نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

اپنی ماں سے باتیں کرتے ہوئے، اُسے بچپن اور نوجوانی کے قصے سناتے ہوئے وجے یہ احتیاط ضرور رکھتا تھا کہ اُس کی زبان پر انشو کا نام نہ آئے۔

اوما دیوی نے وجے کو بتایا تھا کہ دہلی شہر کے علاوہ اور دوسرے شہروں میں بھی ان کی زمینیں اور جائیدادیں تھیں، مگر انہوں نے تقریباً سبھی کو بیچ دیا تھا۔ ایک کوٹھی جس میں اوما دیوی کی سکونت تھی، دہلی میں تھی اور دوسرا بنگلہ نینی میں تھا۔ الہ آباد کے قریب نینی چھوٹا

سا ایک شہر تھا۔ وجے کو ماں جی نے بتایا کہ وہ اس بنگلے کو بھی فروخت کرنا چاہتی ہیں، مگر اس میں رہنے والا کرائے دار اسے خالی نہیں کر رہا۔ جب تک وہ اس بنگلے کو خالی نہیں کرے گا، اس وقت تک وہ فروخت نہیں ہو سکتا۔ کرائے دار کے ساتھ مقدمہ چل رہا ہے۔ ہر بار جب بھی تاریخ پڑتی تھی تو الٰہ آباد جانا پڑتا تھا۔

وجے کو جب اس تفصیل کا علم ہوا تو اُس نے سوال کیا۔ ”ماں جی! الٰہ آباد میں آپ کہاں ٹھہرتی ہیں؟“

”مسٹر گلاٹھی کے ہاں۔“ اوما دیوی نے جواب دیا۔ ”وہ نینی ہی میں رہتے ہیں۔ اُن کی بیوی میری پرانی سہیلی ہے۔“

”گلاٹھی جی کیا کرتے ہیں؟“ وجے نے دریافت کیا۔

”وہ نینی کے ایک بڑے تاجر ہیں۔“ اوما دیوی نے بتایا۔

دونوں ماں بیٹا ہر روز کافی رات تک اسی طرح باتیں کرتے رہتے تھے۔ اسی بناء پر اب وجے کا شراب پینا بہت کم ہو گیا تھا۔ پھر بھی کبھی کبھار جب اُسے انشو کی یاد آتی تو شراب کی بہت ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ ایسے وقت وہ خود پر قابو نہیں رکھ پاتا تھا۔

وجے بستر پر سونے کے لئے لیٹتا تو ایسے میں انشو دل کے دریچوں سے جھانکنے لگتی۔ اُسے آج تک انشو سے ہونے والی آخری ملاقات اچھی طرح یاد تھی۔ اُس کا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ، لمبی لمبی بوجھل پلکیں، سنہری زلفیں، گلابی رخسار، سرخ ہونٹ، نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سب وجے کی نظروں کے سامنے آ جاتا۔ ایسے میں وجے کے دل کی کسک بڑھ جاتی۔ درد شدید ہونے لگتا تو وہ شراب کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتا۔

اگر ایسے وقت گھر میں شراب نہ ہوتی تو وجے رات کی پرواہ کئے بغیر شراب کے حصول کی خاطر اپنی جیپ میں سوار ہو کر کوٹھی سے نکل کھڑا ہوتا۔

جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز سن کر عموماً اوما دیوی باہر نکل آتیں۔ وہ وجے سے پوچھنا چاہتی تھیں کہ اتنی رات کو کہاں جا رہا ہے؟ ابھی وہ اپنے ارادے پر عمل نہ کر پاتیں کہ اس دوران میں وجے کی جیپ صدر دروازے سے نکل چکی ہوتی۔

پھر اوما دیوی برآمدے میں بیٹھ کر بیٹے کی واپسی کا انتظار کرتیں۔ اب تک وہ سمجھ چکی تھیں کہ ان کے بیٹے کے دل میں کوئی گہرا زخم ہے۔ اسی زخم کی تکلیف و اذیت اُسے چین

سے نہیں رہنے دیتی۔ ضرور اُسے کسی لڑکی سے محبت ہے جس نے اُس کے ساتھ بے وفائی کی ہے۔ میرا بیٹا اسی بے وفا لڑکی کی یاد میں دن رات تڑپ رہا ہے، گھل رہا ہے۔

جب بھی اوما دیوی اس معاملے میں وجے سے بات کرتیں تو وہ ٹال جاتا۔ وہ اتنا بڑا راز ان کے سامنے کیسے کھول سکتا تھا؟ البتہ اوما دیوی اس سے جتنے سوال کرتیں، اتنی ہی اُس کی تڑپ بڑھ جاتی۔

اوما دیوی اپنے بیٹے کی مدد کرنا چاہتی تھیں۔ ان سے وجے کا دُکھ نہیں دیکھا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ اوما دیوی بہ ضد ہو گئیں۔ ”وجے! آج تجھے اپنی زبان کھولنی ہی پڑے گی۔ تجھے اپنا دُکھ بتانا ہی ہو گا۔“

”ماں!“ وجے تڑپ کر بولا۔ ”مجھ سے کچھ نہ پوچھیں، آپ کو میری سوگند، مجھے یقین دلائیں کہ...... کہ......“ اُس کی آواز بھرا گئی۔

اس دن کے بعد سے اوما دیوی نے وجے سے زبان کھولنے کو نہیں کہا۔ وہ وجے کا حال دیکھ دیکھ کر تڑپتی رہتی تھیں مگر زبان سے کچھ نہیں کہتی تھیں۔ ہاں وہ دل ہی دل میں اپنے پیدا کرنے والے سے یہ دُعا ضرور کرتی تھیں کہ ان کے بیٹے کو سکون دے دے۔

کافی رات جب انتظار میں گزر جاتی اور جب وجے کی جیپ صدر دروازے سے کوٹھی کے اندر داخل ہوتی تو اوما دیوی فوراً ہی برآمدے سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جاتیں۔ وجے کو پتہ نہ چلتا کہ اُس کی ماں اب تک اسی کے لئے جاگ رہی تھی۔ وہ شراب کے نشے میں چور لڑکھڑاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ پھر وہ لباس تبدیل کئے بغیر جوتوں سمیت ہی اپنے پلنگ پر ڈھیر ہو جاتا۔

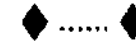
اوما دیوی چھپ کر اپنے بیٹے کی حالت دیکھتیں۔ وجے شراب کے نشے میں جانے کیا کیا بڑبڑانے لگتا تھا۔ اوما دیوی اُس کی باتوں کو سننے اور سمجھنے کی کوشش کرتیں، مگر کچھ پلے نہ پڑتا۔ جب وہ اپنی کوشش میں ناکام ہو جاتیں تو جھنجھلا جاتیں۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے بیٹے کی مدد کرنے سے قاصر رہتیں۔ مدد کرتیں بھی تو کیسے؟ بیٹا کچھ بتاتا تو شاید وہ اس کے کام آ جاتیں، اُس کے دل کا بوجھ ہلکا کر پاتیں۔

ایک رات ایسا ہوا کہ حسبِ معمول وجے اسی طرح شراب کے نشے میں دھت اپنے پلنگ پر لیٹا بڑبڑا رہا تھا کہ اوما دیوی کی سمجھ میں کچھ لفظ آ گئے۔

وجے درد بھرے لہجے میں ایک ہی نام بار بار دہرائے جا رہا تھا۔ ''انشو...... انشو......''

''انشو!'' اوما دیوی نے یہ نام زیرِ لب دہرایا۔

اوما دیوی کا ذہن بھی تیزی سے کام کرنے لگا۔ وہ سوچنے لگیں، یہ اُسی لڑکی کا نام ہو سکتا ہے جس نے میرے بیٹے کے دل پر کاری زخم لگایا ہے۔ اُن کی سمجھ میں گویا ساری بات آ گئی۔ انشو نام کی کسی لڑکی نے یقیناً وجے کو دھوکا دیا تھا، اُس کا دل توڑا تھا۔ آج اوما دیوی نے اپنی دانست میں وہ راز پا لیا تھا جس کے لئے کافی عرصے سے جستجو کر رہی تھیں۔ انہوں نے سوچا، میرے بیٹے میں آخر ایسی کیا کمی ہے، لاکھوں میں ایک ہے میرا چاند!



ایک ماں اپنی اولاد کے دُکھ کو جس طرح محسوس کر سکتی ہے کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اوما دیوی اسی لئے فکرمند ہو گئیں۔ اپنے بیٹے وجے کے ساتھ ساتھ اب وہ انشو کے بارے میں بھی سوچ رہی تھیں۔ وہ رات انہوں نے سوتے جاگتے گزار دی۔ بار بار ان کی آنکھ کھل جاتی تھی۔

دوسرے دن صبح جب وجے اوما دیوی کے ساتھ ناشتے کی میز پر بیٹھا ہوا تھا تو اُس کے چہرے سے اُداسی جھلک رہی تھی۔ ایک رنج کی سی کیفیت کا تاثر تھا جس نے وجے کے چہرے سے تازگی چھین لی تھی۔ اُس کی آنکھیں سوجی ہوئی اور بوجھل تھیں۔ وہ بہت دھیرے دھیرے بیزاری و بے دلی کے ساتھ ناشتہ کر رہا تھا۔ اوما دیوی وجے کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔

''یہ انشو کون ہے؟'' اوما دیوی نے اچانک وجے سے سوال کیا۔

وجے کے لئے اوما دیوی کا یہ سوال انتہائی چونکا دینے والا تھا۔ وہ تقریباً اُچھل پڑا۔ اُس کے ہاتھ سے چھری پھسل کر نیچے گر پڑی۔ جس سلائس پر وہ چھری سے مکھن لگا رہا تھا، اسے بھی نہ سنبھال سکا۔ حیرت سے وہ ماں کو دیکھ رہا تھا۔

ضرور ماں جی نے میری اُداسی کی وجہ جان لی ہے، وہ سوچ رہا تھا۔ ماں جی کو پتہ چل گیا ہے کہ انشو......''

اوما دیوی کے دوبارہ بول اٹھنے سے وجے کے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ ''کون ہے یہ لڑکی؟''

''ماں......! تم...... تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ...... کہ اس لڑکی کا نام...... ان...... انشو ہے؟'' وجے نے رُک رُک کر ڈرتے ہوئے ماں سے پوچھا۔

''تو کل رات نشے کی حالت میں بار بار اُس لڑکی کا نام لے کر بڑبڑا رہا تھا۔'' اوما

دیوی نے جواب دیا۔

''کیا؟'' وجے کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ وہ سوچنے لگا کہ کہیں میں نے نشے کے عالم میں اپنا راز تو نہیں کھول دیا؟ یہ کوئی ناممکن بات بھی نہیں تھی۔

''ہاں، تو انشو، انشو کہہ رہا تھا۔''

''بس...... نام ہی لے رہا...... نام...... صرف نام لیا تھا نا میں نے؟'' وجے بمشکل اپنی بات کہہ سکا۔

''میں نے بھی سنا تھا۔'' اوما دیوی نے جواب دیا۔

وجے نے اس پرسکون کا سانس لیا۔ اس کے باوجود اُس سے ناشتہ نہیں کیا جا رہا تھا۔ اُس نے نیپکن سے ہاتھ صاف کیا اور اُٹھنے لگا۔

''ٹھہرو!'' اوما دیوی بول اُٹھیں۔ ''تم نے مجھے بتایا نہیں یہ لڑکی کون ہے!''

''ماں! میں نے تم کو قسم دے رکھی ہے......''

اوما دیوی نے اُس کی بات کاٹ دی۔ ''میں نے تمہارے دل کا راز نہ جاننے کا وعدہ کیا ہے، مگر اس وقت تو میں انشو کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔ مجھے تم اس لڑکی کے متعلق کچھ بتاتے ہوئے کیوں جھجک رہے ہو......؟ وجہ تو پتہ چلے۔''

''ماں!'' وجے ناشتے کی میز سے اُٹھ گیا اور پھر چند قدم آگے بڑھنے کے بعد اُس کے قدم رُک گئے۔ اوما دیوی کی طرف اب وجے کی پشت تھی۔ اُس نے کہا۔ ''انشو ہی میرے دل کا وہ راز ہے، میں جس کے بارے میں تمہیں قسم دے چکا ہوں۔ مجھ سے...... اس سلسلے میں کچھ...... کچھ نہ پوچھو ماں جی...... کچھ بھی نہیں۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔'' وجے یہ کہہ کر پلٹا اور اوما دیوی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

صبح صبح بیٹے کو تڑپتے اور بلکتے دیکھ کر اوما دیوی بھی رنجیدہ ہوگئیں۔ وہ اُٹھ کر وجے کی طرف بڑھیں۔ وجے نے اُن سے نظر بچانے کے لئے اپنا منہ دوسری طرف کر لیا۔

اوما دیوی نے بڑی محبت سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولیں۔ ''بیٹا! اب مجھ سے تیرا دُکھ دیکھا نہیں جاتا۔ میں تیری مدد کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے بتا تو سہی کہ یہ انشو کون ہے، کس کی بیٹی ہے اور یہ کہ بمبئی میں کہاں رہتی ہے......؟ اور......''

''ماں جی!'' وجے خاموش نہ رہ سکا۔ ''یہ...... یہ اور معاملہ ہے، تم جانے کیا سمجھ رہی ہو!''

''میں کچھ نہیں سمجھ رہی بلکہ سمجھنا چاہتی ہوں۔'' اوما دیوی نے کہا۔

''کیا کچھ باتیں ایسی نہیں ہوتیں ماں کہ...... کہ جنہیں نہ سمجھنا ہی اچھا ہوتا ہے!''

''ہوں گی، مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں۔'' اوما دیوی بولیں۔ چند لمحے توقف کے بعد وہ کہنے لگیں۔ ''مجھ پر بھروسہ کر بیٹا میں اس کے پاس جاؤں گی، اسے مناؤں گی اور...... اور اسے راضی کرلوں گی۔''

کس بات پر؟ وجے نے کہنا چاہا مگر نہ کہہ سکا۔

اوما دیوی کہے جا رہی تھیں۔ ''میں اپنی جھولی اُس کے سامنے پھیلا کر اُس سے تیرے پیار کی بھیک مانگوں گی۔ تیری خوشیوں کی خاطر میں اس کی ہر شرط ماننے کو تیار ہوں...... تو اتنے برسوں بعد تو مجھے ملا ہے مگر اس حال میں کہ اندر سے ٹوٹا ہوا اور باہر سے بکھرا ہوا ہے۔ تجھے کوئی سمیٹنے والا چاہئے، کوئی ایسا کہ جسے تو چاہتا ہو...... شاید تجھے نہیں معلوم کہ تیری کیا حالت ہے...... نہ تو ہنستا ہے اور نہ تیرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ تو اکیلے میں آنسو بہاتا ہوگا۔ وہ جو کسی سے اپنا دُکھ نہیں کہتے، اندر ہی اندر گھٹتے رہتے ہیں۔ میرے ہوتے یہ نہیں ہوگا وجے! اگر تو نے خود ہی مجھے انشو کے متعلق کچھ نہ بتایا تو پھر سمجھ لے، میں اپنے طور پر اس کا پتہ چلا لوں گی۔''

''کس...... کس طرح؟'' وجے کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے۔ ''بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔'' یہ کہتے ہوئے غالباً وہ اپنے آپ کو بھی تسلی دے رہا تھا۔

''میں تیری ماں ہوں...... تجھ سے زیادہ دنیا دیکھی ہے میں نے...... دہلی بھی تو کوئی چھوٹا سا شہر نہیں۔ تو نے مجھے تلاش کر لیا نا یہاں...... اس بات کو بھی چھوڑ کہ تو کہے گا تیرے پاس میرا پتہ موجود تھا وغیرہ۔ اتنی سی بات تیری سمجھ میں نہیں آئی کہ انشو کو تلاش کرنے کے لئے اخبارات کا سہارا بھی لیا جا سکتا ہے...... بمبئی سے شائع ہونے والے سارے اخباروں میں، میں تیرا نام دوں گی اور اس اشتہار میں انشو کے نام یہ پیغام ہوگا کہ وہ مجھ سے رابطہ کرے۔''

''نہیں!'' وجے زور سے بولا۔ اُس نے اوما دیوی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ دیا اور پھر کہا۔ ''قسم کھاؤ ماں کہ تم...... تم ہرگز ایسا نہیں کرو گی۔ یہ ظلم ہوگا اور شاید مجھ سے یہ ظلم برداشت نہ ہو سکے۔'' وجے کے لہجے میں بڑا کرب تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو

تیر رہے تھے۔

''وجے...... کیا ہو گیا ہے تجھے! میری سمجھ میں تو......''

''ماں!'' وجے نے بات کاٹ دی۔ وہ مضبوطی سے اوما دیوی کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔ ''اگر تم نے انشو سے ملنے کی کوشش کی تو پھر...... پھر میں...... میں یہاں تمہارے پاس نہیں رہ پاؤں گا...... تم مجھے کبھی نہیں دیکھ سکو گی۔'' یہ کہہ کر وجے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اوما دیوی کے لئے یہ تصور بھی محال تھا کہ وجے انہیں چھوڑ کر چلا جائے۔ وہ اسی سبب اندر سے لرز کر رہ گئیں۔ وجے کی بات پر یقین کرنا اُن کے لئے مشکل ہو رہا تھا۔ ان کے نزدیک یہ عجیب صورتحال تھی۔ انشو کو وجے چاہتا بھی تھا اور اُسے اپنانے پر بھی آمادہ نہ تھا۔ انہوں نے سوچا، وہ لڑکی کسی اور لڑکے سے تو پیار نہیں کرتی؟ انشو کا مستقبل کسی اور سے وابستہ تو نہیں ہے؟

''ہاں یہی بات ہو گی۔'' اوما دیوی بے دھیانی میں بڑبڑانے لگیں۔ ''میرا بیٹا انشو کو اس قدر چاہتا ہے کہ خود ہی اُس کے راستے سے ہٹ گیا ہے۔ پیار پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ کہیں محبت یکطرفہ ہوتی ہے کہیں دوطرفہ......! میرے وجے کا پیار یکطرفہ ہے۔'' اوما دیوی کبھی تو بڑبڑانے لگتیں اور کبھی خیال کی رو اُنہیں کہیں سے کہیں پہنچا دیتی۔ اب وہ سوچ رہی تھیں، کتنا بدقسمت ہے یہ لڑکا کہ انشو کو دیوانگی کی حد تک چاہتا ہے مگر اسے حاصل کرنے میں ناکام ہے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ انشو اور وجے کی ملاقات سے پہلے کوئی اور لڑکا انشو کی زندگی میں آ چکا ہو...... وہ لڑکی اُس لڑکے کو چاہتی ہو...... ورنہ میرے بیٹے میں کیا کمی ہے......! خیالوں کا سلسلہ تھا کہ رُک ہی نہیں رہا تھا۔

صبح ہی صبح اوما دیوی تو ذہنی اذیت میں مبتلا ہوئی تھیں، وجے بھی پریشان ہو گیا تھا۔ انشو کا ذکر چھڑ جانے پر وہ کرب پھر سے جاگ اُٹھا تھا جسے اُس نے اپنے دل کے نہاں خانوں میں سلانا چاہا تھا۔ اسی کرب سے نجات پانے کی خاطر وجے نے حسب معمول مے نوشی کا سہارا لیا۔ منہ کو ایک بار لگی ہوئی مے ناب چھوٹتی بھی کیسے! وہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے دُکھوں کو شراب میں ڈبو دیں گے، خود اس میں ڈوب جاتے ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال وجے تھا۔ وہ جس مقصد سے پیتا اور پیتا ہی چلا جاتا اس کا حصول ممکن نہ

تھا۔ دردِ دل پہلے سے اور بڑھ جاتا اور بیقراری، قرار کو ترسنے لگتی۔ نتیجہ یہ کہ وہ دنیا و مافیہا سے غافل ہو جاتا۔ اس وقت بھی اُس پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔

وجے کی حالت دیکھ کر اوما دیوی کا دل تڑپ اُٹھا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اب انہوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ وجے کے سامنے انشو کا نام نہیں لیں گی۔ محبت میں ناکام ہو کر خود اپنی زندگی کی بازی ہار جانے والوں کے قصے انہوں نے بھی اخبارات میں پڑھے تھے۔ وجے کو وہ اس انتہا تک لے جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ وجے اگر خود اپنے درد کا درماں نہیں چاہتا تھا تو اُسے کوئی مجبور نہیں کر سکتا تھا۔

اوما دیوی کی احتیاط کام آئی اور وجے رفتہ رفتہ اعتدال پر آنے لگا، مگر یہ صرف اُس کا ظاہر تھا۔ اُس کا باطن نہیں بدلا۔ ہاں وقت ضرور بدل گیا۔ اب بمبئی سے دہلی آئے ہوئے کئی ماہ ہو چکے تھے۔ بمبئی اُسے بہت یاد آتا تھا جہاں اُس نے بچپن سے جوانی تک کا عرصہ گزارا تھا۔ اسی بمبئی میں اُس کا دل اٹکا رہتا کیونکہ وہاں انشو تھی۔ لاکھ کوشش کے باوجود انشو کو وہ بھول نہ سکا۔

رات کی تاریکی جب کوٹھی کو اپنی آغوش میں لے لیتی تو کسی کی یاد کا جگنو چپکے سے وجے کے وجود کو جیسے روشن کر جاتا۔ اُس کی مرضی و خواہش کے برخلاف انشو یادوں کے دریچوں سے جھانکنے لگتی تھی۔ انشو کے ساتھ اُس نے جو وقت گزارا تھا اور جہاں جہاں گیا تھا، اُسے یاد آنے لگتا۔ پکنک کے دوران جس طرح انشو سے اُس کا رشتۂ محبت استوار ہوا تھا اور انہوں نے ایک دوسرے کے وجود کو محسوس کیا تھا، وجے کو ایک ایک بات یاد تھی۔ یہ باتیں اور یادیں ہی اُس کی رُوح پر چرکے لگاتیں۔ وہ سمجھ نہ پاتا کہ اس کیفیت سے خود کو کس طرح بچائے، کیسے نجات پائے۔ دُکھوں کی برات تھی جو اُس کے خوابوں کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

انشو سے اُسے اپنی آخری ملاقات یاد آتی تو وہ اور اُداس ہو جاتا۔ وہ جسے چاہے جانے اور سکھ پہنچانے کے لئے تخلیق کیا گیا ہے، مرد جس کی خاطر ہر زخم سہہ لیتا ہے، اسی عورت کو وجے نے دانستہ رُلایا تھا۔ سو شاید اسی کی پاداش میں اب اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُسے جو دُکھ تھا کسی اور نے محسوس کیا یا نہیں، اس سے کیا فرق پڑ جاتا! حقیقت تو حقیقت ہی رہتی جس سے وہ آگاہ تھا یا اُسے پیدا کرنے والا۔ وہ یوں محسوس

کرتا تھا جیسے کوئی اُس کے دل پر آرے چلا رہا ہو۔

کبھی کبھی وہ سوچتا کہ میں چھپ کر بمبئی چلا جاؤں اور اُسے دُور ہی سے دیکھ آؤں جس نے میری راتوں کی نیند چھین لی ہے۔ میں نہیں مان سکتا کہ اس سے میرا کوئی خونی رشتہ ہے۔ یہ تو خلافِ فطرت بات ہے جو ممکن نہیں۔

یہی وہ تذبذب تھا جس نے وجے کو بے چین کر رکھا تھا۔ فراق کے یہ لمحات اُس سے کاٹے نہیں کٹ رہے تھے۔

کچھ دیر کو اُس نے اپنے ذہن سے ہر بات کو جھٹک دیا تا کہ قرار آ جائے، لیکن اُس کے نصیب میں قرار نہیں بیقراری لکھی تھی۔ اسی سبب وہ پھر سوچنے لگا، انشو نہ جانے کس حال میں ہوگی؟ کیا ہجر کے یہ دن رات اُس نے با آسانی گزار لئے ہوں گے؟ اگر میرے دل کو قرار نہیں تو اُسے کس طرح قرار آ سکتا ہے۔ آنسو تو اُس کی آنکھوں میں بھی ہوں گے! کیا اُس نے حالات سے سمجھوتا کر لیا ہوگا؟ وہ سکون کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوگی......؟ شاید......! اور شاید نہیں! حتمی طور پر کچھ کہنا، کچھ سوچنا اُس کے لئے مشکل تھا۔

خاموشی کے ساتھ دہلی سے بمبئی چلے جانا اور اس سلسلے میں اوما دیوی کو بھی کچھ نہ بتانا بھلا کیسے ممکن تھا؟ اس کے علاوہ یہ بات بھی بھولا نہیں تھا کہ وہ انشو کے دل میں اپنے لئے نفرت کے بیج بو آیا ہے۔ اپنی دانست میں اُس نے ٹھیک ہی کیا تھا۔ اُس نے خود کو دولت اور جائیداد کا لالچی ظاہر کیا تھا جبکہ یہ بات خلافِ واقعہ تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ انشو اُسے لالچی سمجھے اور زندگی بھر اُس سے نفرت کرتی رہے۔ نفرت اور محبت میں بال برابر ہی تو فرق ہے! یہ فرق کبھی اور کسی بھی لمحے مٹ سکتا یا مٹایا جا سکتا ہے، وجے کو اس کا احساس تھا۔ جانے کیوں اُسے یقین سا تھا کہ انشو اسے بھول جائے گی اور پھر ایک نئی زندگی کا آغاز کر کے خوش اور مطمئن رہ سکے گی۔ انشو کی خوشی ہی اب وجے کی خوشی تھی۔ اسی سے اس کے دل کو سکون ملنا ممکن تھا۔ ایک ایسا سکون جو سطحِ آب پر دکھائی دیتا ہے۔ زیرِ آب طوفانوں کو کون دیکھتا ہے!

زندگی کی پُر پیچ راہ پر وہ اپنے دُکھوں کی صلیب اُٹھائے یوں قدم قدم بڑھ رہا تھا جیسے منزل آشنا ہو۔

اُس کے جسم کو گھن لگ رہا تھا، آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نمودار ہو گئے تھے۔ غم کے سیاہ بادل، آنسوؤں کی جھڑی کے باوجود اُمڈ اُمڈ کر آتے اور اُسے شرابور کر جاتے۔ اس پر بھی وجے نے ہمت نہیں ہاری اور زندگی سے جنگ کرتا رہا۔ وہ یہ سب اپنے لئے نہیں اپنی ماں اوما دیوی کی خاطر کر رہا تھا۔ ماں کو دُکھ دینا اُسے گوارا نہ تھا۔ اپنی ماں کا وہ ایک ہی سہارا تھا۔

جانور اور پرندے، چرندے، درندے بھی تو اپنی بقاء کے لئے زندگی سے لڑتے ہیں! وہ تو پھر بھی انسان تھا۔ انسانوں اور جانوروں میں اگر تخصیص کی جائے تو انسان اپنے علاوہ دوسرے انسان کو بھی بچانے کی کوشش کرتا ہے جبکہ جانور ایسا نہیں کرتے۔ جانور صرف اپنے لئے جیتے ہیں، خطرہ پیش آنے کی صورت میں محض خود کو بچاتے ہیں۔

ایک روز اوما دیوی کو صبح کی ڈاک سے ایک خط موصول ہوا۔ یہ خط الٰہ آباد سے لکھا گیا تھا۔ خط بھیجنے والا اوما دیوی کا وکیل تھا۔ جب خط آیا تو وجے اوما دیوی کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ وہ دفتر جانے ہی والا تھا کہ ڈاکیا آ گیا اور اُسے رُکنا پڑا، کیا خبر اُس کی ڈاک بھی ہو! دفتر میں نہ سہی لیکن گھر میں وجے کی کوشش یہی ہوتی کہ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے رہے۔

اوما دیوی نے لفافہ کھول لیا۔ اُن کی نظریں خط کی عبارت پر جمی ہوئی تھیں۔

خط پڑھ کر اوما دیوی نے وجے کو مخاطب کیا۔ ''عدالت میں الٰہ آباد والے بنگلے کی پیشی ہے...... تاریخ آ گئی ہے، ہمارا وہاں جانا ضروری ہے۔''

''کیا میں بھی وہاں جاؤں گا؟'' وجے نے پوچھا۔

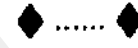
''اور کیا......! کیا میں اس عمر میں اکیلی یہ دوڑ دھوپ کروں گی!'' اوما دیوی نے جواب دیا۔

''نہیں ماں، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وجے جلدی سے بولا۔ ''آج نہیں تو کل مجھ ہی کو سب کام سنبھالنے ہیں۔ تم کہو تو میں اکیلا ہی الٰہ آباد چلا جاؤں؟''

''اس بار تو مجھے بھی تیرے ساتھ جانا ہوگا۔ تیری ملاقات وکیل صاحب سے کرا دوں، اس کے بعد تو اکیلا جا سکتا ہے۔ مسٹر اور مسز گلاٹھی سے بھی تجھے ملوا دوں گی۔ وہ لوگ بھی تو تجھ سے ملنا چاہتے ہیں، تجھے دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے تجھے جس وقت

دیکھا تھا تو بہت چھوٹا تھا۔"

وجے خاموش ہوگیا۔ ماں کی خوشی ہی اب اُس کی خوشی تھی۔ ماں کے لئے وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔



نینی، الہ آباد کے ریلوے اسٹیشن پر وجے اور اوما دیوی اُترے تو مسٹر اور مسز گلاٹھی نے ان کا استقبال کیا۔ وجے کو تو وہ دونوں میاں بیوی دیکھتے ہی رہ گئے۔ شکل سے وجے اُنہیں اُداس اور رنجیدہ سا لگ رہا تھا، لیکن اُس کے انداز اور برتاؤ میں بڑا سلیقہ تھا۔ اُس نے بڑے ادب سے ان دونوں کو "آداب" کہا۔ وہ دونوں وجے کو دیکھ کر اس قدر خوش ہوئے کہ انہوں نے بے ساختہ وجے کو گلے لگا لیا اور اُس کی خوب بلائیں لیں۔ پھر وجے اور اوما دیوی اُن کی کار میں بیٹھ کر بنگلے پہنچے۔

مسز گلاٹھی کے بنگلے سے اوما دیوی نے اپنے وکیل کو فون کیا۔ سلسلہ مل گیا تو انہوں نے وکیل سے کچھ ضروری اور اہم باتیں کیں۔ مسٹر گلاٹھی نے ایک کار اور ڈرائیور ان لوگوں کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ ان کے پاس کئی اور کاریں بھی تھیں۔

لگ بھگ دس بجے اوما دیوی اپنے وکیل کے گھر پہنچیں۔ انہوں نے وکیل صاحب کا وجے سے تعارف کرایا۔ وکیل صاحب نے وجے سے اپنے پاس رکنے کو کہا اور اوما دیوی سے کچھ کاغذات پر دستخط کروائے۔

"اب آپ چاہیں تو واپس جاسکتی ہیں۔" وکیل صاحب نے اوما دیوی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" کہہ کر اوما دیوی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اوما دیوی کو ڈرائیور واپس مسٹر گلاٹھی کے بنگلے لے آیا۔

وجے کا آدھا دن عدالت میں گزر گیا۔ پھر وہ نینی کے لئے واپس چل دیا۔ مقدمے کی نئی تاریخ مل گئی تھی۔

اُس کے پاس وہی کار تھی جس میں اوما دیوی گئی تھیں۔ انہوں نے گھر پہنچ کر وجے کے لئے کار بھجوا دی تھی کہ واپسی میں اُسے پریشانی نہ ہو۔

مسٹر گلاٹھی کے بنگلے کی طرف جاتے ہوئے شہر ہی میں ایک جگہ وجے کی کار اچانک ایک اور کار سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

دونوں کاریں رُک گئیں۔ دوسری کار کو دیکھ کر وجے کا دل تیزی سے دھڑک اُٹھا۔ وہ سفید غیر ملکی کار وجے کے لئے نئی نہیں تھی۔ وجے نے پھر بھی تصدیق کی خاطر کار کی نمبر پلیٹ دیکھی۔ جب کار کے اندر بیٹھے ہوئے شخص پر وجے کی نظر پڑی تو اُچھل پڑا۔ اس کار کو بھی ڈرائیور ہی چلا رہا تھا۔ اس کی پچھلی سیٹ پر رائے صاحب بیٹھے تھے۔

وجے کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ رائے صاحب بھی وجے کو دیکھ کر چونک اُٹھے تھے۔ وہ بہ عجلت کار سے اُترے۔ ڈرائیور نے کار ایک طرف فٹ پاتھ کے ساتھ روک دی۔ وجے اپنی کار سے اُترا۔ اُس کا ڈرائیور کار کو آگے سڑک کے کنارے لے گیا۔

"وجے بیٹا! تم اور یہاں؟" رائے صاحب نے کہا۔ اُن کے چہرے سے ابھی تک حیرت اور بے یقینی جھلک رہی تھی۔

"میں یہاں ایک مقدمے کے سلسلے میں آیا تھا۔" وجے نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا، پھر پوچھا۔ "انشو کیسی ہے؟"

رائے صاحب نے جواب دینے سے پہلے اوپر سے نیچے تک بہ غور وجے کا جائزہ لیا۔ اُداس اور پژمردہ چہرہ، سوکھے لب، ویران آنکھیں، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، رخسار پچکے ہوئے، لاغر جسم! وجے واقعی چلتی پھرتی ایک لاش لگ رہا تھا۔

وجے کی حالت دیکھ کر بے اختیار رائے صاحب نے سرد آہ بھری، پھر بولے۔ "اُس لڑکی کو ہم نے بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کے راضی کیا ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح حالات سے سمجھوتا کرنے پر آمادہ ہوگئی ہے۔ وشال کے ساتھ آج اُس کی شادی ہے...... اسی علاقے کا رہنے والا ہے وشال۔"

یہ سن کر وجے کے دل میں ٹیس سی اُٹھی۔ حالانکہ اُسے خوش ہونا چاہئے تھا کہ ایک محبت اپنے انجام تک پہنچ رہی تھی، تلخ انجام تک!

وجے کی مرضی یہی تو تھی کہ انشو اُسے بھول جائے۔ انشو کی شادی اسی کا ثبوت تھی کہ اُس نے زندگی کے جلال و جمال کو اصل رنگ میں دیکھ لیا ہے اور اسے بھول گئی ہے۔ اب وہ ایک نیا گھر بسا رہی تھی۔ اس پر بھی وجے کا دل تڑپتا رہا۔

رائے صاحب کچھ دیر اُسے دیکھتے رہے پھر بولے۔ "بمبئی میں انشو کی شادی نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ میں نے شروع میں اپنے تمام جاننے والوں، دوستوں اور

عزیزوں کو بتایا تھا، انشو کی شادی وشال سے ہو گی۔ اس کے بعد سب کو یہ اطلاع دی کہ اب تم انشو کے جیون ساتھی ہو گے۔ اب اگر میں دوبارہ یہ اعلان کرتا کہ انشو پھر وشال کے ساتھ شادی کر رہی ہے تو ظاہر ہے لوگ میرا مذاق اُڑاتے۔ پھر انشو کی بھی مرضی نہیں تھی کہ اُس کا بیاہ بمبئی میں ہو۔ اُس نے تو ہمارے بنگلے پر تمہاری برات آنے کا خواب دیکھا تھا، کسی اور کا نہیں!''

جواب میں وجے نے کچھ نہ کہا۔ وہ صرف انشو کے بارے میں سوچتا رہا۔ غیر ارادی طور پر اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''بیٹا!'' رائے صاحب نے اُسے مخاطب کیا۔ ''ہم ہیملکن روڈ پر ٹھہرے ہیں، برات وہیں آئے گی۔ اگر آنا چاہو تو آ جانا، مگر بہتر یہ ہو گا کہ انشو کو تم دُور ہی سے دیکھو اور وہ تمہیں نہ دیکھ سکے۔ وہ...... وہ ابھی تک تمہارے لئے آنسو بہاتی ہے...... چپکے چپکے روتی رہتی ہے...... اور آنسوؤں پر کسی کا بس بھی تو نہیں ہے...... کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ اسے بتا دوں، وہ گناہ کی مرتکب ہو رہی ہے۔ اسے تمہارے لئے نہیں رونا چاہئے۔ پھر یہ سوچ کر چپ ہو جانا پڑتا ہے کہ کہیں حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد وہ اپنی جان نہ دے دے۔''

ابھی تک وجے خاموش تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، مجھے بھی تو اس حقیقت کا علم ہے پھر بھی میں جی رہا ہوں۔ اگر انشو کی چاہت گناہ تھی تو میں نے دانستہ تو یہ گناہ نہیں کیا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ جو کچھ ہوا، انجانے میں ہوا۔ میں نے کبھی جان کر انجان بننے کی کوشش نہیں کی۔ زندگی نے مجھے اب تک محرومیوں کے سوا دیا بھی کیا ہے...... اگر مجھے قصوروار مان بھی لیا جائے تو میری ماں کا کیا قصور ہے؟ اُنہیں وقت اور حالات نے ناکردہ گناہ کی سزا کیوں دی......؟ شوہر سے انہیں سچی محبت نہیں ملی۔ تقدیر نے اُن کے ساتھ دھوکا کیا اور...... اور پھر جب وہ کڑا وقت جھیل چکی تھیں تو ان کے بچے اغواء کر لئے گئے۔ ان کا یہ زخم نہیں بھر سکا تھا کہ وہ بالکل اکیلی رہ گئیں۔ اُن کا شوہر چل بسا۔ کچھ بھی سہی، شوہر کی موجودگی گھر کو بکھرنے نہیں دیتی۔ عورت کو ایک آس رہتی ہے کہ ''پنچھی'' اگر اپنی ڈال سے اُڑ بھی گیا ہے تو ایک دن ضرور واپس آئے گا۔ یہی اُمید اُسے زندہ رکھتی ہے۔ کوئی کسی کا بدل نہیں ہوتا۔ پیار کے مختلف رنگ ہیں، روپ ہیں۔

کہیں پیار شوہر سے ملتا ہے اور کہیں اولاد اپنے ماں باپ کو ایسی محبت سے نوازتی ہے کہ اس کے لئے دل سے دُعا نکلتی رہے۔

وجے انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ چونک اُٹھا۔ رائے صاحب کی آواز اُس نے سنی تھی جو کہہ رہے تھے۔ ''اچھا بیٹا، میں چلتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے رائے صاحب نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''مجھے ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔''

''جی۔'' وجے صرف اتنا ہی کہہ سکا، وہ بھی بڑی مشکل سے...... رائے صاحب چلے گئے تو وہ اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔

رائے صاحب نے اپنی دانست میں وجے کی فکر دُور کرنے کے لئے اُس کے زخم پر مرہم رکھ دیا تھا، مگر وجے پر مختلف ردِعمل ہوا۔ اُس کے وجود میں خوابیدہ طوفان گویا پھر سے جاگ اُٹھے تھے۔ دردِ دل میں اضافہ ہو گیا تھا، تڑپ اور بڑھ گئی تھی۔ اُسے پیاس سی محسوس ہونے لگی۔ وہ کار میں بیٹھ گیا۔

''یہاں آس پاس کوئی بار ہے؟'' وجے نے ڈرائیور سے سوال کیا۔

''جی کئی ہیں۔''

''اُسی طرف چلو!'' وجے نے حکم دیا۔

ڈرائیور نے کار کا رُخ سول لائنز مارکیٹ کی طرف کر دیا۔ اس علاقے میں انگریزی شراب کی کئی دُکانیں تھیں اور بار بھی تھے۔

ایک بار کے سامنے کار رُک گئی۔ وجے بار کے اندر داخل ہوا۔ یہ دن کا وقت تھا اور مے نوشی عموماً شام سے رات گئے تک ہوتی ہے۔ اسی سبب بار ویران پڑا تھا۔ یوں بھی الٰہ آباد کے اس ذیلی اور چھوٹے سے شہر میں اس طرح کے بار زیادہ نہیں چلتے تھے۔

بار میں کسی اور گاہک کو نہ دیکھ کر وجے نے سوچا، مجھے میری خواہش کے مطابق تنہائی مل گئی۔ اُس نے کونے والی ایک میز سنبھالی اور بیرے کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ بیرے نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''لیس سر!''

وجے نے شراب لانے کا آرڈر دے دیا۔ بیرا احتراماً تھوڑا سا جھکا، مسکرایا اور چلا گیا۔ اس وقت تھوڑی بہت ٹپ بھی کافی ہوتی۔

دن کے وقت زیادہ ہی دھتی قسم کے مے خوار مے کدے کا رُخ کرتے ہیں۔ ایک

بناء پر وجے کو دیکھ کر انگریزی دُھن کا ایک ریکارڈ چلا دیا گیا۔ وجے کو یوں لگا جیسے انشو کی شادی پر شہنائی بج رہی ہو۔ اُس کے لئے یہ دُھن ناقابلِ برداشت تھی۔

ویٹر ٹرے میں جام رکھ کر لایا تو وجے صبر نہ کر سکا۔ اُس نے فوراً ہی جام اٹھا لیا اور سوڈا ملائے بغیر ہی پی گیا۔ پھر اُس نے مزید پیگ منگوائے اور انہیں یکے بعد دیگرے چڑھاتا چلا گیا۔ اُس کا دردِ دل ابھی تک کم نہیں ہوا تھا۔ وہ خود کو بھول جانا چاہتا تھا، انشو کو اپنے دل و دماغ سے نکال دینا چاہتا تھا، مگر اُس کی یہ کوشش اب تک کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ انشو کی یاد پھر اُس کے زخموں سے کھیلنے لگی تھی۔

انشو کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات اُس کے سامنے آتے اور گم ہونے کی بجائے اُسے گم کر دیتے، اُس کی نظروں کے سامنے ساکت ہو جاتے۔ آج انشو ہمیشہ کے لئے کسی اور کی ہونے والی ہے، اس خبر نے اُسے اور بے چین کر دیا۔ وہی اضطراب، وہی کرب، وہی خواب جو پہلے تھے، ازسرِ نو اُس کی رُوح کو مصلوب کرنے لگے۔ وہ اس روحانی اذیت سے بچتا بھی کیسے کہ تذبذب اب بھی اُس کے حواس پر چھایا ہوا تھا۔

خود کلامی اور سوچ وجے کو میکدے کی فضا سے بیگانہ کر گئی۔ ایسی کیفیت اس پر پہلے بھی گزری تھی، مگر آج درد کچھ سوا تھا۔ وہ نہ چاہنے کے باوجود انشو ہی کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔ اُس کا دل ابھی تک انشو کو نئے رُوپ اور نئی حیثیت میں قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

''ایسا کیوں ہے؟'' وہ بڑبڑایا۔ ''اس تذبذب کی کوئی وجہ میری سمجھ میں کیوں نہیں آتی.....؟ مجھے تو انشو کو اس نئے روپ میں تسلیم کر لینا چاہئے..... کیونکہ یہی..... یہی سچائی ہے۔ جو..... جو لوگ سچ کو جھٹلاتے ہیں، دنیا انہیں جھٹلا دیتی ہے۔''

ایک عجب احساسِ جرم تھا جس کا تجربہ اُسے پہلے نہ تھا۔ یہ وہی وجے تھا جو انتہائی خطرناک حالات میں بھی اپنے لئے راہ نکال لیتا تھا، مگر اس وقت راہ نکالنا کیسا، وہ خود کو ایک بند گلی میں محسوس کر رہا تھا۔

بار میں بیٹھے بیٹھے اُسے کافی دیر ہو گئی۔ اس عرصے میں کئی گاہک آئے اور چلے گئے لیکن وہ وہیں بیٹھا رہا۔ دن رفتہ رفتہ گزر گیا اور شام ہو گئی۔ دن بھر مے نوشی کے سبب اُس کی آنکھوں میں سرخی نمایاں تھی۔

اُس نے آٹھ بجے کے قریب نوجوانوں کے گروپ کو بار میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ جلدی جلدی اپنے گلاس خالی کر رہے تھے۔ ویٹر نے اُن کے آرڈر کی تکمیل پہلے ہی کر دی تھی۔ اُن کی عجلت سے پتہ چل رہا تھا جیسے وہ کسی تقریب میں شریک ہونے جا رہے ہیں یا پھر انہیں واپسی کی فکر ہے۔

وہ سبھی نوجوان خوش لباس تھے اور خوب ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ کچھ نے کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر پینا شروع کر دی اور کچھ اِدھر اُدھر بیٹھ گئے۔ چند نوجوان وجے کے برابر والی میز پر آ بیٹھے۔ ان کی باتوں سے وجے کو معلوم ہوا کہ وہ سب شادی کی ایک تقریب میں جا رہے ہیں اور براتی ہیں۔ برات اسی طرف سے گزر رہی تھی کہ انہوں نے بار دیکھا اور خاموشی کے ساتھ برات سے نکل کر وہاں آ گئے۔

ان نوجوانوں میں سے کسی کی زبانی وجے نے وشال کا نام سنا تو چونک اُٹھا۔

''بڑا ہی خوش قسمت ہے وشال!'' ایک نوجوان کہہ رہا تھا۔

''کیا حسین لڑکی ملی ہے اُسے!'' دوسرا نوجوان کہنے لگا۔ ''سنا ہے وہ حُسن کی دیوی ہے۔ اُس کی پلکیں سیدھی دل میں چبھنے لگتی ہیں۔''

''دیکھنے والا دل تھام کے رہ جاتا ہے۔'' کوئی بولا۔

''تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے ابھی اُسے دیکھ کر آئے ہو۔'' کسی نے اعتراض کیا۔

''اب تو دیکھ بھی لیں گے..... رشتے داری ہے، وشال اُسے چھپا کر تو نہیں رکھے گا۔''

وجے نے یہ باتیں سنیں تو وہاں بیٹھنا اُس کے لئے دوبھر ہو گیا۔ اُس نے اپنے سامنے رکھا ہوا جام خالی کیا، ویٹر کو بلا کر بل ادا کیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسی کے ساتھ لڑکھڑا گیا۔ کبھی کبھی جسم دماغ کا ساتھ نہیں دیتا۔ دن بھر مے خواری کی وجہ سے یہی کیفیت وجے کی تھی۔ کسی طرح اُس نے خود کو سنبھالا اور اس بار سے باہر نکل آیا۔ سامنے ہی اُسے برات کھڑی دکھائی دی۔

دولہا سہرا سجائے گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ اُس کے سامنے کچھ نوجوان ڈھولک کی تھاپ پر دیوانہ وار رقص کر رہے تھے۔ ہر طرف خوشی کا سماں تھا۔ آتش بازی سے وہ پورا علاقہ جگمگا اُٹھا تھا۔ پٹاخوں کی دھمک سے وہ جگہ گونج رہی تھی۔

وجے نے بڑی حسرت سے دولہا کو دیکھا اور سوچا، وشال کتنا خوش قسمت ہے!

دل کی گہرائیوں سے اُس نے انشو کے لئے دُعا کی۔ ''انشو سدا سکھی رہے، ہمیشہ ہنستی مسکراتی رہے، کلیوں میں کھلے، پھولوں میں مسکرائے اور...... اور اُسے میری عمر بھی لگ جائے۔'' دُعا کرتے ہوئے وجے کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ بھی انشو کی شادی میں شرکت کر کے اُسے دیکھے...... چھپ کر خاموشی سے دیکھے کہ وہ دُلہن بن کے کیسی لگ رہی ہے!

انشو کو دیکھے ایک زمانہ بیت گیا تھا۔ وجے نے سوچا، نہ جانے گزرے ہوئے وقت نے اُس کے ساتھ کیا ستم کیا ہوگا......؟ یہ سب کچھ اُس نے سوچا ضرور مگر عمل کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اُس کے قدم آگے بڑھتے بڑھتے رُک گئے۔ میکدہ جیسے اُسے اپنی طرف کھینچنے لگا۔

اپنے دل پر قابو پانے کے لئے ہی تو اُس نے خود کو غرقِ مے کر دیا تھا، اب اگر وہ برات کے ساتھ چلا جاتا تو کس طرح دل کو سنبھالتا! یہ احساس اُس کے رگ و پے میں نشتر بن کے اُتر گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ ایک بار پھر بار میں داخل ہو رہا تھا۔

وجے نے ایک بار پھر مے نوشی شروع کر دی۔ شاید اب وہ شراب نہیں پی رہا تھا بلکہ شراب اُسے پی رہی تھی۔ وہ اس معمے کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ انشو کی شادی ہونے سے اُس کا دل مطمئن کیوں نہیں ہوا؟ اُسے تو اب مطمئن اور خوش ہونا چاہئے تھا مگر۔

اسی طرح ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ شراب نوشی کی شدت اور زیادتی کی بنا پر وجے کو چکر آنے لگے، آنکھیں بند ہونے لگیں تو اُس نے اپنے سر کو جھٹک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہر شے اُسے گھومتی دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے تیسے اُس نے ویٹر کو بلا کے بل ادا کیا، پھر اُٹھا تو قدم بہکنے لگے۔ وہ گرتا پڑتا دیوار کا سہارا لے کر باہر نکلا اور بڑی مشکل سے کار تک پہنچا۔

''وا...... واپس...... چا...... چلو!'' اُس نے لڑکھڑاتی زبان میں ڈرائیور سے کہا اور پھر سیٹ پر ڈھیر ہو گیا۔

کار مسٹر گلاٹھی کے بنگلے میں داخل ہوئی تو وجے بڑی حد تک اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا۔ اُسے احساس تھا کہ وہ وہاں مہمان ہے۔

وجے نے وہاں اور بھی بہت سی کاریں کھڑی دیکھیں۔ مسٹر گلاٹھی نینی کے بڑے تاجر

تھے۔ ان کے بنگلے پر لوگوں کا آنا جانا رہتا تھا۔ شاید نینی کے تاجروں کی کوئی میٹنگ تھی۔ وجے نے ان کاروں کی طرف دیکھا اور اپنی کار سے نکل آیا۔ برآمدے میں پہنچا تو اُسے ڈرائنگ رُوم کا دروازہ نظر آیا جس پر ریشمی پردہ پڑا ہوا تھا۔ ڈرائنگ رُوم میں صرف مرد ہی بیٹھے تھے۔ اُس کی ماں اوما دیوی اور مسز گلاٹھی اندر کسی کمرے میں ہوں گی، وجے یہ سوچتا اور احتیاط کے ساتھ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔

گیسٹ روم بنگلے کے آخر میں تھا۔ وجے سر جھکائے اسی طرف چل دیا۔ اس وقت اُس کا دل کسی سے ملنے یا بات کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر لیٹنا چاہتا تھا۔ اُسے گیسٹ روم کا دروازہ کھلا ہوا ملا۔ وہ اندر جانے ہی والا تھا کہ رُک گیا۔ اُس نے اپنا نام سنا۔

''وجے تمہارا سگا بیٹا نہیں، پھر بھی تم اُس کے لئے سگی ماں کی طرح فکرمند ہو۔'' مسز گلاٹھی اوما دیوی سے کہہ رہی تھیں۔

وجے کو اپنی سماعت پر یقین سا نہ آیا۔ اُس کا سانس رُکنے لگا۔ سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ دروازے کی آڑ میں ہو کر وہ اندر ہونے والی گفتگو سننے لگا۔

''اُسے میں نے ہمیشہ اپنے ہی دل کا ٹکڑا سمجھا ہے۔'' یہ اوما دیوی کی آواز تھی۔ ''جیسی بے بی تھی، ویسا ہی میرے لئے وجے ہے۔ نہ جانے کہاں چلا گیا ہے! وہ تو یہاں کسی کو جانتا بھی نہیں۔''

''ارے آ جائے گا...... کوئی بچہ نہیں ہے کہ کھو جائے۔''

''پھر بھی۔'' اوما دیوی کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

عین اُسی لمحے وجے آندھی طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔ اوما دیوی اور مسز گلاٹھی دونوں ہی نے اُسے چونک کر دیکھا۔ وجے کو دیکھ کر اوما دیوی کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔

''کہاں چلا گیا تھا میرا لعل......'' فکر کے مارے اوما دیوی اپنی بات پوری نہ کر پائیں۔

وجے نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور پھر اُن سے سوال کیا۔ ''ماں...... آج...... مجھے بالکل سچ سچ بتانا، میں کون ہوں؟ کہہ دو کہ میں تمہارا بیٹا نہیں ہوں...... کہہ دو کہ میرا

اور تمہارا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔''

''ارے ارے!'' اوما دیوی ہڑبڑا گئیں۔ مگر پھر انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔

''بتائیں نا......! میرے سوال کا جواب دیں۔'' وجے خاموش نہ رہ سکا۔

''تو یہ کیسی باتیں کر رہا ہے...... تو، تو میرے دل کا ٹکڑا ہے میرے چاند!'' اوما دیوی بولیں۔

''نہیں ماں، نہیں...... میں تمہارا بیٹا نہیں ہوں۔'' وجے نے کہا۔ ''ابھی تم جو باتیں کر رہی تھیں، وہ میں سن چکا ہوں۔'' پھر وجے مسز گلاٹھی کی طرف گھوم کر بولا۔ ''آنٹی! میں نے آپ کی بات بھی سن لی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پھر اوما دیوی سے مخاطب ہوا۔ ''کہہ دو ماں کہ میرا تمہاری اولاد سے کوئی تعلق نہیں ہے...... میں پرایا ہوں...... ہاں وہ...... وہ تمہاری سگی بیٹی تھی۔''

''سن تو سہی بیٹا!'' اوما دیوی نے پھر بات بنانا چاہی۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ حقیقت جان کر وجے کو صدمہ ہوا ہے۔

''ماں!'' وجے تقریباً چیخ اٹھا، پھر سنبھل کر ہانپتے ہوئے بولا۔ ''ماں! تمہیں یہ بتانا ہی پڑے گا کہ...... کہ سچ کیا ہے......! یہ میری زندگی کا سوال ہے اور...... وقت بہت کم ہے...... اگر یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو تمہارا بیٹا زندہ نہیں رہ سکے گا۔''

اوما دیوی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وجے کی تڑپ میں عجیب سی بات تھی۔ انہوں نے مسز گلاٹھی کی طرف دیکھا اور پھر وجے سے کہنے لگیں۔ ''بیٹا! میری شادی کے سات سال تک جب اولاد نہ ہوئی تو میں نے تجھے گود لے لیا تھا۔ اس وقت تو صرف ایک دن کا تھا، مگر تجھے گود لینے کے ٹھیک ڈیڑھ سال بعد اُمید کے برخلاف میں ایک بچی کی ماں بن گئی جس سے تیرے پتا جی بہت پیار کرتے تھے۔ وہ اسی لئے بے بی کے اغواء ہونے کا صدمہ برداشت نہ کر سکے، لیکن بیٹا! میں نے تجھے ماں کا پیار دینے میں کوئی کمی نہیں کی۔ تو اب بھی میری آنکھوں کا تارا ہے۔ تم دونوں کے اغواء ہو جانے پر میں رات دن آنسو بہاتی رہتی تھی......'' اوما دیوی کہہ رہی تھیں۔

وجے کا ذہن کہیں اور ہی تھا۔ وہ سن کر بھی جیسے اوما دیوی کی بات نہیں سن رہا تھا۔

''تو یہ بات ہے!'' وہ بڑبڑایا۔ ''اسی لئے میرے دل نے انشو کو کبھی بہن کے روپ میں

قبول نہیں کیا۔ وہ...... وہ میری بہن تھی ہی نہیں......! انشو کے ساتھ میرا کوئی خون کا رشتہ ہوتا تو یقیناً ایسا نہ ہوتا۔'' وجے کے دل میں اُمید کی ایک کرن جگمگانے لگی۔ وہ تیزی کے ساتھ باہر جانے کے لئے قدم اٹھانے لگا۔

اوما دیوی کچھ نہ سمجھ سکیں کہ وجے کو کیا ہو گیا ہے۔ بڑبڑاتے ہوئے اُس کی آواز دھیمی تھی۔ انہوں نے وجے کو آواز دی۔ ''بیٹا! مجھے چھوڑ کر مت جانا......! میں نے ہمیشہ تجھے...... اپنی اولاد سمجھا ہے۔ وجے...... وجے!'' اوما دیوی کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی ''مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جا!''

وجے کے قدم پھر بھی نہ رُکے تو اوما دیوی اُسے آواز دیتی ہوئی دروازے تک آ گئیں۔

''ماں جی!'' وجے کو اوما دیوی پر ترس آ گیا۔ اُس نے پلٹ کر کہا۔ ''میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا...... بس ابھی آتا ہوں۔''

کار وہیں موجود تھی اور ڈرائیور بھی تھا۔

''ڈرائیور! جلدی چلو ایلکن روڈ۔'' وجے کار میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

ڈرائیور نے حکم کی تعمیل میں کار دوڑا دی۔ سڑک پر اس وقت ٹریفک برائے نام تھا اس لئے آگے بڑھنے میں کوئی پریشانی نہیں ہو رہی تھی۔ رفتار تیز ہونے کے باوجود گاڑی ڈرائیور کے قابو میں تھی۔

وجے کے دل کی دھڑکن کار کی رفتار سے بھی تیز تھی۔ اب بھی وقت تھا، پھیروں میں کچھ تو دیر لگتی۔ ایلکن روڈ کے قریب پہنچ کر ڈرائیور نے سوال کیا۔ ''صاحب! کدھر چلوں؟''

''وہاں کسی بنگلے میں شادی کی تقریب ہو رہی ہے...... وہیں چلو!'' وجے نے عجلت میں کہا۔

''دیکھ لیتے ہیں صاحب! جو بنگلا سجا ہوا نظر آئے گا، وہیں تقریب ہوگی۔'' ڈرائیور بولا۔

وجے دل ہی دل میں دُعا کر رہا تھا کہ وہ پھیرے ہونے سے پہلے پہنچ جائے اور انشو کی شادی وشال کے ساتھ نہ ہو۔ اتنا تڑپنے اور آنسو بہانے کے بعد تقدیر اُسے دھوکا نہ دے دے۔ اس وقت وجے کی خوشیوں کا انحصار اپنی منزل تک پہنچ جانے پر تھا۔ منزل کئی بار پاس آ کر دُور ہو گئی تھی۔ وہ اس کا فریب نظر ہی ہو گا کہ منزل قریب آ گئی ہے ورنہ تو گردِ کارواں کے سوا کچھ بھی اُسے نہ ملا تھا۔

ایلکن روڈ پر جلد ہی وہ سجا سجایا بنگلا نظر آ گیا جہاں شہنائی بج رہی تھی۔ یہی وجے کے خوابوں کی منزل تھی، مگر خواب سچے کب ہوتے ہیں! سوطرح کے وہم وجے کو گھیرے ہوئے تھے۔ ان اندیشوں اور وسوسوں کا فیصلہ اگلے چند لمحوں میں ہونے والا تھا۔

بنگلے کے باہر سڑک کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ دُور دُور تک کاروں کی قطاریں تھیں۔

ڈرائیور نے مین گیٹ سے دُور ہی کار روک دی۔ وجے بہ عجلت کار کا دروازہ کھول کر اُترا اور اس بنگلے میں داخل ہو گیا۔

لان میں مہمانوں کی بھیڑ تھی۔ پنڈت کے اشلوک پڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔ وجے لوگوں کے درمیان میں سے راستہ بناتا ہوا آگے بڑھا۔ ایک شامیانے کے نیچے دولہا دلہن اپنے عزیزوں کے ساتھ کھڑے تھے۔

وشال، انشو کے گلے میں ہار ڈال چکا تھا۔ اب انشو اُس کے گلے میں ہار ڈالنے والی تھی۔ یہ منظر وجے کو گراں گزرا۔ اب تو جیسے انشو پر اُسی کا حق تھا۔ اُس نے چیخ کر انشو کو روکنا چاہا، مگر اسی لمحے کوئی شخص آگے بڑھتے ہوئے اُس سے ٹکرا گیا۔ وہ لڑکھڑا گیا اور جب اُس نے دوبارہ سامنے دیکھا تو انشو، وشال کے گلے میں ہار ڈال چکی تھی!

وجے کی چیخیں اُس کے اندر ہی گھٹ کر رہ گئیں، ہونٹ لرزنے لگے اور دل کرچی کرچی ہو گیا۔ اُس کے سینے میں ایسا درد اُٹھا کہ دم گھٹنے لگا۔

ایک بار پھر وہ بھیگی پلکوں سے ایک ایسا منظر دیکھ رہا تھا جو اُس کی رُوح پر چرکے لگانے کو کافی تھا۔

وہ اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا، کیا میں انشو کے بغیر جی سکوں گا؟

انشو اب کسی اور کی ہو چکی تھی۔ اُسے یہ حق نہیں تھا کہ بھری محفل میں انشو کی بے عزتی کا مرتکب ہوتا۔ یہ انشو کی بے عزتی ہی ہوتی کہ وہ اس شخص کے ساتھ با وفا نہیں تھی جو اُس کا جیون ساتھی بن چکا ہے۔

پیار کو جب مصلحتوں کی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ زندگی میں اگر مصلحتیں نہ ہوں، اپنے علاوہ دوسروں کا خیال بھی نہ رکھا جائے تو پھر آدمی، آدمی نہیں رہتا۔ اپنے آشیانے کے تنکوں کو جلتے ہوئے دیکھ کر کون چپ رہتا ہے، لیکن وجے کو

چپ رہنا پڑا۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے شعلوں کو لپکتے دیکھتا رہا اور تماشائی بنا رہا۔ خود بھی وہ ایک ایسا تماشائی تھا جسے دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ بیک وقت وہ تماشا بھی تھا اور تماشائی بھی! وہ اپنا احتساب کرنے لگا۔ غلطی کس نے کی؟ اُس نے یا انشو نے؟

کوئی اُس کے اندر سے بولا، انشو نے تمہیں نہیں چھوڑا بلکہ تم نے اُسے چھوڑ دیا ہے۔ انشو نے تو بے وفائی نہیں کی۔

''ہاں وہ بے وفا نہیں تھی......'' وجے بڑبڑایا۔ ''بے وفائی تو میں نے کی۔''

پھر جب اُس کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسو رخساروں تک آنے لگے تو اُس نے اپنا سر جھکا لیا اور وہاں سے لوٹ آیا...... اُس کی بھیگی پلکیں اس قدر بوجھل ہو گئی تھیں کہ نظر دُھندلانے لگی۔

انشو نے اُسے جرم کی راہ سے ہٹا کر انسان بنایا تھا، چاہا تھا...... اُسے پیار دیا تھا اور...... وہ انشو کو آنسوؤں کے سوا کچھ نہ دے سکا۔ یہ سوچتے ہوئے وجے خود کو گنہگار محسوس کرنے لگا۔

''اب میری زندگی میں ایک ماں رہ گئی ہے اور میں اُسے کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا۔'' وہ اپنی عادت کے مطابق بڑبڑا رہا تھا۔

پھر وجے نے چند فیصلے کیے۔ یہ فیصلے اوما دیوی، انشو، وشال، رائے صاحب سبھی کے لیے مناسب اور ضروری تھے۔ اوما دیوی کو یہ نہیں بتانا تھا کہ ان کی بیٹی انشو ہے اور زندہ ہے۔ انشو کو بھی اصل بات کبھی نہیں بتانی تھی۔ اُسے حقیقت کا پتہ چل جاتا تو وہ وشال کے ساتھ ہنسی خوشی نہ رہ پاتی۔ ضروری تو نہیں کہ ہر سچائی کو بے نقاب کر دیا جائے!

وجے سوچ رہا تھا کہ میں اپنے پیار کو رُسوا نہیں ہونے دوں گا، چاہے ساری زندگی اسی طرح تڑپ تڑپ کر گزر جائے۔ میں روز جیوں گا، روز مروں گا مگر انشو اور وشال کی زندگی میں زہر نہیں گھولوں گا۔ وہ راز کبھی نہیں کھولوں گا جو میرے ساتھ ساتھ کسی دوسرے کی زندگی کو بھی آنسوؤں میں ڈبو دیں۔

بھیگی پلکیں، بھیگی ہی رہیں اور وجے نے زبان نہیں کھولی۔ اُس نے یہ قربانی دے کر شاید اچھا ہی کیا کہ اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا......!!

♦ ...... ♦

کملا

اُس دن ہرناتھ کو گنگا میں نہانے کا نتیجہ ہاتھوں ہاتھ ہی مل گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ کوبی کرتا ہوا کلکتے سے اپنے گاؤں لوٹ آیا۔

بات کوئی ایسی غیر معمولی نہیں تھی کیونکہ ایسے واقعات پہلے بھی ہوتے رہتے تھے۔ یوں دیکھا جائے تو موت بھی کوئی غیر معمولی نہیں لگتی، ہر پل اس بھری دنیا میں لوگ مرتے رہتے ہیں لیکن جو مرتا ہے اس کے لئے موت معمول کے مطابق نہیں ہوتی یا وہ اس معمولی بات کو معمولی سمجھنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ہرناتھ کے ساتھ تھا۔ میلوں ٹھیلوں میں لوگ ایک دوسرے سے بچھڑ ہی جاتے ہیں۔ پھر وہ یا تو کبھی زندگی کے کسی موڑ پر مل جاتے ہیں یا نہیں ملتے۔ یہ ملنا یا بچھڑ جانا اسی سبب غیر معمولی نہیں کہلائے گا۔

ہرناتھ اپنی بیوی، شادی شدہ مگر نوجوان و انتہائی حسین بیٹی کملا اور گاؤں کی دوسری عورتوں کو ساتھ لے کر گنگا اشنان کے لئے کلکتے گیا تھا۔ وہاں وہ اپنی خوبصورت و پُرکشش بڑی بڑی جادو بھری آنکھوں والی کملا کو کھو آیا تھا۔ کملا کا قد عام بنگالی لڑکیوں سے دراز تھا، ناک نقشہ ایسا کہ دیکھنے والا دیکھے تو دیکھتا رہ جائے۔ وہ جب اپنے سر کے بال کھولتی تو کولہوں سے نیچے تک پہنچتے۔ رنگ بھی اُس کا صاف تھا۔ بنگالی برہمنوں کی عورتیں معلوم نہیں کیوں کالی یا سانولی نہیں ہوتیں! کملا بھی برہمن زادی تھی۔ ہرناتھ نے اُس کی شادی سولہویں سال ہی میں کر دی تھی اور شادی کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ وہ ان دنوں اپنی سسرال سے میکے آئی ہوئی تھی کہ گنگا نہانے کا زمانہ آ گیا۔

الٰہ آباد میں گنگا جمنا ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں، پھر یہ دونوں دریا گنگا یا جمنا کہلانے کے بجائے دریائے برہم پتر کہلاتے ہیں۔ ''برہم پتر'' کا لفظی مطلب ''برہما کا بیٹا'' ہے۔ ''برہما'' ہندو عقیدے کے مطابق اس ذاتِ واحد کو کہتے ہیں جس نے یہ کائنات بنائی ہے۔ دریا زندگی کی علامت ہوتے ہیں۔ جہاں دریا ہوگا وہاں زندگی ہو

گی۔ دنیا بھر کی تہذیبوں نے دریاؤں کے کنارے ہی جنم لیا ہے۔ سو گنگا بھی ایک ایسا ہی دریا ہے، دریائے فرات اور دریائے نیل کی طرح! ہر چند کہ اس کا وجود الٰہ آباد میں جمنا سے مل کر ختم ہو جاتا ہے، پھر بھی ہندوؤں کا کہنا ہے کہ دریائے برہم پتر دراصل گنگا ہی ہے۔ اسی کا نام دریائے ہگلی بتایا جاتا ہے۔ (دریائے ہگلی ہی پر مشہورِ زمانہ ہاوڑا برج تعمیر کیا گیا تھا جو ہاوڑا اور کلکتہ دونوں شہروں کو آپس میں ملاتا ہے) یوں کلکتے میں دریائے ہگلی کے کنارے ''گنگا اشنان'' ہوتا ہے۔ جب کہ وہاں جغرافیائی طور پر دور دور تک گنگا کا وجود نہیں، مگر ہرناتھ جیسے برہمنوں کے لئے تو یہ سوچنا بھی گناہ تھا۔

اشنان کی نیک ساعتوں میں کچھ ثواب کمانے کے مقصد سے ہرناتھ نے کلکتے کا رُخ کیا تھا۔

نہانے کے بعد گاؤں کی عورتوں نے ایک دوسرے کی ساڑھیوں کے پلو آپس میں باندھ لئے کہ بچھڑ نہ جائیں۔ میلے کی بھیڑ میں ان عورتوں کی زنجیر سی بنی آگے بڑھ رہی تھی کہ انہیں ایک جگہ رُک جانا پڑا۔ وہ ایک چوراہا تھا اور وہاں بے پناہ ہجوم تھا۔

اس جگہ ایک انگریز پادری کئی دیسی عیسائیوں کے ساتھ بنگلہ زبان میں لیکچر دے رہا تھا۔ ''اے بنگال کے رہنے والو! تم کیسے لوگ ہو! کیا تمہارے اندر نام کو عقل نہیں؟ اگر گنگا میں غوطہ لگا لینے سے آدمی سورگ (جنت) میں جا سکتا ہے تو اس میں تیرنے والی مچھلیاں اور پانی کے دوسرے کیڑے مکوڑے بھی جنت میں چلے جاتے اور تمہارے دیوتا جنت چھوڑ کر بھاگ لیتے۔ تم سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کیا شیطان چھین کر لے گیا ہے؟ یہ دریا جسے تم پاک بتاتے ہو، درحقیقت اتنا میلا ہو چکا ہے کہ اس میں صاف کپڑا ڈالا جائے تو میلا ہو جائے۔ تو پھر اس میں نہانے سے میل کیسے دُور ہو سکتا ہے۔''

لوگ اُس پادری کو گھیرے کھڑے تھے۔ ہجوم اس قدر تھا کہ اس کے درمیان سے راستہ بنا کے نکل جانا کسی طرح ممکن نہیں تھا۔ سبھی کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ کوئی اس انگریز مبلغ کی زبان سے بنگلہ سن کر دنگ تھا تو کوئی اُس کے دلائل کی تعریف کر رہا تھا۔

ہرناتھ اپنے خاندان کی عورتوں کے آگے آگے راستہ بنانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ وہ کبھی آگے بڑھنے کے لئے زور لگاتا، کبھی مڑ کر عورتوں کو دیکھتا کہ وہ موجود تو ہیں! جب وہ آگے نہ بڑھ سکا تو پلٹ کر عورتوں کو مخاطب کیا۔ ''خوب مضبوطی سے ایک

دوسرے کے ہاتھ پکڑے رہنا!''

عیسائی انگریز مبلغ کھلے عام ہندوؤں کے مذہبی عقائد کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ سو اس پر کچھ نوجوان مشتعل ہو گئے۔ انہی میں سے ایک نوجوان نے پادری پر ہاتھ چھوڑ دیا۔ پادری کی ٹوپی سر سے الگ جا گری۔ اسی کے ساتھ کئی اور نوجوان، پادری کے گورے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے بعد دونوں دھڑوں میں ہاتھا پائی اور مار پیٹ ہونے لگی۔ اس دھکم پیل میں کون کدھر گیا، کچھ پتہ نہ چلا۔

بے چارہ ہرناتھ بھی اس ہنگامے میں پھنس گیا۔ ایک گھڑ سوار پولیس والا دُور کھڑا یہ سارا منظر تصویرِ حیرت بنا دیکھ رہا تھا۔ جب ہنگامہ زیادہ بڑھا تو وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا بھیڑ میں گھس گیا۔ کچلے جانے کے ڈر سے لوگ سر پر پاؤں رکھ کر گرتے پڑتے بھاگنے لگے۔ بھیڑ کائی کی طرح پھٹ گئی۔ پانچ سات منٹ کے اندر ہی چوراہا بالکل صاف ہو گیا۔

ہرناتھ نے کسی طرح اپنے گاؤں کی عورتوں کو ایک جگہ جمع کر کے کہا۔ ''اِدھر چلو!''

اسی وقت ہرناتھ کی بیوی اُس کے قریب آ کر دھیرے سے بولی۔ ''اجی کملا کہاں ہے؟ وہ کہیں دکھائی نہیں دیتی۔''

ہرناتھ بیزار سے لہجے میں کہنے لگا۔ ''کیا مصیبت ہے...... کہاں گئی یہ کملا؟...... سبھی سے مسلسل کہہ رہا ہوں کہ احتیاط سے چلو، کہیں کوئی چھوٹ نہ جائے۔ مگر میری سنتا کون ہے۔'' پھر وہ پوری طاقت سے پکارنے لگا۔ ''کملا!...... او کملا!''

لیکن ہرناتھ کی آواز کے جواب میں کسی طرف سے کوئی صدا نہ اُبھری۔ تب عورتوں کو ایک جگہ کھڑا کر کے ہرناتھ اُس بڑے شہر بلکہ شہروں کے شہر کلکتے کے پُرہجوم رستوں میں کملا کو تلاش کرنے لگا۔ ہرناتھ کو ایک جگہ کچھ رضا کار نظر آئے۔ اُن کے سروں پر گاندھی کیپ تھی اور وہ کھدر کے کُرتے پہنے ہوئے تھے۔ گنگا اشنان کی خاطر آئی ہوئی عورتوں کے لئے وہ رضا کار گاڑی وغیرہ کا بندوبست کر رہے تھے۔ ہرناتھ نے اپنا دُکھڑا اُنہیں کہہ سنایا۔

کچھ رضا کار بھی کملا کی تلاش میں ہرناتھ کے ساتھ ہو لئے۔ دو گھنٹے لگاتار دوڑ دھوپ کے باوجود بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ہرناتھ مایوس ہو کر واپس عورتوں کے پاس پہنچ گیا۔ ان عورتوں کو ساتھ لے کر وہ اس جگہ پہنچا جہاں ٹھہرا تھا، پھر پولیس تھانے چلا گیا

تا کہ کملا کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دے۔

تقریباً ایک ماہ تک پولیس، رضا کاروں اور ہرناتھ نے مل کر شہر کا کونا کونا چھان مارا مگر کملا کا کوئی سراغ نہ ملا۔ جوان اور شادی شدہ بیٹی کے غائب ہو جانے پر ایک باپ کلکتہ جیسے بڑے شہر میں جو کچھ کر سکتا تھا، ہرناتھ نے کیا، لیکن اُس کی تمام کوششیں رائیگاں ثابت ہوئیں۔ مجبوراً ہرناتھ نے گاؤں واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ گاؤں کی جو عورتیں اُس کے ساتھ کلکتے آئی تھیں، وہ بھی لوٹ گئیں۔

بنگال ہی کے ایک ضلع بردوان کے ایک گاؤں میں ہرناتھ کا گھر تھا۔ اپنے گھر میں اُس کی خاصی عزت تھی، وقار اور دبدبہ تھا۔ وہ آدمی تو سیدھا سادھا تھا مگر اُسے غصہ بہت آتا تھا۔ اُس کے دل میں جو بات ہوتی، کہہ دیتا اور چھل فریب سے دُور رہتا۔ ہرناتھ کے باپ دادا پروہت تھا اور اچھا خاصا کما کر چھوڑ گئے تھے۔ ہرناتھ نے بھی برہمن ہونے کے ناتے یہی ''پیشہ'' اختیار کر لیا تھا۔ آس پاس کے دیہات میں متعدد امیر گھرانوں سے ہرناتھ کے روابط تھے۔ مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لئے اُسے بلایا جاتا تھا۔ نقد روپوں کے علاوہ اُس کے پاس زمین بھی کافی تھی۔ زرعی زمین کی کاشت سے بھی اُسے خاصی یافت تھی۔ یوں بڑے آرام سے اُس کی گزر بسر ہو رہی تھی۔ مذہبی کتب کے مطالعے اور عبادات سے بھی ہرناتھ کو بڑی رغبت تھی۔ صبح سے شام تک مختلف جگہوں سے اُسے بلاوے آتے رہتے۔ اس کی وجہ سے پوجا پاٹ میں اُسے دُشواری ہوتی تھی۔

گاؤں میں برہمنوں کے اور بھی گھر تھے، مگر کسی کے بھی حالات ہرناتھ سے اچھے نہیں تھے۔ مشکل وقت میں ہرناتھ اُن کے کام آتا رہتا تھا۔ اسی بنا پر گاؤں میں ہرناتھ کے حمایتیوں کی کمی نہیں تھی۔ شام کو گاؤں کے لوگوں کی چوپال بھی ہرناتھ کے چبوترے پر ہی لگتی۔ ہرناتھ کے گھر کا چبوترا ہر شام چوپال کے لئے مخصوص ہوتا۔ جب ہرناتھ کلکتے سے لوٹ کر گاؤں پہنچا اور چوپال لگی تو اُس نے روتے ہوئے اپنی بیٹی کملا کی گمشدگی کا سارا ماجرا لوگوں سے کہہ سنایا۔ گاؤں والوں کو پہلے ہی سے اس واقعے کا علم ہو چکا تھا۔ ان معلومات کا ذریعہ گاؤں کی وہ عورتیں تھیں جو ہرناتھ کے ساتھ کلکتے گئی تھیں۔

چوپال کا وقت ختم ہو گیا تو ہرناتھ جھنجل جھنجل سا گھر میں داخل ہوا اور اپنی بیوی سے

کہنے لگا۔ ''کملا اگر مر جاتی تو اچھا ہوتا۔''

جواب میں اُس کی بیوی کچھ نہ بولی۔ البتہ اُس کی آنکھوں میں نمی ضرور تیرنے لگی۔ وہ بہرحال کملا کی ماں تھی۔ اپنی بیٹی کے لئے شوہر کی زبان سے یہ الفاظ سن کر اُسے دُکھ تو ہوا مگر وہ اس کا اظہار نہ کر سکی۔ اُسے یہ بھی خبر تھی کہ ہرناتھ نے کس کرب کے عالم میں کملا کے مر جانے کی بات کہی تھی۔ جن والدین کی جوان بیٹیاں گم ہو جائیں، انہیں سماج سر اُٹھا کے نہیں چلنے دیتا۔ یہ احساس ہرناتھ کے ساتھ اُس کی بیوی کو بھی تھا۔ جس طرح دو قریب المرگ مریض ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں، انہوں نے بھی ایک دوسرے کو دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

اپنے شوہر کے چہرے پر شرمندگی اور دُکھ کے آثار دیکھ کر بھی اُس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ کس طرح کیا ہوگیا، اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ کئی برس پہلے جب کملا کی شادی ہوئی تھی تو رخصتی کے وقت کملا نے آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا تھا۔ ''میاری، میں تم سے بچھڑ کر زندہ نہیں رہ سکوں گی۔'' کملا کے یہی الفاظ اس وقت ماں کی سماعت میں گونج رہے تھے۔

نو دس برس پہلے کی بات ہے کہ کسی گھرانے میں ایک عورت کے دامن پر بدکرداری کا داغ لگ گیا تھا۔ گاؤں بھر میں کافی عرصے تک اس کے چرچے ہوتے رہے، یہاں تک کہ معاملہ عدالت تک جانے کی نوبت آ گئی۔ پھر کئی سال تک ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا جس سے لوگوں کے اندر کوئی غیر معمولی جوش پیدا ہوتا، اُن کے ایک سے شب و روز میں کوئی تبدیلی واقع ہوتی یا کسی کی غیبت کرنے کا موقع ہاتھ آتا۔ یہ بالکل سچی بات ہے کہ غیبت بری چیز ہے، لیکن جس طرح اور بہت سی بری چیزیں آدمی کو اچھی لگتی ہیں، غیبت میں بھی بڑا مزہ آتا ہے۔

یکسانیت کی اس ناگوار فضا میں گاؤں کے پنچ، سرپنچ اور دوسرے مرد و زن دل پر جیسے کوئی بوجھ سا لئے وقت گزار رہے تھے۔ اسی عرصے میں کملا گنگا اشنان کرتے ہوئے گم ہوگئی، وہ بھی گاؤں سے بہت دُور!...... کملا اس شہر کلکتہ میں گم ہوئی تھی جسے بنگال والے آدمیوں کا سمندر کہتے ہیں۔ خاموش خاموش اور بیزار بیزار سے لوگوں میں اس واقعے سے جیسے زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ موقع پاتے ہی اُن کی زبانیں قینچی کی طرح چلنے

لگیں۔

ہرناتھ کے دروازے پر ہر شام کو لگنے والی چوپال رفتہ رفتہ ویران ہوتی گئی۔ گاؤں والوں نے ایک اور ٹھکانا ڈھونڈ لیا تھا۔ کملا کے بارے میں ہر روز نئی باتیں پھیلنے لگیں۔ آخر ایک دن معلوم ہوا کہ اسی گاؤں کے زمیندار یوگیندر کے بیٹے سریندر نے کملا کو غائب کرا دیا ہے۔

سریندر کلکتے کے ایک کالج میں زیر تعلیم تھا۔ پتہ یہ چلا کہ کملا اور سریندر نے پہلے سے یہ منصوبہ بنا رکھا تھا۔ دونوں چھپ کے صلاح مشورہ کیا کرتے تھے۔ اب موقع ملتے ہی دونوں فرار ہو گئے۔ ان دونوں کے متعلق یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ بچپن ہی سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ وہ چھپ چھپ کر ملتے اور بھاگنے کی ترکیبیں سوچتے تھے۔ اس بات کے کئی گواہ بھی نکل آئے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ زمیندار یوگیندر کے ڈر سے اب تک انہوں نے اپنی زبانیں بند رکھی تھیں اور کسی پر یہ حقیقت ظاہر نہیں ہونے دی تھی کہ کملا اور سریندر کے درمیان کیا رشتہ ہے! پھر یہ کہ کسی کے گمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ بات اس قدر بڑھ جائے گی۔ جب نوبت یہاں تک آ گئی تو انہیں خاموش رہنا جرم لگا۔

انہی وجوہ کی بنا پر ششی مکرجی نے ایک دن شام کو پندرہ سولہ آدمیوں کی موجودگی میں گویا یہ راز کھول دیا۔ اسی کے ساتھ اُس نے یہ بھی کہہ دیا۔ ''دیکھو بھائی، بات کسی طرح ظاہر نہ ہونے پائے ورنہ زمیندار میری جان کا دشمن بن جائے گا۔ تم لوگ جانتے ہو کہ میں اس کے ہاں نوکری کرتا ہوں۔''

ششی مکرجی، گاؤں کے زمیندار یوگیندر کے ہاں کھاتا لکھنے کا کام کرتا تھا۔ حساب کتاب میں وہ خاصا تیز تھا اور اسی لئے زمیندار نے اُسے نوکر رکھا تھا۔ چند روز پہلے گاؤں کی ایک ادھیڑ عمر بیوہ کے ساتھ ششی مکرجی کے قابل اعتراض تعلقات کی بات سامنے آئی تھی۔ اس پر ہرناتھ نے ششی مکرجی کے خلاف ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ ہرناتھ نے کہا تھا کہ یہ بہت بڑا پاپ (گناہ) ہے۔ اگر اس کا کفارہ ادا نہ کیا گیا تو سارے گاؤں پر کوئی بڑی آفت آ سکتی ہے۔ مذہبی رسوم کی ''ٹھیکے داری'' کیونکہ ہرناتھ ہی کے پاس تھی اس لئے گاؤں والوں نے اسی سے پوچھا کہ کفارہ کیا ہو؟

''ششی اور اس کروت ذات کی بیوہ کو گاؤں سے نکال دیا جائے۔'' ہرناتھ نے اپنی

مذہبی ''ٹھیکیداری'' جتاتے ہوئے کہا۔

یہ بات ششی مکرجی تک بھی پہنچی اور اُسے بہت بری لگی۔

''دیکھنا، کبھی اس پنڈت کو ایسی سزا دوں گا کہ اپنا سارا پاکھنڈ (چال بازی) بھول جائے گا۔'' ششی مکرجی نے کہا تھا۔

اب کملا غائب ہوگئی تو ششی مکرجی کے دل کی مراد جیسے پوری ہوگئی۔ وہ کافی دنوں سے ہرناتھ کو نیچا دکھا کر بدلہ لینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اُسے یہ موقع مل گیا تھا۔ ہرناتھ سے انتقام لینے ہی کی خاطر ششی نے کملا اور زمیندار کے بیٹے سریندر کی محبت کا قصہ گھڑ کر لوگوں کو سنا دیا تھا۔ گاؤں والے تو ایک مدت سے کسی ایسے ہی ''چٹ پٹے'' قصے کے منتظر تھے، سو انہوں نے ''دیکھو، کسی سے مت کہنا!'' کے الفاظ دہرا دہرا کر گاؤں بھر میں یہ قصہ کہہ دیا۔

اس قصے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے یوں بھی فضا سازگار تھی۔ اس کی ایک وجہ سریندر اور کملا کے گھروں کا قریب ہونا تھا۔ اس قربت اور پڑوس کی وجہ سے دونوں میں میل ملاقات تھی۔ دونوں اسی سبب بچپن سے ایک ساتھ کھیلے کودے تھے۔ سریندر کے ساتھ گاؤں کی اور لڑکیوں کا بھی میل جول تھا، مگر گھر کے قریب رہنے کی وجہ سے کملا کے ساتھ اُس کی زیادہ یگانگت تھی۔

کملا کے کھو جانے کا واقعہ پیش آنے سے کئی برس پہلے بہانہ کر کے سریندر اسکول نہیں گیا تھا۔ دراصل کھیلنے کودنے میں اُس کا دل زیادہ لگتا تھا۔ دوپہر ہوئی تو اُس سے گھر میں نہ رہا گیا۔ وہ ہرناتھ کے باغ میں پہنچ گیا جو گھر ہی کا ایک حصہ تھا۔ ہرناتھ کے باغ میں امرود کے ایک پیڑ پر چڑھ کر وہ مزے سے امرود توڑ کر کھانے لگا۔ اسی وقت اُس کی نظر کملا پر پڑی جو اکیلے میں ایک کاغذ پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ رہی تھی۔ سریندر فوراً سمجھ گیا کہ کسی نے کملا کو خط لکھا ہے۔ اُسے شرارت سوجھی۔ وہ آہستہ سے اُترا اور کملا کے پیچھے پہنچ گیا۔ کملا اس سے بے خبر ہی رہی۔ پھر سریندر نے جھپٹا مار کر کملا کے ہاتھ سے خط لے لیا۔ خط ہاتھ میں آتے ہی وہ کملا سے کچھ فاصلے پر جا کھڑا ہوا۔ کملا کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ باغ کی تنہائی میں کوئی اچانک اُس سے خط چھین لے گا وہ اسی لئے سٹپٹا گئی۔ کچھ حیا اور کچھ غصے کے مارے اُس کے منہ سے فوری طور پر

آواز نہیں نکلی۔ اُس نے سریندر کی طرف دیکھا اور خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''سریندر! چٹھی دے دو ورنہ اچھا نہ ہوگا!...... کہے دیتی ہوں...... ہاں!''

سریندر پر اس ڈانٹ کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بے فکری سے امرود کھاتے ہوئے کملا کو سنا سنا کر خط پڑھنے لگا۔ ''پیاری کملا!......''

کملا کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ وہ خط لینے کے لئے سریندر کی طرف جھپٹی اور اُس سے تقریباً لپٹ گئی۔ دونوں گویا ایک دوسرے سے اُلجھ گئے۔ اسی وقت انہوں نے دیکھا کہ باغ کے بیرونی دروازے پر کھڑا ہوا ششی مکرجی یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔

ششی مکرجی پر نظر پڑتے ہی سریندر نے خط پھینک کر دوڑ لگا دی۔ کملا خط اُٹھا کر آہستہ قدمی سے اندر چلی گئی۔

اُس دن سریندر کا سارا وقت ڈرتے ڈرتے گزرا۔ ہر بار اُسے خیال آتا کہ اُس نے اپنی شرارت میں یہ کام اچھا نہیں کیا۔ سریندر کا باپ یوگیندر بہت سخت مزاج آدمی تھا۔ اُس کے غصے سے سبھی ڈرتے تھے۔ سریندر نے سوچا، اگر اُس کے باپ کو معلوم ہو گیا کہ وہ ہرناتھ کے باغ میں گیا تھا اور وہاں خط واپس نہ دینے کے لئے کملا سے ہاتھا پائی کی تھی تو پھر خیر نہیں۔ اُسے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ کہیں ششی مکرجی لگائی بجھائی نہ کر دے! یا خود کملا اُس کے باپ سے شکایت کرنے نہ آ جائے۔ ششی مکرجی کی تو اُسے زیادہ پرواہ نہیں تھی البتہ کملا کی طرف سے خطرہ ضرور تھا۔ یہی سب کچھ سوچ کر سریندر نے کملا سے ملنے کا فیصلہ کر لیا تا کہ اُسے ٹھنڈا کر سکے۔

اُسی دن شام کے وقت سریندر، کملا کے گھر جا پہنچا اور موقع پا کر اکیلے میں اُس سے کہا۔ ''کملا! دوپہر کو باغ میں جو شرارت میں نے کی، کسی سے کہنا نہیں۔''

کملا کا غصہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا وہ اسی لئے جھلا کر بولی۔ ''اچھا جا کسی سے نہیں کہوں گی، صرف کاکی سے تیری شکایت کروں گی کل تیرے گھر آ کر۔''

سریندر اُس کی خوشامد کرنے لگا۔ ''تیرے پاؤں پڑتا ہوں، اب کبھی تیرا کوئی خط نہیں پڑھوں گا۔''

بڑی مشکل سے کملا کو سمجھا بجھا کر سریندر اپنے گھر واپس گیا، لیکن اُسے ششی کی طرف سے خدشہ رہا۔

ششی کا چہرہ بہت بھدا تھا، اس پر طرہ یہ کہ اس کی ایک آنکھ میں پھلی تھی۔ گاؤں کے جو سیدھے لڑکے تھے، ششی کی غیر موجودگی میں اور جو شرارتی تھے اُس کے منہ پر ہی اُسے ''ششی کانڑا'' کہتے تھے۔ سریندر نے بھی دو ایک دفعہ اُسے ''کانڑا'' کہہ کر پکارا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے قابو میں آ جانے پر ''ششی کانڑا'' اُسے آسانی سے نہیں چھوڑے گا۔ وہ یقیناً اُس کے باپ زمیندار یوگیندر سے شکایت کر کے اُسے پٹوائے گا۔ پھر جب اسی فکر میں کئی دن گزر گئے اور ششی مکرجی اس بات کو ہضم کر گیا تو سریندر مطمئن ہو گیا۔

اس کے باوجود حقیقت یہ تھی کہ ششی نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے باغ میں دیکھا تھا، اُسے بھولا نہ تھا۔ کملا کے باپ ہرناتھ سے وہ پہلے ہی بدلہ لینے کے لئے کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ اسی وجہ سے اُس نے کملا کو بدنام کرنے میں بھی کسی قسم کی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ پہلے یہ مشکل تھی کہ اس الزام تراشی سے اُس کے مالک کا لڑکا سریندر بھی بدنام ہو رہا تھا، اسی سبب اُس کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ وہ موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔ مگر اب ایسا نہیں تھا۔ کملا کے گم ہو جانے سے ششی کو موقع مل گیا۔ ششی نے بہت پہلے گزرے ہوئے واقعے کو بنیاد بنا کر سریندر اور کملا کو گویا اپنی دانست میں پیار کی ڈوری سے باندھ دیا۔ کملا کی گمشدگی کو اُس نے اسی کا سبب بتایا۔ گاؤں والوں کو اُس نے یہ ''پریم کہانی'' کچھ اس طرح سنائی کہ سب کو یقین ہو گیا کہ کملا اور سریندر بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔

گاؤں کا زمیندار ناخواندہ نہیں تھا، پھر بھی وہ نئی تعلیم سے کچھ خوش نہیں تھا۔ خاص طور پر وہ انگریزی پڑھنے اور پڑھانے کو انگریزوں کی غلامی سے تعبیر کرتا تھا۔ اس کے باوجود وہ گویا بہ مجبوری اپنے بیٹے سریندر کو کلکتے میں پڑھوا رہا تھا۔ اس سلسلے میں یوگیندر کا اپنا ہی الگ ''فلسفہ'' تھا۔ وہ کہتا۔ ''کیا کریں، اگر بچوں کو پڑھانا لکھانا ہے تو مجبوراً انگریزی بھی پڑھوانی پڑے گی۔ میں اپنے بیٹے کو جاہل تو نہیں رکھ سکتا!''

وہ زمیندار تھا، سو اُس سے کون یہ بحث کرتا کہ ایک طرف تو وہ انگریزی پڑھانے کو غلامی کہتا ہے اور دوسری جانب خود اپنے بیٹے کو انگریزی پڑھوا رہا ہے۔

زمینداری کا تمام کام کاج وہ خود ہی دیکھتا تھا۔ اپنی عقل ہی کو وہ سب سے افضل

جانتا۔ اُس کی بات کو کوئی ٹال نہیں سکتا تھا۔ اپنے اسی آمرانہ مزاج کی وجہ سے اُسے کئی بار نقصان اُٹھانا پڑا تھا۔ نقصان اٹھا کر بھی اُس کے مزاج میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی۔ گاؤں میں اُس کی بہت عزت تھی۔ لوگ اُسے بہت مانتے تھے اور اُس سے دبتے بھی تھے۔ گاؤں والوں کے ذہنوں پر اُس کا اتنا خوف طاری رہتا کہ آپس میں اختلافات سے بھی گریز کرتے۔

زمیندار یوگیندر کو بھی اُس کے باپ نے تعلیم حاصل کرنے کے لئے کلکتے بھیجا تھا۔ بس اچانک ہی یوگیندر پڑھائی چھوڑ کر گاؤں چلا آیا۔ یوگیندر کا باپ ناخواندہ اور پرانے زمانے کا آدمی تھا۔ لڑکے کی یہ کیفیت دیکھ کر وہ اسی سبب ناراض نہیں ہوا۔ اُس نے یوگیندر کو زمینداری کا کام دیکھنے بھالنے پر لگا دیا۔ تبھی سے یوگیندر زمینداری کا کام چلاتا آ رہا تھا۔ اُس کا باپ مر گیا تو یوگیندر نے جائیداد میں اضافہ ہی کیا، اسے کم نہیں ہونے دیا۔

ذاتی طور پر یوگیندر کو کلکتہ شہر پسند نہیں تھا۔ اُسے اس شہر کے نام ہی سے چڑ تھی۔ کلکتے کا نام سنتے ہی وہ ایسی باتیں کرنے لگتا کہ گاؤں کے سیدھے سادھے لوگ سمجھتے، کلکتہ کوئی بڑی بری جگہ ہے۔ پورے گاؤں اور اپنے گھر میں بھی یوگیندر ہی کی بات چلتی تھی۔ کسی میں اتنی جرأت بھی نہ تھی کہ پیٹھ پیچھے ہی اُسے برا کہہ سکتا۔ اُس کا بیٹا سریندر جب ابتدائی تعلیم حاصل کر چکا تھا تو یوگیندر نے اُسے زمینداری کے کام میں لگانا چاہا۔ یہ وہ دور تھا کہ ہر زمیندار اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دلانا ضروری جانتا تھا۔ بنگال ہی نہیں پورے ملک کا سب سے بڑا شہر کلکتہ تھا جہاں بڑے اچھے اور معیاری کالج تھے۔ زمینداروں، خصوصاً بنگال کے زمینداروں کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو کلکتے کے کسی کالج میں تعلیم دلوائیں، مگر یوگیندر کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ اس کے حق میں نہیں تھا۔ اُس کی بیوی کا تعلق بھی ایک زمیندار گھرانے سے تھا اور وہ اپنے شوہر کے مزاج سے واقف تھی۔

میاں بیوی کے درمیان بہت سے ایسے لمحات آتے ہیں کہ جب وہ دونوں ایک دوسرے سے اپنی ہر بات منوا سکتے ہیں۔ ایسے ہی لمحات میں زمیندار یوگیندر کی بیوی نے اُس سے کہا۔ ''دیکھیں جی، ہمارے سارے بھائیوں کے بچے کلکتے میں پڑھ رہے ہیں۔

ہمیں اپنے سریندر کو بھی.....‘‘

’’تم جانتی ہو، میں انگریزی تعلیم کے خلاف ہوں!‘‘ یوگیندر نے اپنی بیوی کی بات کاٹ دی۔

’’مجھے سب کچھ معلوم ہے اور..... اور میں کچھ بھی نہیں جانتی..... بس آپ کو میری بات ماننی پڑے گی۔‘‘ یوگیندر کی بیوی اوما سندری ایک ادا سے بولی۔

پھر یوں ہوا کہ یوگیندر نے اپنی بیوی کی بات مان لی اور سریندر کو پڑھنے کے لئے کلکتے بھیج دیا۔

کملا کے غائب ہونے کی بات گاؤں کے ایک ایک فرد کو معلوم ہو گئی مگر زمیندار یوگیندر سے بالکل چھپی رہی۔ اس کا سبب یوگیندر کی سخت گیری تھی۔ لوگ اُس کے سامنے زبان کھولتے ہوئے ڈرتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کی بیوی اوما سندری کی بھی اپنی کوئی الگ حیثیت و شخصیت نہیں تھی۔ اوما اسی لئے جب بھی قدم اٹھاتی، اس کے متعلق خوب سوچ سمجھ لیتی۔ جب اُسے یہ پتہ چلا کہ اس کا بیٹا سریندر، کملا کو بھگا کر لے گیا ہے تو اس کو بہت صدمہ ہوا۔ یہ ایسی بات تھی جو وہ اپنے شوہر سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ اگر وہ ایسا کرتی تو گویا اپنے ہی پیروں پر کلہاڑی مار لیتی۔ اس وجہ سے کہ یوگیندر تو سریندر کو کلکتے بھیجنے پر قطعی آمادہ نہیں تھا، اُس نے اوما کے اصرار ہی پر یہ بات مانی تھی۔

اوما کو یہ خدشہ تھا کہ یوگیندر کو اگر معلوم ہوا کہ سریندر نے کملا کو غائب کیا ہے تو یوگیندر اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ سکے گا۔ ایسی صورت میں یہ امکان بھی تھا کہ وہ سریندر کو کوئی سخت سزا دینے کا فیصلہ کرتا۔ اوما اس کا تصور بھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یوگیندر غصے کے عالم میں اپنے بیٹے کو ساری جائیداد کے حق سے محروم کر دیتا۔ یہ سب کچھ برداشت کرنا بہ حیثیت ماں، اوما کے لئے بہت مشکل تھا۔

اُس نے سریندر کو خط لکھنے کے بارے میں سوچا تھا کہ پوچھے افواہ کہاں تک سچ ہے؟ اگر اُسے حقیقت کا علم ہو جاتا تو شاید وہ اپنے بیٹے کے دفاع میں کچھ کر سکتی۔ اس کا ذہن بہرحال یہ تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ سریندر، کملا کو بھگا کر لے جا سکتا ہے۔

جس شخص نے اوما کو یہ خبر دی تھی اس نے کہا تھا کہ کملا کو تو سریندر پہلے سے چاہتا

تھا۔ ماں ہونے کے سبب اُسے ان دونوں کے درمیان محبت کا احساس نہیں ہو سکا تھا۔ اس شخص کی زبانی یہ بات سن کر اوما نے سوچا، شاید ایسا ہی ہو۔ کون ماں اپنے بیٹے کے کردار پر شبہ کر سکتی ہے!

سریندر کو خط لکھنے سے متعلق ایک اور مسئلہ بھی پیدا ہو گیا۔ وہ خود پڑھی لکھی نہیں تھی۔ پھر خط کون لکھ کر دیتا؟ اگر اوما سندری کو کوئی ایسا شخص مل بھی جاتا تو ایک دشواری اور بھی تھی۔ زمیندار یوگیندر جب تک پڑھ کر اجازت نہ دیتا کوئی خط ڈیوڑھی سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ اسی ذہنی کشمکش کی وجہ سے اوما سندری بڑی بے چینی کے ساتھ دن گزار رہی تھی۔

زمیندار یوگیندر کے گھر اُس کے رشتے ناتے کی بہت سی عورتیں آتی جاتی رہتی تھیں۔ اوما اپنے بیٹے اور کملا کے تعلقات کی بابت ان عورتوں سے بھی صلاح مشورہ نہیں کر سکتی تھی۔ اُسے یہ ذہنی کشمکش و کرب اکیلے ہی برداشت کرنا تھا۔ دوسری جانب ہرناتھ کی بیوی یعنی کملا کی ماں کا بھی یہی حال تھا۔ اوما سوچ رہی تھی کہ اس سے جا کر مل لے اور اُسے وہ ’’راز‘‘ بتا دے جس سے پورا گاؤں واقف ہو چکا تھا۔

اوما اور کملا کی ماں دونوں ہی کم عمری میں بیاہ کر اس گاؤں میں آئی تھیں۔ غالباً اسی سبب دونوں کے درمیان میل ملاپ زیادہ تھا۔ پھر یہ کہ برسوں سے ایک دوسرے کی پڑوسی تھیں۔ اس کے باوجود اوما، کملا کی ماں سے ملتے ہوئے شرم محسوس کر رہی تھی۔ یہ معاملہ ہی ایسا تھا۔ کملا کی ماں کام کاج سے فرصت پانے کے بعد ہر روز پاس پڑوس کے گھروں میں چکر لگایا کرتی تھی، مگر جب سے کملا گم ہوئی تھی اُسے اپنے اوپر ندامت کا بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ کلکتے سے لوٹ کر آنے کے بعد اسی لئے اُس نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔

کملا کی گمشدگی کی بنا پر گاؤں بھر میں ہلچل سی پیدا ہو گئی تھی، مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں کمی ہونے لگی۔ پہلے تو کملا کی گمشدگی پر گاؤں والوں نے بڑا شور مچایا لیکن جب زمیندار کے بیٹے سریندر کا نام آیا تو وہ گویا محتاط ہو گئے۔ زمیندار کے خلاف زبان کھولنے کی ہمت ان میں نہیں تھی، مگر نوجوان اور بچے یہ سب کچھ سوچنے لگیں تو انہیں نا سمجھ کون کہے!

کملا کے چھوٹے بھائی کا نام ارون تھا۔ سریندر کا بھائی نریندر اور ارون ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے۔ کلکتے میں کملا کی گمشدگی کے بعد گاؤں بھر میں کیا کیا باتیں ہو رہی تھیں، ارون کو ان کا علم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وجہ سے گھر والوں کو کتنی ندامت اور دشنام طرازیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا! سکول ماسٹر پڑھاتے ہوئے ترچھی نگاہ سے یا براہِ راست ارون کی طرف دیکھتا۔ یہ معنی خیز نظریں ارون کے لئے گویا نشتر کا کام دیتیں۔ وہ اندر سے خود کو لہولہان محسوس کرتا۔ یہ احساس اس وقت مزید سوہانِ روح بن جاتا جب ارون کے ہم جماعت اُس کی بہن کے بارے میں سرگوشیاں کرتے۔ ارون کا کوئی ایسا دوست نہیں تھا جو یہ دُکھ بانٹ لیتا۔ وہ اپنے والدین سے بھی بہن کے متعلق کچھ نہیں پوچھ سکتا تھا۔ اُسے خبر تھی کہ کچھ معلوم کرنے پر انہیں مزید دُکھ ہوگا۔

ارون اسی لئے خاموش خاموش سا رہتا۔ اُس کی بہن کملا اور نریندر کے بڑے بھائی کا نام لے کر لوگ جو باتیں کرتے تھے، باعث شرم تھیں۔ اس معاملے میں نریندر کا حال بھی ارون سے مختلف نہیں تھا۔ دونوں ہم جماعتوں کی یکساں کیفیت تھی۔

جب پہلے پہل یہ بات گاؤں میں پھیلی تو ارون کو دیکھ کر نریندر کو بھی شرم محسوس ہوتی تھی، مگر دن گزرنے کے ساتھ اُس کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ جو واقعہ پیش آیا ہے، وہ کم از کم اس کے لئے شرمندگی کا سبب نہیں۔ شرمندگی تو انہیں ہونی چاہئے جن کے گھر کی لڑکی بھاگی ہے۔ نریندر کے ہم جماعت سریندر کو بہادر بتاتے۔ ان کے نزدیک کسی لڑکی کو بھگا لے جانا بہادری تھی۔ اور اسی وجہ سے سریندر کی تعریفوں کے پل باندھتے۔ اس وقت اپنے بڑے بھائی کی تعریفیں سن کر نریندر بھی دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا۔ کبھی کبھی لڑکے کملا کے کردار پر نکتہ چینی کرتے اور پھر اُس کا مذاق اُڑاتے۔ کبھی کبھی تو ہنس ہنس کے اُن کا برا حال ہو جاتا۔ اگر ایسے میں ارون آ جاتا تو ان کے لئے ہنسی روکنا مشکل ہو جاتا۔ کوئی کوئی لڑکا کوشش کے باوجود ہنسی نہ روک پاتا۔ لڑکوں کے درمیان کیا بات ہو رہی تھی اور وہ کس بات پر ہنس رہے ہوں گے، ارون سمجھ جاتا۔ کبھی لڑکے کسی اور بات پر بھی ہنس رہے ہوتے تو ارون یہی سمجھتا کہ وہ اُس کی بہن کا ذکر کر رہے ہیں۔ یوں گویا ارون ندامت آمیز زندگی گزار رہا تھا۔

روز بروز اسکول کا ماحول ارون کے لئے ناقابل برداشت ہوتا گیا۔ ارون نے اپنے

دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب وہ اسکول نہیں جائے گا۔ اُس نے کلکتے جا کر اپنی بڑی بہن کملا کا سراغ لگانے کی خاطر منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔

ایک دن جب اسکول جانے کا وقت ہو گیا اور وہ گھر ہی میں رہا تو اس کی ماں نے کہا۔ ''کیا ہوا؟......تو اب تک اسکول جانے کی تیاری......''

ارون نے اپنی ماں کی بات کاٹ دی اور بولا۔ ''ماں! اب میں اسکول نہیں جاؤں گا۔''

یہ سن کر ارون کی ماں کو بڑی حیرت ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ پڑھنے لکھنے میں اُس کے بیٹے کا بہت دل لگتا ہے۔ دوسرے لڑکوں کی طرح اُس کا بیٹا اسکول نہ جانے کے لئے بہانے نہیں بناتا تھا۔ وہ اسی سبب کہنے لگی۔ ''اسکول کیوں نہیں جائے گا رے؟ اس کی کوئی وجہ؟..... آخر کیا ہوا ہے؟''

ارون کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اگر جواب تھا بھی تو ماں کے لئے نہیں تھا۔ ایک وہی نہیں، اس بارے میں تو سبھی جانتے تھے کہ کیا ہوا ہے۔ اپنی ماں کو کوئی جواب نہ دے کر ارون اسی لئے باہر جانے کی خاطر قدم اٹھانے لگا۔

''ٹھہر جا!'' ماں نے اُسے روک لیا اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں سر پر ہاتھ پھیر کر پوچھنے لگی۔ ''کچھ تو بتا بیٹا، کیوں نہیں جائے گا اسکول؟''

ارون کا دل بھر آیا اور وہ رو دیا، پھر روہانسی آواز میں بولا۔ ''تمہارے پاؤں پڑتا ہوں ماں، مجھ سے تم اسکول جانے کو نہ کہنا!'' پھر اُس نے اپنی ماں کو سب کچھ بتا دیا کہ اتنے دنوں سے اُس پر کیا ظلم ہو رہا ہے اور کس طرح وہ اندر ہی اندر زخم زخم ہو چکا ہے!

بیٹے کی زبان سے اُس کا دُکھ سن کر ماں رونے لگی۔

رونے کی یہ آوازیں گھر کے باہر تک پہنچنے لگیں۔ گھر کے چبوترے پر ہرناتھ بیٹھا تھا۔ اُس نے جو یہ آوازیں سنیں تو چونک اٹھا اور پھر اٹھ کر گھر کے اندر پہنچا۔ اپنی بیوی کی زبانی ساری بات سن کر اسے بھی بہت دُکھ ہوا، مگر وہ بولا کچھ نہیں اور خاموشی کے ساتھ گھر سے باہر نکل گیا۔

آندھی کے کسی تند و تیز جھکڑ کی طرح جب ہرناتھ اس کمرے میں داخل ہوا جہاں زمیندار یوگیندر بیٹھا تھا تو ایک دم سناٹا چھا گیا۔

حسب معمول ہرناتھ کی آمد سے قبل زمیندار اپنے دفتر میں فرش سے قدرے ایک اونچی جگہ بیٹھا ہوا تمبا کو پی رہا تھا۔ سامنے ہی دوسری کرسی پر حقہ رکھا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر آٹھ دس ملازم اپنا کام کاج کر رہے تھے۔ ان ملازموں کے پاس چھوٹے بڑے کئی طرح کے کھاتے رکھے تھے۔

ہرناتھ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ سارے ملازم جیسے سہم گئے۔

دائیں ہاتھ میں جنیئو لپیٹتے ہوئے ہرناتھ نے زمیندار کو مخاطب کیا۔ ''یوگیندر بابو! اس کا کچھ مداوا کیجئے...... آپ گاؤں کے زمیندار ہیں اور ہم سب کے محافظ ہیں۔ میں نے آخر ایسا کیا جرم کیا ہے جو میرے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے!...... مجھ پر ظلم کیا جا رہا ہے۔ میں اس ظلم کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔'' ہرناتھ کی آنکھوں سے جیسے آگ برس رہی تھی۔ اُس نے تیز اور بلند آواز میں کہا۔ ''کیا مجھے تفصیل کے ساتھ بتانا ہوگا کہ کیا ہوا؟...... جو کچھ ہوا ہے گاؤں کا کون آدمی ایسا ہے جسے نہیں معلوم!...... اور...... اور آپ کو بھی یقیناً خبر ہوگی۔''

زمیندار کسی بات کو طول دینا پسند نہیں کرتا تھا۔ یہ اُس کی عادت تھی۔ لمبی تمہید سن کر وہ چڑ جاتا تھا۔ اُس نے اپنے ایک کارندے کی طرف دیکھ کر جھلائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''انہیں کس نے ستایا ہے؟...... اس سلسلے میں تم لوگوں کو کچھ معلوم ہے؟''

ششی مکرجی وہیں موجود تھا۔ زمیندار کی موجودگی میں وہ کبھی بیٹھتا نہیں تھا، کھڑا ہی رہتا تھا۔ وہ اگر بیٹھتا بھی تو کسی گوشے میں جہاں زمیندار کی نظر اُس پر نہ پڑ سکے۔ ہرناتھ کے اس طرح اچانک زمیندار کے پاس آ جانے سے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ سمجھا کہ اب خیر نہیں، سات پشتوں سے اُس کے اجداد جس مکان میں رہتے آئے ہیں، شاید اسے اب چھوڑ کر بھاگنا ہوگا۔ دل ہی دل میں دُعائیں مانگتے ہوئے وہ کھاتے پر جھک کر اپنا کام کرنے لگا۔

کارندوں میں سے زیادہ تر مصروف نظر آنے لگے جیسے انہیں سانس لینے کی بھی فرصت نہ ہو۔ ان میں سے دو ایک نے زمیندار کی بات سن کر اپنے چہروں سے یہ تاثر دیا کہ انہیں کچھ نہیں پتہ، ہرناتھ پر کیا گزری ہے!

زمیندار اس پر مزید جھنجلا گیا اور ہرناتھ سے بولا۔ ''کوئی بھی تو کچھ نہیں جانتا۔ آپ

ہی صاف صاف بتا دیں، کیا بات ہے!''

ہرناتھ نے کہا۔ ''کملا کا پتہ نہیں، یہ تو آپ جانتے ہیں۔''

زمیندار کو واقعی یہ خبر نہیں تھی۔ وہ اسی لئے حیران ہو کر پوچھنے لگا۔ ''کملا؟...... کملا؟...... کہاں گئی وہ؟''

''کملا کہاں گئی؟...... میں ہی بتاتا ہوں آپ کو!...... اگر آپ میری ہی زبان سے سننا چاہتے ہیں تو سنیئے کہ اُسے آپ ہی کا بیٹا لے کر بھاگ گیا ہے۔'' اس کے بعد ہرناتھ نے از اول تا آخر کملا کے غائب ہونے کی داستان سنا دی۔

زندگی بھر زمیندار یوگیندر کو کبھی اتنی حیرانی نہیں ہوئی تھی۔ سب سے زیادہ حیرت اُسے اس بات پر ہوئی کہ جس بات کو گاؤں کے سبھی بوڑھے اور بچے جانتے ہیں اسے وہی معلوم نہیں تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ ہرناتھ اُس کے بیٹے کی غیر ذمہ دارانہ اور ناروا حرکت کا یوں ذکر کر رہا تھا جیسے سب کچھ اسی کے ایما پر ہوا ہے۔ اُس نے سوچا، جب ہرناتھ ایسی باتیں کر رہا ہے تو گاؤں میں اور لوگ بھی یہی کہہ رہے ہوں گے۔

زمیندار نے غصے کی حالت میں ششی مکرجی کو پکارا۔

ششی مکرجی اس وقت مصیبت ٹلنے کے لئے دُعا کر رہا تھا، بھگوان! اس بار بچا لو! میں پانچ آنے خرچ کر کے کل ہی کتھا (وعظ) سنوں گا۔ زمیندار کے پکارنے پر وہ فوراً ہی اُٹھ کھڑا ہوا، پھر زمیندار کے سامنے ہاتھ جوڑ کر سر جھکا لیا۔

''ششی! تم نے جو کچھ ابھی سنا، اس بارے میں جو کچھ جانتے ہو، تفصیل کے ساتھ بیان کرو!'' زمیندار نے ششی مکرجی کو حکم دیا۔ ''اگر تم نے کوئی بات بھی چھپائی تو گاؤں سے نکال باہر کروں گا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو، میرا نام زمیندار یوگیندر ہے۔''

وہاں موجود زمیندار کے سبھی کارندے یہ سوچنے لگے کہ آج ان کی آنکھوں کے سامنے ایک برہمن اپنی جان سے ہاتھ دھونے والا ہے۔ ششی مکرجی بھی ہرناتھ ہی کی طرح برہمن تھا۔ سب کی نظریں ششی مکرجی کے چہرے پر تھیں۔ وہ بدحواس دکھائی دے رہا تھا۔

ایک شام کو چوپال پر ششی مکرجی نے سب گاؤں والوں کے سامنے جو باتیں کی تھیں، اس وقت اُسے یاد نہیں آ رہی تھیں۔ اگر اُسے وہ باتیں یاد بھی آ جاتیں تو اس میں

اتنی ہمت نہیں تھی کہ زمیندار کے سامنے انہیں بیان کر سکتا۔ اسی بناء پر ششی مکرجی نے کانپتی ہوئی آواز میں سریندر کے متعلق ایک نیا قصہ گھڑ کر سنا دیا۔ اُس نے کہا۔ ''ہرناتھ جی جب گاؤں واپس آ گئے تو اس کے بعد میرے ماموں زاد کے برادرِ نسبتی نے مجھے ایک خط لکھا تھا۔ اس نے خط میں لکھا تھا کہ وہ پورب (مغرب) کی طرف جا رہا تھا کہ اسی ٹرین میں اُسے سریندر اور کملا ایک ساتھ نظر آئے تھے۔''

یہ سن کر زمیندار آگ بگولا ہو گیا۔ اُس نے زور سے تخت پر گھونسا مارتے ہوئے گرج کر کہا۔ ''اُلو! تو نے یہ بات آج تک مجھے کیوں نہیں بتائی؟''

ششی مکرجی کو یوں لگا جیسے اب اپنے پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکے گا۔ پھر بھی وہ سنبھل کر چند قدم پیچھے ہٹا اور بولا۔ ''حو...... حضور...... کے ڈر...... ڈر سے!''

زمیندار یوگیندر نے کچھ نہ کہا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اندر چلا گیا۔

جب زمیندار یوگیندر گھر کے اندر پہنچا تو اُس کی بیوی اوما سندری نہا دھو کے پوجا کرنے بیٹھی تھی۔ ابھی اُس نے پوجا شروع نہیں کی تھی۔ اُس کے ایک طرف مہری سودا سلف کی فہرست لئے فکرمند نظر آ رہی تھی۔ دو پیسے حساب میں کم تھے۔ بے چاری مہری اسی وجہ سے پریشان تھی۔ حساب لگاتے ہوئے اچانک مہری گھبرا گئی تھی۔ اُس نے سر پر آنچل کھینچ کر جلدی سے کہا۔ ''ماں جی! بڑے بابو۔'' یہ کہتے ہی وہ بچے ہوئے پیسے پلّو میں باندھ کر وہاں سے کھسک گئی۔

زمیندار اس دروازے میں آ کر کھڑا ہو گیا جو حویلی کے مردانہ اور اقامتی حصے کے درمیان تھا۔

اس وقت زمیندار کو گھر میں دیکھ کر اوما سندری کو بڑی حیرت ہوئی۔ اُس نے سوچا، معاملہ کیا ہے؟ پھر وہ گھبرا کر اپنے شوہر کے چہرے کو دیکھنے لگی۔ غصے کی شدت کے سبب زمیندار کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر اوما سندری اور بھی خوفزدہ ہو گئی اُس نے مُردہ سی آواز میں پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''اپنے لائق و فائق بیٹے کے بارے میں تم نے کچھ سنا؟'' زمیندار بولا۔ ''بڑی شہرت ہو رہی ہے اُس کی۔''

اوما سندری ایسی بن گئی جیسے اُسے کچھ خبر نہ ہو۔ اُس نے حیرت آمیز لہجے میں کہا۔

''کیسی شہرت؟ اور کس سلسلے میں شہرت؟''

''تم تو اس طرح انجان بن رہی ہو کہ میری طرح جیسے تمہیں بھی کچھ پتہ نہ ہو۔'' زمیندار کی آواز میں چبھن تھی۔ ''یہ تمہارے اسی بیٹے کی شہرت کا قصہ ہے جسے تم نے میری مرضی کے خلاف اور ضد کر کے پڑھنے کی غرض سے کلکتے بھیجا ہے۔''

اوما سندری اس اشارے کا مطلب سمجھ نہیں سکی اور سوچنے لگی کہ اس کے شوہر تک یہ بات کس نے پہنچائی؟

وہ ڈر گئی کہ اگر یہ بات زمیندار کے کانوں تک پہنچ ہی گئی ہے تو اب خیر نہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ اُسے سریندر کے بارے میں پھیلائی جانے والی افواہ پر یقین نہیں آیا تھا۔ اپنے بیٹے کے متعلق کسی ایسی بات پر کون ماں یقین کرے گی۔ اُس کی نظر میں تو سریندر ابھی بچہ ہی تھا۔ اوما سندری کے خیال میں سریندر سیدھا سادھا اور معصوم سا تھا۔ اس سے ایسی کوئی حرکت سرزد نہیں ہو سکتی تھی جو قابلِ مذمت ہو۔ لوگ کہتے تھے، کملا کے ساتھ اس کی پہلے سے سانٹھ گانٹھ تھی، دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، لیکن اوما کو ان باتوں پر یقین نہیں تھا۔ اُس کا دل کہتا تھا، نہیں نہیں! یہ جھوٹ بات ہے، ایک دم من گھڑت ہے۔

جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو، اس انداز میں اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی۔ ''کس کی بات کرتے ہو تم؟...... سریندر کی؟...... اُس نے ایسا کون سا کام کیا ہے؟''

زمیندار جواب میں بتانے لگا۔ ''ہمارے پڑوسی ہرناتھ جی اپنی لڑکی اور بہت سی عورتوں کے ساتھ اشنان (غسل) کرنے کلکتے گئے ہوئے تھے۔ ان کی عورت بھی ساتھ تھی۔ وہاں سے باقی سب تو لوٹ آئے، صرف کملا نہیں لوٹی۔ معلوم ہوا ہے کہ سریندر، کملا کو وہاں سے پھسلا کر لے گیا ہے اور اُسے کہیں چھپا رکھا ہے۔''

یہ سن کر اوما سندری کے تن بدن میں گویا آگ سی لگ گئی۔ وہ بھنا کر بولی۔ ''سریندر اُسے لے گیا ہے؟''

''ہاں، تمہارا لاڈلا سریندر!'' زمیندار نے طنزیہ آواز میں جواب دیا۔

اوما سندری اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور تیز آواز میں کہنے لگی۔ ''جھوٹ...... بالکل جھوٹ! کس نے یہ کہی؟''

اپنی بیوی کے تیور دیکھ کر زمیندار کچھ سٹپٹا گیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اوما سندری کا یہ روپ اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جلد ہی اُس نے خود پر قابو پا لیا اور کہا۔ ''ششی مکرجی کا کوئی رشتے دار ریل گاڑی میں بیٹھا کہیں جا رہا تھا۔ اُسی ٹرین میں سریندر اور کملا کو کہیں جاتے دیکھا ہے۔''

اوما سندری بولی۔ ''ششی کہتا ہے؟...... وہی بدنام شرابی ششی نا؟''

''لیکن اُس نے جھوٹ تو نہیں کہا ہوگا۔'' یوگیندر نے کہا۔ ''جھوٹ بولنے میں اُس کا کوئی مفاد نہیں ہے...... وہ کیوں اپنی طرف سے بات بناتا۔''

یہ ایک ایسی دلیل تھی جسے اوما سندری فوری طور پر رد نہ کر سکی۔ اُس نے سوچا، ششی بدکردار اور بُچ تو ہے لیکن ہے تو ہمارا نوکر۔ ہمارے بیٹے پر تہمت لگانے اور اسے بدنام کرنے میں ششی کا نقصان تو ہے، فائدہ کچھ نہیں۔ پھر یہ کہ ششی کے علاوہ اور بھی تو گاؤں والے یہی بات کہتے پھر رہے ہیں۔ گاؤں میں ایک ہمارا ہی تو بیٹا نہیں رہتا، اس کے ہم عمر اور بھی تو ہیں، پھر سبھی کو چھوڑ کر اسی کے خلاف مہم کیوں چل رہی ہے؟ کلکتے میں بھی تو ایک وہی نہیں رہتا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر اوما سندری نے اپنے شوہر سے پوچھا۔ ''تو پھر اب تم کیا کرو گے؟''

''مجھے کیا قدم اٹھانا چاہئے، میں طے کر چکا ہوں۔'' یوگیندر نے جواب دیا۔

''سریندر کو ابھی میں ایک خط لکھتا ہوں کہ وہ آ کر میرے سامنے جواب دے، لوگ اُسے کیوں بدنام کر رہے ہیں!...... جو کچھ اس کے بارے میں کہا جا رہا ہے، کہاں تک سچ ہے!...... سریندر نے جواب میں جو کچھ کہا اسی کو سامنے رکھ کر مناسب انصاف کروں گا۔''

''لیکن سنو!'' اوما سندری خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ''گاؤں والوں کی فضول اور بے سروپا باتیں سن کر انصاف کے جوش میں اپنے خون کے ساتھ کوئی ایسا سلوک نہ کر بیٹھنا جو زندگی بھر پچھتانا پڑے۔ کچھ بھی ہو اب وہ بڑا ہو گیا ہے، کسی بھی سبب اس کے ساتھ سختی اچھی نہیں ہوگی۔ دیکھو میں نے تمہاری مرضی کے خلاف کبھی کچھ کرنے یا کہنے کی جرأت نہیں کی اور نہ ہی اب میرے اندر اتنا حوصلہ ہے۔ میں اسی لئے نہایت دُکھی

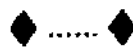
ہو کر تم سے پرارتھنا (درخواست) کرتی ہوں کہ پہلے سچائی کا پتہ لگا لو، اس کے بعد اگر سریندر کو قصوروار پاؤ تو سزا دینا۔''

''اس معاملے میں تو مجھے کوئی خاص جانچ پڑتال کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔'' یوگیندر کہنے لگا۔ ''کلکتے جیسی جگہ پر لڑکے کو اکیلا چھوڑ دیا ہے، اب اگر اس کے بارے میں کوئی ایسی بات کی جائے تو اس میں تعجب کیا ہے۔ خیر میں پہلے ہی تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ اب رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ سب کچھ تو اُسے کلکتے بھیجنے سے پہلے سوچنا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ میں تو ہرگز یہ پرواہ نہیں کروں گا کہ وہ میرا خون ہے۔ مجھے تو اس کی زبانی صفائی سننی ہے اور دیکھنا ہے وہ کیا کہتا ہے۔ اس کے بعد ہی مجھے جو کرنا ہوگا، وہ کروں گا۔''

پھر زمیندار یوگیندر وہاں مزید نہیں رُکا اور واپس ''مردانے'' میں چلا گیا۔ سریندر کو اسی وقت خط لکھنا تھا۔

شوہر چلا گیا تو کچھ دیر تک اوما سندری کسی مجسّمے کی طرح وہیں کھڑی رہی جیسے بے جان ہو۔

''بھگوان! اب آپ ہی رکھشا (حفاظت) کیجئے!'' اوما سندری نے سامنے رکھی مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''ایک ماں کی عزت رکھ لیں بھگوان!...... کہیں اس کی ساری اُمیدیں خاک میں نہ مل جائیں۔'' اُس کے رخساروں پر بہتے ہوئے آنسو موتی معلوم ہو رہے تھے۔ ان میں بڑی چمک تھی، شاید اس وجہ سے کہ وہ ایک ماں کے آنسو تھے۔



کھتج چند چوہدری ایک گاؤں کے بڑے زمیندار کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ کلکتے میں رہ کے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ہری سین روڈ کے قریب ایک آبادی میں اُس نے ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ اس مکان کو کھتج نے مغربی ڈھنگ سے سجایا ہوا تھا۔ کام کاج کے لئے اُس کے پاس ایک نوکر بھی تھا جو اُسی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس مکان میں عموماً آنے جانے والوں کا ہجوم نظر آتا تھا۔ یہ آنے جانے والے، کھتج کے دوست تھے۔ انہی کی وجہ سے مکان میں شور وغل سنائی دیتا تھا۔ اکثر یہ شور وغل سن کر ایسا لگتا تھا جیسے اس مکان میں کوئی شادی بیاہ ہونے والا ہے، اسی کا یہ دھوم دھڑکا ہے۔

کھتج کی عمر چوبیس برس کی ہوگی۔ وہ ایک شوقین نوجوان تھا۔ بنگالی نوجوانوں کی طرح اُس کا چہرہ بھی سانولا تھا مگر خدوخال پُرکشش تھے۔ آنکھوں پر وہ قیمتی چشمہ لگائے رہتا اور داڑھی مونچھ نہ رکھتا۔ جو بھی اُسے دیکھتا خوبصورت ہی کہتا۔ وہ ہارمونیم بجا لیتا۔ اُس کی آواز میں بھی لوچ تھا، جب گاتا یا گنگناتا تو سماعت پر بار نہ ہوتا۔ مصوری کے فن پر بھی اُسے تھوڑی بہت قدرت حاصل تھی۔ ایک بڑے زمیندار گھرانے کا چشم و چراغ ہونے کے باوجود وہ بہت زیادہ حساس تھا۔ دیگر زمیندار گھرانوں کے افراد کی طرح وہ محنت کرنے میں عار نہ سمجھتا، مگر ایسا بھی نہیں کہ اُس میں کوئی کمزوری نہ تھی۔

اپنے دوستوں یا متعلقہ لوگوں کی زبان سے اپنی تعریف سننا اُسے بہت اچھا لگتا تھا۔ سیدھے سادھے لفظوں میں دوست وہ ایسے ہی ہم عمروں کو بناتا جو اُس کے مصاحب بن سکیں۔ اپنی اس کمزوری پر اُس نے قابو پانے کی کوشش اس لئے نہیں کی کہ وہ اسے کوئی بری بات نہیں سمجھتا تھا۔ اپنے انہی دوستوں میں وہ ایک بڑا فنکار مشہور تھا۔ اُس کے دوست کہتے تھے کہ اس کا ہر انداز دلکش و پُرکشش ہے، ریشمی چادر اوڑھنے یہاں تک کہ اس کے چلنے پھرنے میں بھی انفرادیت ہے۔

دوستوں اور واقف کاروں پر اپنے ادبی ذوق کی دھاک بٹھانے کے لئے اُس نے بمبئی سے شیکسپیئر اور برنارڈ شا کی کتابیں منگوا لی تھیں۔ ایک روز انہی کتابوں میں سے ایک کتاب کا پہلا صفحہ کھولتے ہی اُس کا دوست جگدیش باآواز بلند بولا۔ ''یہی تو فنکار ہونے کی علامت ہے۔''

کھتج کے دوسرے دوستوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور اُس کے ادبی ذوق کی تعریفیں کرنے لگے۔

بے پناہ دولت کا وارث ہو کر کھتج کے لئے زندگی بہت آسان ہوگئی تھی۔ ہر شے اُسے کسی تگ و دو کے بغیر مل جاتی۔ اسی بناء پر اُس کی خواہشیں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کے سبب کھتج کے مزاج میں ایک نوع کی مشکل پسندی شامل ہوگئی تھی۔ اُسے باآسانی مل جانے والی چیزوں کو حاصل کرنے کی آرزو نہ ہوتی۔

گاؤں کی حویلی میں اُس کی بیوہ ماں اور عمر میں کافی چھوٹی بہن تھی۔ کھتج ابھی غیر شادی شدہ تھا۔

''بیٹا! اب میں تیری شادی کرنا چاہتی ہوں۔'' اُس کی ماں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

کھتج ان دنوں گاؤں آیا ہوا تھا۔ وہ جواب میں بولا۔ ''نہیں ماں، ابھی نہیں۔''

''پھر کب؟'' ماں نے سوال کیا۔

''بتا دوں گا، ابھی تعلیم تو پوری کرلوں۔'' اُس نے بہانہ بنا دیا۔

ہر بار کی طرح اُس کی ماں خاموش ہوگئی۔ اُس کے بس میں اور تھا بھی کیا! وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی خوشی میں خوش تھی۔ اگر وہ تعلیم پوری کرنا چاہتا تھا تو کیسے روک دیتی! اس کے باوجود اُس کی تمنا یہی تھی کہ جلد از جلد حویلی میں بہو لے آئے۔

کھتج کو کیونکہ مغرب کی ہوا لگ چکی تھی اس لئے روایتی قسم کی شادی پر وہ راضی نہیں تھا۔ وہ اکثر سوچتا، یہ بھی کوئی شادی ہوئی، نہ جان نہ پہچان! بنارسی ساڑھی میں لپٹی ہوئی ایک پوٹلی جانے کہاں سے تلاش کر کے ساتھ کھڑی کر دی جاتی ہے! اس پوٹلی کو ایک بوجھ سمجھ کر اٹھاؤ اور ساری زندگی یونہی اٹھائے اٹھائے پھرو اور پھر مر جاؤ۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہوئی! ایک اجنبی کو آشنا بنا لو، مگر کیوں؟ آخر ایسی بھی کیا مجبوری ہے!

میں شاید یہ بوجھ نہ اٹھا سکوں۔ میں تو ٹینی سن کی نظم پڑھ کر لامحدود آسمان کی وسعتوں میں کسی آزاد پرندے کی طرح پرواز کرتا رہوں گا۔ مجھے اپنے پیروں میں زنجیر نہیں ڈالنی۔ بے کیف شب و روز، ایک سے صبح و شام مجھے پسند نہیں۔ ایک ہی صورت کب تک دیکھتا رہوں گا! یہ ایسی باتیں تھیں جو وہ اپنی ماں سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ اُس نے ماں کے بار بار اصرار پر کہا تو صرف یہ کہ ابھی شادی کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی ماں! جس دن ضرورت محسوس ہوئی خود کہہ دوں گا۔ فی الحال تو مجھے کلکتے واپس جانا ہے۔ کالج کھلنے والا ہے۔ کالج کھلتے ہی پڑھائی شروع ہو جائے گی۔

ماں نے مزید کچھ نہ کہا۔ وہ اُسے کلکتے جانے سے روکتی بھی کیسے! جوان بیٹا تھا اور اُس کے مزاج میں کسی قدر خودسری بھی تھی۔ وہ جانتی تھی، کھنج کو یہ خودسری اپنے باپ سے ورثے میں ملی ہے۔ اس خوف سے کہ کہیں کھنج نافرمانی پر نہ اُتر آئے، اُس نے شادی کرنے پر زور نہیں دیا۔ اس لئے کہ یہ بھی غنیمت تھا کہ کھنج نے شادی سے انکار نہیں کیا تھا البتہ فی الحال وہ راضی نہ تھا۔

کلکتے پہنچ کر کھنج نے اپنے دوستوں میں گویا اعلان کر دیا کہ محبت کے بغیر شادی کی ہی نہیں جا سکتی۔ روایتی شادی جھک مارنے کے مترادف ہے۔

کھنج کے بھی دوستوں میں گنیش اُس کا سب سے زیادہ خیر خواہ اور سمجھدار تھا۔ اُس کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ ضرورتیں بہت زیادہ ہونے پر اکثر اُسے کھنج سے امداد مل جاتی تھی۔ اگر کہیں سیر و تفریح کی غرض سے جانا ہے اور گنیش کا جوتا پھٹا ہوا ہے تو اُس نے بلاتکلف کھنج کا جوتا پہن لیا۔ پھر یہ جوتا ہمیشہ کے لئے اُسی کا ہو گیا۔ عموماً یہ بھی ہوتا کہ وہ کھنج سے پیسے اُدھار لے لیتا اور واپس کرنا ضروری نہ سمجھتا۔ کبھی اُس کے لئے اپنی بیوی اور کبھی بچوں کی بیماری کا بہانہ کر دیتا۔ کھنج سے وہ اس طرح پیسے مانگتا جیسے یہ اس کا حق ہو۔ کھنج کبھی اُسے مایوس نہ کرتا اور فوراً جیب سے پیسے نکال کر دے دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ کھنج کے دوسرے دوستوں سے کہیں زیادہ گنیش اُس کی تعریف کرتا تھا۔

جب گنیش نے کھنج کی زبانی روایتی شادی کے خلاف باتیں سنیں تو کہنے لگا۔ ''تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، حقیقت یہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے گنیش نے لمحے بھر کو بھی نہ سوچا کہ اس نے بھی روایتی شادی کی ہے۔ اُس نے شادی سے پہلے اپنی بیوی کو دیکھا تک نہیں

تھا۔ اُس کی شادی دوسرے شہر میں طے ہوئی تھی جہاں شادی سے قبل وہ گیا بھی نہیں تھا۔ اُس کی بیوی کو ماں اور بہنوں نے پسند کیا تھا۔

''تم تو ایسا نہ کہو!'' کھنج کا ایک اور دوست بول اُٹھا۔ ''شادی سے پہلے محبت کا تمہیں کیا تجربہ!...... تم ہی نے تو بتایا تھا کہ تمہاری ماں نے......''

''معلوم ہے مجھے بھی۔'' کھنج نے رمیش کی بات کاٹ دی، پھر گنیش کو مخاطب کیا۔ ''کبھی کبھار میری کسی بات کی تائید کرتے ہوئے کچھ سوچ بھی لیا کرو کہ کیا کہہ رہے ہو۔''

گنیش کچھ خفیف سا ہو گیا۔ پھر وہ ہنسا تو اُس کی ہنسی قابل رحم سی تھی۔ اُس نے کہا۔

''بھول ہو گئی میرے بھائی!''

اس کے بعد موضوع گفتگو بدل گیا اور دوسری باتیں ہونے لگیں۔ ان باتوں کا محور وہ انگریزی ناول تھے جو کھنج نے گاؤں میں رہتے ہوئے پڑھے تھے۔

''تم نے اتنے سے دِنوں میں اتنے سارے ناول پڑھ ڈالے!'' اُس کا ایک دوست ستائشی انداز میں بولا۔

''ہاں، وہاں مجھے اور کام ہی کیا تھا! زمینوں کی دیکھ بھال کے لئے کارندے اور منشی موجود ہیں۔ ماں کو وہ ایک ایک پیسے کا حساب دے دیتے ہیں۔'' کھنج نے بتایا۔

''اور اگر کسی کے دل میں بے ایمانی آ جائے تو؟'' رمیش نے سوال کیا۔

''اول تو ایسا ممکن نہیں، پھر بھی کوئی ایسا کرے تو چھپ نہیں سکتا۔ میرے بابا کے زمانے ہی سے ایسا نظام چلا آ رہا ہے کہ کارندے ایک دوسرے پر نظر رکھتے ہیں۔ تم لوگ شاید نہیں جانتے کہ زمینداروں سے ایسی کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔ کوئی نہ کوئی کارندہ، زمیندار کی نظر میں بھلا بننے کے لئے راز کھول دیتا ہے۔'' کھنج نے تفصیل سے جواب دیا، پھر کہنے لگا۔ ''گاؤں کی فضول باتوں پر خاک ڈالو اور شہر کی باتیں کرو جہاں سڑکوں پر موٹریں دوڑتی ہیں۔ چلتے ہو موٹر میں گھومنے؟''

بھلا انکار کون کرتا! سبھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔

قصہ یہ تھا کہ محلہ پٹیل ڈنگا کی جس گلی میں کھنج رہتا تھا، وہاں سکونت پذیر ایک شخص نے نئی نئی موٹر خریدی تھی۔ یہ آٹھوں پہر گاڑی کا ہارن بجاتا ہوا ادھر سے گزرتا تھا۔ یہ

صورت حال دیکھ کر کھتج کا ایک دوست اُس سے کہنے لگا۔ ''یہ آدمی تو اب ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے، اس شان کے ساتھ اس طرف سے آتا ہے کہ جیسے کوئی اور یہاں بس نہ رہتا ہو۔ کھتج! اس کا مقابلہ کرنے کے لئے تمہیں بھی موٹر خریدنی پڑے گی۔''

کھتج فوراً راضی ہو گیا۔ ہفتے بھر بعد ہی ایک غیر ملکی کمپنی سے نئی قیمتی کار خرید لی گئی۔

پھر تو کھتج پر موٹر کا ایسا نشہ سوار ہوا کہ مصوری، موسیقی اور انگریزی ناولوں کا مطالعہ سب کچھ بھول گیا۔ دراصل اُس کا مزاج ہی کچھ ایسا تھا، انتہا پسندانہ! وہ جو کام بھی کرتا اس پر دھن سوار ہو جاتی۔ موٹر خرید کر اُس نے ڈرائیونگ سیکھی اور پھر لائسنس حاصل کر کے ہی چھوڑا۔ جب دیکھو گیراج سے گاڑی نکال کر شہر کی سڑکوں پر اسے دوڑاتا پھرتا۔ ڈرائیونگ کی اُسے لت سی پڑ گئی۔ اسے کالج جانے تک کا خیال نہ آتا۔

اسی دوران میں گنگا اشنان کا زمانہ آ گیا۔ پورا بنگال جیسے کلکتے میں جمع ہونے لگا۔ کلکتہ آبادی کے اعتبار سے یوں بھی بہت بڑا شہر تھا، مگر جب اشنان کے دن آنے لگتے تو ہر جگہ لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جاتی۔ اس بھیڑ کو قابو میں رکھنے، اشنان کے لئے کلکتے آنے والوں کی رہنمائی کرنے اور دوسرے چھوٹے بڑے کاموں کی خاطر شہر والوں نے مختلف سماجی تنظیمیں بنا رکھی تھیں۔ ان تنظیموں کا رُکن بننے اور لوگوں کی خدمت کرنے کو ثواب کا کام سمجھا جاتا تھا۔ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے کھتج نے اپنے دوستوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ بھی رضا کاروں میں نام لکھوا لیں۔ خود کھتج بھی رضا کار بننا چاہتا تھا۔

کھتج کے دوستوں میں گنیش بہت چالاک تھا۔ اُسے اندازہ تھا کہ اگر کھتج بھی رضا کار بن گیا تو پھر موٹر میں بیٹھ کر شہر بھر کی سیر و تفریح ختم ہو جائے گی۔ پھر باقی سارے دوستوں نے تو کھتج کے مشورے پر عمل کیا مگر گنیش نے نہ صرف خود اپنا دامن بچا لیا بلکہ کھتج کو بھی رضا کار نہیں بننے دیا۔

پوچھنے پر گنیش نے کھتج کو بتایا۔ ''میں گیا تھا رضا کار بننے مگر اب وہ مزید لوگوں کو بھرتی نہیں کر رہے۔ ضرورت سے زیادہ لوگوں نے رضا کار بننے کے لئے اپنے نام لکھوا دیئے ہیں۔ مجھے بھی انہوں نے واپس کر دیا۔''

کھتج نے کئی سماجی و مذہبی تنظیموں کے نام لئے لیکن بے سود! گنیش نے بتایا کہ وہ سبھی کے دفتروں میں جا کے دیکھ چکا ہے۔

''پھر تو میرے لئے بھی یہی مشکل ہو گی۔'' کھتج بولا۔

''ہاں اور کیا۔'' گنیش نے فوراً سر ہلا دیا۔ ''جب میں ہر جگہ گھوم آیا تو تمہیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو گیا ہی اس لئے تھا کہ اگر کہیں رضا کاروں کی فہرست میں گنجائش ہو تو اپنا اور تمہارا نام لکھوا دوں مگر کیا، کیا جائے بھگوان ہی کی مرضی نہیں۔ تمہیں ایک بات اور بتاؤں کھتج!''

''بولو......'' کھتج نے کہا۔

''تم عام آدمی نہیں ہو۔'' گنیش کے لہجے میں چاپلوسی تھی۔

''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔'' کھتج حیرت سے بولا۔

''دیکھو، یہ تو ٹھیک ہے کہ لوگوں کے کام آنا پن (ثواب) ہے۔ مگر یہ بھی غلط نہیں کہ ہر کام ہر ایک شخص کو زیب نہیں دیتا۔ جو لوگ رضا کار بنتے ہیں، تمہاری طرح ان کا تعلق بڑے گھرانوں سے نہیں ہوتا۔ اب سمجھے میری بات؟'' گنیش نے تصدیق طلب نظروں سے کھتج کی طرف دیکھا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' کھتج اپنی عادت کے مطابق خود کو دوسروں سے برتر و مختلف بتائے جانے پر خوش ہو گیا۔



دوپہر بھر اِدھر اُدھر لوگوں کی بھیڑ میں کار چلانا آسان نہیں تھا۔ پولیس کا کڑا انتظام تھا جو ٹریفک کو کنٹرول کر رہی تھی۔ مجبور ہو کر بھیڑ سے بچنے کے لئے کھتج کو سڑک چھوڑ کر اہیری ٹولے کی ایک گلی میں اپنی موٹر لے جانی پڑی۔ راستے میں اُس نے دیکھا ایک دُکان پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ اُس نے سوچا، یہ تو گنگا کنارے جانے کا راستہ نہیں ہے پھر یہاں اتنی بھیڑ کیوں ہے؟ وہ اپنی موٹر کو دھیرے دھیرے آگے بڑھانے لگا۔ کھتج کے ساتھ اس وقت صرف گنیش ہی تھا۔ اُسے خیال آیا، کہیں کوئی حادثہ تو نہیں ہو گیا؟

کھتج کی گاڑی کچھ اور آگے بڑھی تو اُس نے دیکھا کہ برآمدے میں ایک گلاب جیسی نرم و نازک خوب صورت لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ اُس لڑکی کے سیاہ بال چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ اُس کے حُسن سے جیسے چاروں طرف چکا چوند ہو رہی تھی۔

اُس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے جا رہے تھے۔ کھتج نے گاڑی روک دی اور نیچے اُترا۔

لوگوں نے اُسے دیکھا تو بھیڑ میں سے کوئی بولا۔ ''لو، ایک گاڑی بھی آ گئی۔ اب اسے گاڑی میں لٹا کر ہسپتال تک لے جانا ٹھیک ہوگا۔''

''کیا خبر اسی کے گھر کی عورت ہو!'' کسی نے کھتج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کسی قدر دھیمی آواز میں کہا۔

کھتج کے تیور دیکھ کر لوگوں نے خود ہی محسوس کر لیا کہ وہ نوجوان لڑکی، کھتج کے لئے اجنبی ہے۔

''یہ تو کوئی یاتری معلوم ہوتا ہے۔'' ایک شخص نے رائے زنی کی۔

''کیوں جناب؟'' کوئی کھتج سے مخاطب ہوا۔

کھتج کوئی جواب دیئے بغیر لوگوں کے درمیان سے آگے بڑھتا گیا۔ قریب پہنچ کر جب اُس کی نظر لڑکی پر پڑی تو جیسے پلٹنا بھول گئی۔ وہ مبہوت سا ہو گیا۔ کیا کوئی لڑکی اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے؟ اُس نے سوچا، پھر جھک کر لڑکی کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''لگتا ہے کمزوری کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔'' کھتج نے لڑکی کی نبض دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''یہ ڈاکٹر ہے شاید!..... اچھا ہوا۔'' کسی نے تبصرہ کیا۔

''ان کا گھر کہاں ہے؟'' کھتج نے لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہم نہیں جانتے..... ہمیں نہیں معلوم بابو صاحب!'' جواب ملا۔

''یہاں کوئی ان کا رشتے دار ہے؟..... کوئی ان کے ساتھ تھا؟'' کھتج نے پھر دریافت کیا۔

''کوئی بھی رشتے دار نہیں..... نہ کسی کو ساتھ دیکھا۔'' لوگوں نے بتایا۔

''کتنی دیر سے یہ حالت ہے؟'' کھتج نے سوال کیا۔

''ہمیں کچھ خبر نہیں..... یہ سڑک پر پڑی تھی۔ ہم نے اسے اٹھا کر یہاں دُکان کے برآمدے میں لٹا دیا۔ ہم لوگ ابھی پولیس کو اطلاع دینے کے بارے میں سوچ رہے

تھے کہ اسی وقت.....'' کھتج پوری بات دھیان سے نہ سن سکا کیونکہ اُس کی توجہ دوسری طرف ہو گئی۔

کھتج نے غیر واضح سی ایک آواز سنی۔ ''کون جانے کس ذات کی ہے..... کیسی عورت ہے!'' ایک جانب سے کسی نے واہیات اشارہ بھی کیا۔

ایک بار پھر کھتج نے اُس بے ہوش لڑکی کی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرہ پُرکشش ہونے کے علاوہ بھولا بھالا سا بھی تھا۔ چہرے سے بھولپن اور ایک نوع کی معصومیت کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے بازاری ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کوئی جیسے کھتج کے اندر سے بولا۔ یہ تو معصوم چہرہ ہے۔

''گنیش!'' کھتج نے اپنے دوست کو آواز دی۔

''ہاں، کیا بات ہے؟'' گنیش نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''چلو، اسے موٹر پر ہسپتال لے چلیں۔ ورنہ بے چاری پر نہ جانے کیا بیتے۔'' کھتج کہنے لگا۔

گنیش اپنی زبان سے اقرار یا انکار نہ کر سکا۔ وہ عجیب سی نظروں سے کھتج کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''کیوں، کیا ہوا؟'' کھتج نے اُسے ٹوکا۔

''کچھ نہیں۔'' گنیش چونک کر بولا۔ ''چلو۔''

اس کے بعد حیران و ششدر لوگوں کے ہجوم میں سے نکال کر دونوں دوست اُس بے ہوش لڑکی کو موٹر تک لے آئے۔

کھتج نے ذرا دیر میں کار اسٹارٹ کر دی۔ اس وقت لوگ پھر بلند آواز میں بے ہوش لڑکی کے متعلق تبصرے کرنے لگے۔ دوسری جانب کھتج کے دل میں عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی جسے وہ کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔

ہری سین روڈ پر پہنچ کر کھتج کی گاڑی جب سیالدہ کی طرف بڑھی تو گنیش بول اُٹھا۔

''کیا کیمبل ہسپتال چلو گے؟ میڈیکل کالج ہوسپٹل نہیں چلنا؟''

گنیش کی بات سن کر کھتج کو شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ فوری طور پر تو اُس کی زبان سے کوئی بات نہیں نکلی، پھر خود پر کسی قدر قابو پاتے ہوئے وہ کہنے لگا۔ ''یہ کسی بھلے گھر

کی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ اسے فوراً ہسپتال لے جانا اور وہیں چھوڑ کر چلے آنا کیا اچھی بات ہو گی؟...... ڈاکٹر کو بلا کے اسے گھر ہی پر دکھا دوں گا...... پھر ڈاکٹر جو دوا لکھے گا، لا کے کسی نرس کا بندوبست بھی کر دوں گا جو اس کی دیکھ بھال کرے۔ جب ذرا افاقہ ہو جائے گا تو اس کے گھر والوں کو خبر کر دوں گا۔''

اپنے گھر آ کے کھنج نے لڑکی کے لئے دوا اور تیمارداری کا پورا انتظام کر دیا۔ ڈاکٹر کو بلایا۔ ایک نرس کے ساتھ نوکرانی بھی رکھ دی گئی۔ گھر کی دوسری منزل پر مریضہ کے رہنے کی وجہ سے دوست احباب کو کچھ خبر تک نہیں ہوئی۔ کھنج کے دوستوں میں صرف گنیش حقیقت سے واقف تھا جس نے مصلحت کے تحت خاموشی اختیار کر لی تھی۔ ڈاکٹر نے لڑکی کا معائنہ کر کے بتایا تھا کہ کسی طرح کے ذہنی صدمے کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ لڑکی پر کیونکہ مستقلاً بے ہوشی طاری نہیں، بیچ بیچ میں ہوش آ جاتا ہے اور پھر بے ہوش ہو جاتی ہے اس لئے فکر کی کوئی بات نہیں۔

اُس روز شام ہی سے کھنج، لڑکی کے سرہانے بیٹھ گیا اور پھر ساری رات جاگتے ہوئے گزار دی۔ گنیش کا رات بھر وہاں رہنا ممکن نہیں تھا۔ شادی کے بعد محبت کی وجہ سے اُس کی بیوی کافی حساس تھی۔ پھر یہ کہ اُس کی شادی کو زیادہ دن بھی نہیں ہوئے تھے۔

لڑکی کے سرہانے بیٹھے وہ کئی باتیں سوچ رہا تھا۔ اپنے تخیل کو اُس نے آزاد چھوڑ دیا۔ ان بند آنکھوں میں نہ جانے کیا راز چھپا ہوا ہے؟...... معلوم نہیں کب یہ راز اس پر کھلے گا؟ وہ سوچتا رہا اور ساری رات خیالوں کے تانے بانے بنتا رہا۔ اُس نے بہت سی ایسی کہانیاں سنی تھیں جن میں راجا، مہاراجا لوگ شکار کو جاتے اور وہاں انہیں کوئی انتہائی خوبصورت عورت مل جاتی۔ اس عورت کو وہ اپنے ساتھ لے آتے اور پھر اسی سے شادی کر لیتے، اُسے رانی بنا کے رکھتے۔ یہ معاملہ بھی کھنج کو کچھ اسی قسم کا لگ رہا تھا۔

پلنگ پر بے ہوش پڑی ہوئی اس نوجوان و حسین لڑکی کو کھنج بڑی مضطرب نظروں سے دیکھنے لگا۔

اس وقت دس بجے ہوں گے جب لڑکی نے آنکھیں کھولیں اور اِردگرد کا جائزہ لیا۔ اُسے ہوش میں آتے دیکھ کر نرس نے چمچے سے تھوڑا سا انار کا رس اُس کے منہ میں ڈال دیا۔ لڑکی نہایت پُرشکوک اور خدشے بھری نظروں سے نرس کے چہرے کی طرف

دیکھنے لگی۔

کچھ دیر نرس کو تکتے رہنے کے بعد گلاب کی پنکھڑیوں جیسے لبوں کو حرکت ہوئی۔ لڑکی نے پوچھا۔ ''میں کہاں ہوں؟''

نرس نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''آپ اچھی جگہ ہیں، کوئی فکر مت کیجئے۔''

تاکید کے باوجود لڑکی خاموش نہ رہ سکی اور پھر سوال کیا۔ ''میرے ماں باپ کہاں ہیں؟''

نرس نے لڑکی کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس لڑکی کے بارے میں نرس کچھ نہیں جانتی تھی جس کی عمر اُسے سولہ سترہ سال سے زیادہ معلوم نہ ہوتی تھی۔ اسے صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ وہ لڑکی راستے میں بے ہوش پڑی ملی تھی اور اسے کھنج انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اپنے گھر لے آیا تھا۔ وہ کون تھی، کہاں سے آئی تھی اور اس کے والدین کہاں ہیں، نرس کو علم نہیں تھا۔ نہ ان باتوں سے نرس کا کوئی تعلق تھا۔

کچھ ہی فاصلے پر کھنج ایک آرام کرسی پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھنے میں مصروف تھا۔ نرس نے اُس کی طرف پُرتجسس نظروں سے دیکھا۔ وہ نرس کے پاس آ کھڑا ہوا تو لڑکی نے اُسے مخاطب کیا۔ ''یہ آپ کا گھر ہے؟''

''جی ہاں۔'' کھنج نے بتایا۔

''میرے والدین کے بارے میں آپ کو خبر ہے کچھ کہ کہاں ہیں؟'' لڑکی نے معلوم کیا۔ اُس کی آواز بھی اُسی کی طرح پُرکشش تھی۔

''مجھے پتہ نہیں۔'' کھنج نے کہا۔ ''لیکن تلاش کر کے انہیں یہاں لے آؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں...... گھبرائیں نہیں...... یہاں آپ کو کچھ ڈر نہیں ہے۔''

لڑکی بستر پر خاموش پڑی رہی۔ سامنے کھڑکی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ نڈھال سی نظروں سے اس طرف دیکھنے لگی۔ بے کراں آسمان میں چھائی ہوئی دُھوپ مکانوں پر پڑ رہی تھی۔ اسی دُھوپ کی سنہری کرنیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ آسمان کی طرف تکتی ہوئی وہ لڑکی جیسے کسی سوچ میں گم تھی۔ شاید وہ اپنی موجودہ حالت کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ وہاں کیسے پہنچی؟...... وہ اس دن کے متعلق سوچنے لگی جب اپنے ماں باپ

سے بچھڑی تھی۔ اُسے ٹھیک طرح سے تمام باتیں یاد نہیں آ رہی تھیں۔ بس دھندلی دھندلی سی یادوں کی کچھ پرچھائیاں سی اُس کے صفحۂ ذہن پر رقصاں تھیں۔ جو کچھ اُسے یاد آ رہا تھا، غیر واضح اور مبہم سا تھا...... ایک بھیڑ تھی...... خوب شور شرابا تھا۔ آدمیوں کا سمندر ایک ریلے کی طرح اُس پر آ پڑا۔ اس دھکے کے زور سے وہ اپنے لوگوں سے بچھڑ کر دُور آ پڑی تھی۔ بھیڑ ہٹ جانے پر جیسے ہی اُس نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو کچھ بھی نظر نہ آیا۔ ڈر کے مارے اُس کا سارا بدن کانپ اُٹھا، سر چکرا گیا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ خود کو سنبھالتی اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ تشویش کے بے پناہ سمندر کا اُسے کہیں کنارہ نظر نہیں آیا۔ تھکی ہاری سی وہ جیسے اپنے آپ میں بند ہوگئی۔

سات آٹھ دن بعد وہ لڑکی صحت یاب ہوگئی۔ مسلسل علاج ونگہداشت نے اُس پر خوشگوار اثرات مرتب کئے تھے۔ اُس کے دل کی حالت پہلے ہی سنبھل چکی تھی۔ وہ بستر سے اُٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ کھنج نے ایک طرح سے یار دوستوں کی صحبت چھوڑ ہی دی تھی۔ دن بھر وہ اس دو منزلہ مکان کے ایک کمرے میں پڑا رہتا تھا جو لڑکی کے کمرے کی بغل ہی میں تھا۔ کبھی کبھی خود وہی اس مریضہ کے کمرے میں چلا جایا کرتا تھا۔ یوں جیسے پھولوں کی خوشبو کو تلاش کرتا ہوا کوئی بھونرا پودوں کے آس پاس گردش میں رہتا ہے۔ وہ لڑکی بھی کھنج کے لئے مجسم خوشبو ہی تھی، وہ اس خوشبو کو چھوڑ کر کہیں بھی جانے کا روادار نہیں تھا۔

دوپہر کے وقت وہ لڑکی بستر پر دراز تھی کہ کھنج دبے پاؤں اُس کے کمرے میں داخل ہوا۔

''آپ کی طبیعت تو اب ٹھیک ہے نا؟'' کھنج نے لڑکی سے پوچھا۔

''جی ہاں، میں خود کو بہتر محسوس کر رہی ہوں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''آپ کا گھر کہاں ہے؟...... گھر میں کون کون ہے؟...... اس کے علاوہ راستے میں اُس دن......'' کھنج کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔

لڑکی بے اختیار رونے لگی۔ اُسے اپنے چاروں طرف ناقابل عبور دیوار سی محسوس ہوتی تھی۔ راستہ کہاں ہے؟...... گھر جانے کا راستہ کون سا ہے؟ وہ سوچتی۔ اس اجنبی جگہ آٹھوں پہر قیدی کی طرح رہتے ہوئے وہ عاجز آ چکی تھی۔ اس کے علاوہ اُسے اپنا

مستقبل بھی غیر یقینی معلوم ہوتا تھا، ایک بہتر مستقبل! اس وقت بھی جب کھنج نے اس سے مختلف سوالات کئے تو وہ اسی کیفیت میں مبتلا ہوگئی اور اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''آپ روئیے نہیں۔'' کھنج نے اُسے تسلی دی۔ ''مختصر الفاظ میں مجھے آپ اپنے بارے میں بتا دیجئے۔ میں آپ کے گھر والوں کو فوری طور پر اطلاع دینے کا بندوبست کر دوں گا۔ اگر ضرورت ہوئی تو میں خود جا کر آپ کو وہاں پہنچا آؤں گا۔''

لڑکی نے ہمدردی کے بول سنے اور اُسے کھنج کی شکل میں ایک غم بانٹنے والا دکھائی دیا تو اپنا تمام حال کہہ سنایا۔

اپنے گاؤں سے والدین کے ہمراہ وہ گنگا اشنان کے لئے کلکتے آئی تھی۔ گاؤں کی دیگر عورتیں بھی ساتھ تھیں۔ یہاں ایک چوراہے پر بہت بھیڑ تھی۔ وہیں پر آدمیوں کے ریلے میں وہ بچھڑ گئی۔ پھر نہ ہی اُسے اپنے ماں باپ دکھائی دیئے نہ گاؤں کی عورتیں نظر آئیں۔ بھیڑ کے دھکے سے وہ بہت دُور چلی گئی۔ اس کے آگے پیچھے اور آس پاس اجنبی لوگ تھے۔ وہ ان سے خوفزدہ ہوگئی اور پھر سڑک کے ایک کنارے اس اُمید پر کھڑی ہو گئی کہ اس کے والدین نیز گاؤں والے اسی طرف سے گزریں گے۔ اسی دوران اُدھر سے گزرنے والے افراد اُسے عجیب عجیب سی نظروں سے دیکھنے اور آپس میں اشارے کرنے لگے۔ اس کی وجہ سے اُس کے خوف میں اضافہ ہوتا گیا۔ اُسے یوں لگا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ رہ سکے گی۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد اُسے چکر سے آنے لگے اور وہ سڑک کے کنارے بیٹھ گئی۔ اُسے بس اتنا یاد تھا کہ اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا اور پھر وہ اپنے ہوش کھو بیٹھی تھی۔ جب اُسے ہوش آیا تو اُس نے خود کو اس گھر میں پایا۔ اُسے نہیں معلوم کہ وہ یہاں کس طرح پہنچی!

''آپ کے والد کا نام کیا ہے؟'' کھنج نے سوال کیا۔

''شری ہرناتھ جی۔'' لڑکی نے اپنے باپ کا نام احترام سے لیا۔

''گھر کہاں ہے؟''

جواباً لڑکی نے اپنے گاؤں کا نام بھی بتا دیا۔

کھنج ''اچھا'' کہہ کر وہاں سے اٹھا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ میز پر خط لکھنے کے

لئے پیڈ رکھا تھا۔ اُس نے ایک کاغذ پر لکھنا شروع کیا۔ ''محترم۔'' پھر کاٹ کر لکھا۔ ''مہاشے۔'' مگر اتنا ہی لکھ کر وہ رُک گیا۔ وہ سوچنے لگا، یہ میں کیا کر رہا ہوں؟...... خط لکھنے کا مقصد تو اپنے ہاتھوں خود کو دُکھی کرنا ہے۔ یہ جو میری زندگی میں رنگ و روپ کی بہار آئی ہے کیا میں اسے خزاں میں تبدیل کر دوں؟ کیا اس روشنی کو خود سے دُور کر دوں جس نے میرے اندر کے اندھیروں کو ختم کر دیا ہے؟...... ''نہیں...... نہیں!'' وہ بڑبڑایا۔ ''مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ مجھ سے یہ خط نہیں لکھا جائے گا۔''

وہ خیالوں کی بھول بھلیوں میں کہیں سے کہیں نکل گیا۔ لڑکی نے اُس کے گھر میں اُجالا سا کر دیا تھا۔ کیا یہ اُجالا ہمیشہ کے لئے اس کا ہو سکے گا؟ پہلے سے وہ اس لڑکی کو نہیں جانتا تھا لیکن اب تو اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ ابھی تک کھنج نے اپنے دل کی بات کسی سے نہیں کہی تھی۔ کسی کو علم نہیں تھا کہ لڑکی کے بارے میں اس کے کیا جذبات ہیں...... کیا خبر اس لڑکی نے بھی کچھ محسوس کیا ہوگا یا نہیں؟ وہ خیالوں کے تانے بانے بنتا رہا۔ وہ لڑکی اُس کی محبت کے گداز کو محسوس کرے یا نہ کرے مگر سامنے ہی رہے تو بڑی بات ہے، یہی بڑا سکھ ہے۔ ایک مکان میں ایک جگہ دونوں موجود ہیں۔ وہ جب چاہے اسے دیکھ سکتا ہے، اس سے بات کر سکتا ہے۔ اتنا بھی کم نہیں، اس پر بھی قناعت کی جا سکتی ہے۔

پھر کھنج کا ذہن دوسری راہ پر چل نکلا۔ اگر وہ خط نہ لکھے تو کیا کرے؟ وہ لڑکی بہرحال اس کے لئے اجنبی ہے۔ وہ اس غیر لڑکی کو اس کی مرضی کے خلاف اپنے گھر میں قیدی بنا کر بھی تو نہیں رکھ سکتا۔ ایسا کرنا تو کسی طرح مناسب نہیں ہوگا۔ یہ فعل تو قابل سزا سمجھا جائے گا۔

''اگر میں اس سے شادی کر لوں تو؟'' وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔ ''مگر...... وہ بیاہی ہے یا کنواری، یہ تو اس سے پوچھا ہی نہیں!...... لیکن شادی شدہ لگتی نہیں۔ ابھی تو وہ ایک کلی نظر آتی ہے...... اس لڑکی کو بھگوان نے شاید میرے ہی لئے یہاں بھیجا ہے ورنہ میں تو اپنے گھر میں آرام سے بیٹھا تھا، پھر جانے کیوں سیر سپاٹے کی سوجھ گئی اور اس گلی میں جا پہنچا جہاں لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ وہاں سے تو پہلے کبھی میرا گزر بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ سب کچھ بے سبب تو نہیں ہو سکتا...... شاید اسی کو قسمت کہتے

ہیں۔ قسمت کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے؟...... پہلے میں قسمت کا قائل نہیں تھا مگر اب مجھے قائل ہونا پڑے گا۔''

اپنے دل میں اُمید کی شمع روشن کئے وہ ایک بار پھر لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔

''دیکھئے، میں ایک بات سوچ رہا تھا۔'' کھنج نے لڑکی کو مخاطب کیا۔ ''آپ کی شادی ہو چکی ہے نا؟...... اگر ہو چکی ہے تو جیسا کہ میں سمجھتا ہوں، آپ کا سسرال بھی کہیں قریب ہی ہوگا۔ ایسی صورت میں آپ کے شوہر ہی کو خبر کرنا بہتر ہے۔''

کھنج نے دھڑکتے دل کے ساتھ یہ الفاظ ادا کئے۔ اُسے یقین تھا کہ جواب میں وہ لڑکی یہی کہے گی کہ میری شادی نہیں ہوئی۔ دراصل اُس نے سوچا تھا کہ براہِ راست لڑکی سے یہ سوال کرنا مناسب نہیں ہوگا کہ وہ کنواری ہے یا شادی شدہ؟ اسی وجہ سے اُس نے گھما پھرا کر یہ بات کی۔

لڑکی کا جواب اُس کے لئے خلافِ توقع تھا۔ کھنج نے سنا کہ اُس کی شادی ہو چکی ہے اور شوہر موجود ہے۔

جواب سن کر کھنج کے وجود میں جیسے آندھیاں سی چلنے لگیں۔

''آپ کئی دن سے میرے گھر میں ہیں۔'' کھنج اپنے جذبات پر قابو پا کر کہنے لگا۔ ''وہاں آپ کی گمشدگی کی وجہ سے شور مچا ہوگا۔ آپ کے اچانک غائب ہو جانے کی خبر کانوں کان سب تک پہنچ گئی ہوگی۔ چھوٹے سے گاؤں میں یہ بات چھپی بھی کیسے رہ سکتی ہے! ایسی حالت میں آپ کے پتا جی کو خط لکھنے سے لوگ کیا کیا باتیں بنائیں گے، یہ بھی سوچا ہے آپ نے؟ میرا تو خیال ہے کہ آپ کے گھر تک خاموشی اور رازداری کے ساتھ یہ اطلاع پہنچائی جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو طرح طرح کی افواہیں پھیلیں گی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ یوں سمجھ لیں کہ ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوگا۔'' اتنا کہہ کر وہ کچھ دیر کو خاموش ہو گیا۔ لڑکی اس عرصے میں خاموش ہی رہی۔ کھنج پھر بولا۔ ''آپ سمجھیں کہ نہیں...... آپ کو گھر تک کسی پریشانی کے بغیر پہنچانا میری ذمے داری ہے یا نہیں!...... کتنے دن ہو گئے آپ کے گھر والوں کو کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ اچانک اب انہیں آپ کی طرف سے کوئی اطلاع خط کے ذریعے ملی تو وہ کیا سوچیں گے۔ اچھا یہ بتائیں، کلکتے میں آپ کا کوئی جاننے والا ہے؟''

لڑکی سوچتی رہی اور کھنج پیاسی نظروں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر یہ سب کتنی دیر کے لئے ہے؟ کھنج سوچ رہا تھا۔ یہ حسین لڑکی اس کی زندگی سے ابھی...... جلد ہی...... ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو جائے گی۔ پھر اس سے ملاقات کی اُمید بھی نہیں رہے گی۔

''ایک ہیں میرے جاننے والے۔'' لڑکی اچانک بول اُٹھی۔ ''میرے ہی گاؤں کے ہیں وہ...... اور یہاں کالج میں پڑھتے ہیں۔ اگر آپ اُن کا پتہ لگا سکیں تو میری مشکل شاید آسان ہو سکتی ہے۔ اُن کے سوا تو کوئی اور ایسا واقف کار نہیں۔''

''اُن کا نام کیا ہے؟'' کھنج نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

''سریندر۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ ''اُن کے والد ہمارے گاؤں کے زمیندار ہیں۔ گاؤں میں ہمارے گھر کے قریب ہی ان کا گھر ہے۔''

''یہاں کلکتے میں وہ کس کالج کے طالب علم ہیں؟...... اور کہاں رہتے ہیں؟''

''اتنا تو میں نہیں جانتی۔''

''اچھی بات ہے۔'' کھنج نے لڑکی کو تسلی دی۔ ''میں انہیں تلاش کرتا ہوں...... مگر وہ مل جائیں تو آپ کے بارے میں ان سے کیا کہوں؟''

''میرے پتاجی کے نام سے وہ مجھے پہچان جائیں گے۔''

''آپ کا نام کیا ہے؟'' کھنج نے پوچھ ہی لیا۔

''میرا نام کملا دیوی ہے۔'' لڑکی نے بتایا۔



کملا کا شوہر ستیش چندر ایک دفتر میں کلرکی کرتا تھا۔ اُس کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ وہ اسی سبب شادی کرنے پر آمادہ نہیں تھا، مگر اُس کی ماں دُرگا شادی پر مصر تھی۔ آخر اس نے قریبی گاؤں میں ہرناتھ کی لڑکی کملا کے ساتھ ستیش کا رشتہ طے کر دیا۔ ستیش کو ماں کی بات ماننی پڑی۔ شادی کی خاطر وہ دفتر سے کچھ دن کی چھٹی لے کر اپنے گاؤں جگدیش پور آ گیا۔

شادی کرنے کے بعد جیسے ستیش کی دنیا ہی بدل گئی۔ کملا کے قدم پڑتے ہی گھر میں گویا سب کچھ بدل سا گیا۔ ستیش کو ہر شے خوبصورت نظر آنے لگی تھی۔ پہلے اُس کا دل

گاؤں میں نہیں لگتا تھا اور وہ کلکتے ہی میں رہنا پسند کرتا تھا، مگر اب صورت حال بدل گئی تھی۔ وہ جلدی جلدی گاؤں کے پھیرے لگانے لگا۔ اُس کی ماں دُرگا بھی بہت خوش تھی۔ کملا کی خدمت میں لگی رہتی۔ اسی طرح سال بھر بیت گیا۔ ستیش کی ماں دُرگا کی بڑی تمنا تھی کہ گاؤں کی دوسری عورتوں کی طرح وہ بھی دادی کہلائے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ مایوس ہونے لگی۔ جب اُس کی مراد پوری نہ ہوئی تو وہ سوچنے لگی کہ ستیش کی دوسری شادی کر دے۔ اسی اثناء میں ستیش کو اچھی تنخواہ کی نوکری مل گئی اور اُس نے کلکتے ہی نہیں بنگال کو خیرباد کہہ دیا۔

بنگال اور یوپی کی فضا میں بہت فرق ہے۔ ستیش کو یوپی کے شہر لکھنؤ میں نوکری ملی تھی۔ باقی تو سب کچھ ٹھیک رہا مگر آب و ہوا کی تبدیلی نے ستیش کو بیمار ڈال دیا۔ دُرگا کو بیٹے کی بیماری کا پتہ چلا تو گھبرا گئی۔ اُس نے کملا کو میکے بھیج دیا اور ایک قریبی عزیز کے ساتھ لکھنؤ پہنچ گئی۔ اس وقت تک ستیش کی طبیعت خاصی سنبھل چکی تھی۔ اُسے اپنے افسر کے گھر کے قریب ہی فیملی کوارٹر مل گیا تھا۔ جدید طرز کا وہ چھوٹا سا ہوادار گھر دُرگا کو اس قدر اچھا لگا کہ وہ ستیش کے صحت یاب ہونے کے باوجود گاؤں واپس جانے پر راضی نہ ہوئی۔ وہ اپنے ہمراہ آئے ہوئے عزیز کو رخصت کر کے ستیش سے یہ اصرار کرنے لگی کہ کملا کو بھی وہی بلا لے۔ ستیش نے وعدہ کر لیا کہ بڑے دن کی چھٹیوں میں جا کر وہ کملا کو بنگال سے لے آئے گا۔ یہ سن کر دُرگا بے فکر ہو گئی۔

اس غریب الوطنی میں ستیش کو بھی تنہائی اچھی نہیں لگتی تھی۔ کملا کو اتنی دُور بنگال میں چھوڑ کر لکھنؤ میں اکیلے رہنا اُس کے لئے بھی مشکل تھا۔ کملا کا فراق اُسے مضطرب کئے رہتا تھا۔ کملا کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط اُسے ہر دوسرے دن مل جاتا تھا، پھر بھی اُس کی بے چینی کم نہیں ہوتی تھی۔ کملا کا جو آخری خط اُسے ملا تھا، اس میں لکھا تھا کہ وہ گنگا اشنان کے لئے کلکتے جا رہی ہے۔ ستیش چار پانچ دن کوئی خط نہ لکھے۔

چار پانچ دن کی جگہ اب دو ہفتے گزر چکے تھے، کملا کی اُسے کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی۔ اُس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ کملا کو پندرہ دن تک اُسے خط لکھنے کی فرصت نہیں ملی، آخر کیوں؟ اگر وہ ابھی تک گاؤں واپس نہیں پہنچی تو کیا کلکتے سے خط نہیں لکھا جا سکتا؟ میں بھی دیکھتا ہوں کہ وہ کب تک خط نہیں لکھتی! وہ سوچنے

لگا۔ میں خود اُسے خط نہیں لکھوں گا۔

اسی سوچ بچار میں مزید دو ہفتے گزر گئے اور ستیش کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اُس نے سوچا، کملا کہیں بیمار تو نہیں ہو گئی؟ اسی خیال کے تحت ستیش نے اُسی روز کملا کے نام ایک خط لکھا، مگر جواب نہیں ملا۔

ستیش کی بے چینی اور بڑھ گئی، وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اپنے سسر ہرناتھ کو کملا کے بارے میں خط لکھے یا نہیں کہ ڈاک سے اُسے ایک خط موصول ہوا۔ اس خط کی تحریر نامانوس تھی لیکن مُہر سسرال کے ڈاک خانے ہی کی تھی۔

تیزی کے ساتھ دھڑکتے دل سے وہ خط کی عبارت پڑھنے لگا۔

''جنابِ عالی!

بہت دُکھ کے ساتھ آپ کو یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ آپ کی بیوی کملا دیوی ہمارے گاؤں سے گنگا اشنان کے لئے کلکتے گئی تھی جہاں سے غائب ہو گئی۔ پتہ چلا ہے کہ وہ گاؤں کے زمیندار یوگیندر کے بیٹے سریندر سے پیار کرتی تھی۔ جہاں تک معلوم ہے، آپ کے سسر جی نے یہ بری خبر چھپا رکھی ہے۔ کملا دیوی بہرحال آپ کی بیوی ہے۔ انصاف اور مذہب کی رو سے اس پر آپ ہی کا حق ہے چنانچہ آپ کو مطلع کیا جانا ضروری ہے۔ یہی سوچ کر میں یہ خبر آپ تک پہنچا رہا ہوں۔''

خط کی عبارت کے آخر میں کسی کا نام نہیں تھا۔ ستیش وہ خط پڑھ کر چکرا گیا اور پھر خلا میں تکنے لگا۔ اُس کی ماں دُرگا دیوی کو بھی خط آنے کا علم تھا۔ تقریباً ایک ماہ سے کملا کی کوئی خبر نہ ملنے سے وہ بھی پریشان تھی۔

''کیوں ستیش، کیا بات ہے؟'' دُرگا دیوی اپنے بیٹے کے قریب پہنچ کر پوچھنے لگی۔ ''کس کا خط آیا ہے؟ بہو کے میکے سے کوئی بری خبر تو نہیں آئی؟''

ستیش خاموش بیٹھا رہا۔ اپنی ماں کی بات کا اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کا سارا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا۔

دُرگا دیوی نے اپنے دوپٹے کے آنچل سے ستیش کا چہرہ صاف کیا اور ہوا جھلتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔ ''ارے کیا ہوا ہے؟ تیرے اس طرح چپ رہنے سے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

ستیش نے میز پر پڑا ہوا خط آہستہ سے ماں کو تھما دیا۔

دُرگا دیوی نے دو ایک بار خط اُلٹ کر دیکھنے کے بعد ستیش کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کیا پڑھنا لکھنا جانتی ہوں جو یہ خط تو نے مجھے دے دیا ہے! تو خود ہی پڑھ کر ایک بار مجھے سنا دے۔ خط میں کیا لکھا ہے، یہ جاننے کے لئے میرا دل بھی بے چین ہے بیٹا!''

تب ستیش نے بھرائی ہوئی آواز میں تمام قصہ ماں سے بیان کر دیا۔

دُرگا دیوی نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ''یہ ضرور کسی دشمن کی کارستانی ہے۔ میری لکشمی جیسی بہو ایسا برا کام کبھی نہیں کر سکتی۔ تو سمدھی جی کو خط لکھ کر ڈال دے۔ اچھی طرح پتہ لگا!...... یہ گمنام خط پڑھ کے اپنی طبیعت خراب نہ کر۔''

ماں کی بات ستیش کی سمجھ میں آ گئی۔ اُس نے فوراً سسر کے نام ایک تار بھیج دیا۔



سریندر کا سراغ لگانے کھنچ گھر سے نکلا تو بہت دیر تک نہ لوٹا۔ کملا اُس کی راہ دیکھنے لگی۔ طرح طرح کے گمان اُس کے ذہن کو پریشان کرنے لگے۔ سینکڑوں خدشات نے ذہن میں جنم لیا۔ اگر سریندر کا کچھ پتہ نہ چل سکا تو پھر کیا ہوگا؟ وہ کس طرح اپنے گھر جائے گی؟ اسے اپنے ساتھ یہاں سے کون لے جائے گا؟ ماں باپ اُس کی کتنی فکر کر رہے ہوں گے؟ چاروں طرف اسے تلاش کیا جا رہا ہوگا۔

کملا اندر ہی اندر بے چین ہو کر تڑپ اُٹھی۔ اس گھر میں آئے اُسے خاصے دن ہو چکے تھے۔ وہ اتنے دن تک ایک اجنبی شخص کے ساتھ تھی۔ کتنی شرم کی بات ہے؟ گاؤں کے لوگ کیا کہیں گے؟ وہ ایک باعزت گھرانے کی بیٹی اور بہو ہے، ایک گرہستن ہے۔ ایک انجانے نوجوان کے ساتھ وہ اکیلی اس گھر میں ہے۔ نہ یہاں کوئی اس کا آشنا ہے، نہ گھر میں کوئی بال بچہ ہے۔

اپنی حالت کو محسوس کر کے کملا کانپ اُٹھی۔ بلاوجہ اُس کے ماتھے پر بدنامی کا داغ لگ رہا ہے۔ اس خدشے سے وہ ڈر گئی۔ ندامت کے سبب وہ نڈھال سی ہو گئی۔ نہیں نہیں...... اب میں ایک دن بھی اس گھر میں نہیں رہوں گی۔ اگر سریندر کا پتہ لگ جائے تو آج ہی رات میں اپنے گاؤں لوٹ جاؤں گی، لیکن وہ نہ ملا تو...... تو پھر کیا ہوگا؟...... میں کیا کروں گی؟ کملا کے ذہن پر جیسے سوالوں نے یلغار کر دی۔

جیسے پیرا کی نہ جاننے والا شخص اتھاہ پانی میں غوطہ لگا کر نیچے ڈوبنے لگتا ہے، وہی کملا کی حالت تھی۔ جس وقت اُس کی یہ حالت ہو رہی تھی اور مصیبتوں کے عمیق سمندر سے نکل پانے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا تو کھنچ کمرے میں داخل ہوا۔

''دیکھئے، آپ کے سریندر بابو کا پتہ نہیں لگا۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ کل یا پرسوں تک میں اُنہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔'' کھنچ نے بتایا۔ ''آج جگدیش، گنیش اور دوسرے دوستوں کو

اطلاع دے آیا ہوں۔ آپ اس بات کا پورا یقین رکھیں کہ جیسے بھی ہوا ہم سریندر بابو کا سراغ لگا کر چھوڑیں گے۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ وہ کس کالج میں پڑھ رہے ہیں تو پھر کوئی مشکل نہ ہوتی۔ میں انہیں فوراً ڈھونڈ نکالتا۔ افسوس تو یہ ہے کہ اس بارے میں آپ کو بھی کچھ خبر نہیں۔''

کملا بول اُٹھی۔ ''اُن کے کالج کا تو مجھے علم نہیں، ماں کی زبان سے ایک بار سنا تھا کہ وہ کلکتے کے کسی سرکاری کالج میں پڑھتے ہیں۔ وہ...... وہ کالج سارے شہر میں سب سے بڑا اور پڑھائی میں بہت اچھا ہے۔''

کھنچ نے چونک کر کہا۔ ''سمجھ گیا!...... یہ بات اگر آپ نے پہلے بتا دی ہوتی تو میں آدھے میسوں میں جا کر پریشان نہ ہوتا، میری محنت بھی کام آ جاتی اور کامیاب بھی ہو جاتا۔ آپ جس کالج کی بات کر رہی ہیں، میں بھی اسی کالج میں پڑھتا ہوں۔ کل کالج جاتے ہی میں سریندر بابو کو ڈھونڈ نکالوں گا...... ہاں یہ تو بتائیں کہ وہ کون سی کلاس میں ہیں؟...... جانتی ہیں آپ؟''

کملا سر ہلا کر بولی۔ ''میں ٹھیک طرح سے نہیں جانتی۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ کالج کے پہلے درجے کی پڑھائی ختم کر چکے ہیں۔''

''تو یہ کہیں!...... تو پھر وہ شاید بی اے میں پڑھتے ہیں۔'' کھنچ نے خیال آرائی کی۔

''ہاں ہاں۔'' کملا نے زور دے کر کہا۔ ''آپ نے ٹھیک کہا۔ ''سریندر بابو اب تو بی اے ہی میں پڑھتے ہیں۔''

''پھر تو آپ بے فکر ہو جائیں۔'' کھنچ نے تسلی دی۔ ''میں کل سریندر بابو کو آپ سے ملانے یہاں لے آؤں گا۔''

کملا سر جھکائے ساڑھی کے آنچل کو اُنگلی پر لپیٹتے ہوئے کہنے لگی۔ ''میرے لئے آپ بہت تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ آپ کا یہ احسان میں ساری زندگی نہیں بھول سکوں گی۔''

کملا نے جیسے یہ کہہ کر کھنچ کے دل کی پیاس ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بجھا دی۔ اُس کی زندگی کا جو مقصد تھا، وہ پورا ہو گیا۔ اُس نے کہا۔ ''نہیں نہیں، یہ بھی کوئی تکلیف ہے؟ ایسی حالت میں تو میری جگہ جو بھی ہوتا آپ کی مدد کرتا۔ میں تو اسے اپنی خوش نصیبی کہوں گا کہ آپ کے کسی کام آ سکا۔ اب تو بس مجھے یہی دھن ہے کہ کسی طرح آپ کو

آپ کے گھر تک پہنچا سکوں۔ آپ کو یہاں رہتے ہوئے نہ جانے کتنی پریشانی اُٹھانی پڑ رہی ہوگی!...... میرے گھر میں نہ کوئی عورت ہے، نہ کوئی لڑکی یا لڑکا! سبھی کاموں کی دیکھ بھال نوکروں پر ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا ہوگا۔ گھر میں آپ کا خیر مقدم کرنے والا کوئی نہیں۔"

"میں نے اس سے بڑھ کر عزت اور خیر مقدم پہلے کہیں نہیں پایا۔" کملا دھیرے سے بولی۔ "آپ خواہ مخواہ فکر کر رہے ہیں۔"

ان الفاظ کا کھنج پر عجیب ہی اثر ہوا۔ اُس نے اپنے دل میں محبت کا گداز محسوس کیا۔ کوئی انجانی سی کیف آگیں لہر اُس کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ اُس پر رومانی کیفیت طاری ہوگئی۔ چند لمحوں کو وہ بھول ہی گیا کہ کملا شادی شدہ ہے اور اُس کا شوہر زندہ ہے۔ غیر معمولی حسین اس لڑکی کو اپنے گھر لانے کے بعد کھنج کے دل میں جذبات کا دریا موجیں مارنے لگا تھا۔ اس وقت بھی جذبات کا دریا چڑھا ہوا تھا۔

"آپ نے مجھ پر واقعی بہت مہربانی کی ہے۔" کملا کی آواز جیسے کہیں بہت دُور سے سنائی دی۔

"نہیں...... یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ!...... میں نے جو کچھ کیا، وہ تو میرا فرض تھا۔" یہ کہتے ہوئے کھنج کا چہرہ حیا سے سرخ ہوگیا اور وہ مزید کچھ نہ کہہ سکا، سر جھکائے کھڑا رہا۔

دیوار کے کلاک نے دس کے گھنٹے بجائے۔ کملا نے کہا۔ "بات چیت میں زیادہ رات ہوگئی ہے۔ آپ نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا، جائیے منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھائیے۔"

کھنج کمرے سے نکل گیا۔ کچھ ہی دیر میں کملا کو کھنج کی آواز سنائی دی۔ وہ نوکر، نوکرانی اور باورچی کو حکم دے رہا تھا کہ ہر طرح کملا کا خیال رکھیں، اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔ وہ جب کوئی حکم دے، اس کی تعمیل ہونی چاہئے۔

دوسرے دن صبح کھنج ناشتہ کر کے تقریباً دس بجے کالج چلا گیا۔ جاتے وقت اُس نے ملازمہ مہری سے کملا کو کہلا بھیجا کہ کالج سے واپسی میں وہ سریندر کو اپنے ساتھ لے کر آئے گا۔ اسی بنا پر کملا نے دوپہر تک کھنج اور سریندر کا انتظار کیا۔ سڑک کی طرف کمرے کی جو کھڑکی کھلتی تھی، اس کے سامنے بیٹھے بیٹھے کملا نے یہ وقت گزار دیا۔ انتظار کرتے

ہوئے اُس کی بے چینی بڑھنے لگی۔ اُس نے سوچا، اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟ روز تو کھنج دو تین بجے تک گھر آجایا کرتا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ سریندر اُسے نہ مل سکا ہو؟...... یا ممکن ہے، سریندر آج کالج نہ گیا ہو...... ہوسکتا ہے وہ کسی کام سے گاؤں چلا گیا ہو...... اگر سریندر ان دنوں کلکتے میں نہ ہوا تو؟ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے کملا کھڑکی کا پردہ اٹھا کر سڑک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس کی حالت پنجرے میں بند کسی چڑیا جیسی تھی۔

دھیرے دھیرے شام ہوگئی۔ سڑک کے دونوں کنارے روشنی کی قطار نظر آنے لگی۔

کملا اپنے خیالوں میں گم تھی کہ ملازمہ مہری کی آواز سن کر چونک اُٹھی جو کہہ رہی تھی۔ "آج آپ منہ ہاتھ نہیں دھوئیں گی؟...... کھائیں پئیں گی نہیں؟...... شام ہوگئی۔"

"نہیں مہری!" کملا نے اُداس آواز میں جواب دیا۔ "طبیعت ٹھیک نہیں۔ کچھ بھی کھانے پینے کو جی نہیں چاہتا۔"

"اچھا تو آپ کے بال باندھ دوں!...... ایسے گھنے اور لمبے بالوں کی آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے!...... کیا کنگھی نہیں کرتیں؟" مہری بولی۔

"جو تمہارا دل چاہے کرو۔" کملا نے بے دلی سے کہا۔

خاصی دیر تک مہری، کملا کے بالوں سے اُلجھی رہی۔ بال سنوار کے اور چوٹی باندھ کر مہری نے اُس کے سامنے آئینہ رکھ دیا۔

اپنی مانگ دیکھتے ہوئے کملا کہہ اُٹھی۔ "مہری! کیا سیندور ہے؟"

مہری نے ہنستے ہوئے بتایا۔ "یہ لیجئے، میں پہلے ہی آپ کے لئے بازار سے لے آئی ہوں۔" اتنا کہہ کر مہری نے آنچل کھولا اور سیندور کی ڈبیا نکالی۔

کملا نے سیندور مانگ میں بھرا اور ماتھے پر لگایا۔ اس وقت کملا کا دل ایک مانوس شخص کو یاد کر کے تیزی سے دھڑک اُٹھا۔

مہری چلی گئی اور کملا اپنے خیالوں کی پرچھائیوں کا پیچھا کرنے لگی۔ یہ پرچھائیاں ایک آشنا کی تھیں جس کا دھیان اُسے آٹھوں پہر رہتا۔ اس اجنبی گھر میں کوئی اس کا مونس و غمگسار بھی تو نہیں تھا جس سے وہ کچھ کہہ سکتی۔ وہ آشنا، کملا کا شوہر تھا جسے وہ کافی عرصے سے خط نہیں لکھ سکی تھی۔ یہ خیال اُسے پہلے بھی آیا مگر انگریزی میں اُس کا پتہ کون لکھ کر دیتا؟ گاؤں میں یہ کام اُس کا چھوٹا بھائی ارون کر دیتا تھا۔ یہاں کھنج سے اپنے

شوہر کا پتہ لکھوانے میں اُسے بہت شرم محسوس ہوتی تھی، کچھ جھجک سی لگتی تھی۔ پھر شوہر کا نام وہ کھیتج کو کس طرح بتاتی؟ وہ سوچنے لگی، اب شرم سے کام نہیں چلے گا۔

کملا مضطرب ہو کر کمرے میں خط لکھنے کا سامان ڈھونڈنے لگی، مگر ناکام رہی۔ قلم دوات اور کاغذ اُسے دکھائی نہیں دیا۔ بیماری کے دوران نرس نے اُس کے کمرے سے کھیتج کی ٹیبل، کرسی، پیڈ، کتابوں کی الماری، قلم دان وغیرہ ہٹوا دیا تھا۔ اُسے خیال آیا، کھیتج بغل کے کمرے ہی میں تو رہتا ہے۔ وہیں پر وہ لکھتا پڑھتا بھی ہوگا۔ یقیناً اس کے کمرے میں مطلوبہ سامان مل جائے گا۔ اُس نے برابر والے کمرے میں گھس کر سامنے ہی کھیتج کی بڑی سی میز دیکھی۔ میز پر قلم، دوات اور رائٹنگ پیڈ بھی موجود تھا۔ کملا پیڈ میں سے ایک کاغذ نکال کر اپنے شوہر کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ خط لکھتے وقت اُس نے دیکھا، میز پر بچھے کاغذ پر اُس کے والد ہرناتھ کا پتہ بڑے بڑے الفاظ میں لکھا ہوا تھا۔

اپنے شوہر ستیش کو خط لکھنے کے بعد کملا نے سوچا کہ اسے اتنی دور بلانے کی کیا ضرورت ہے؟ اس سے تو اچھا ہے کہ میں پتا جی کو خط لکھ کر یہاں بلا لوں۔ لکھنؤ کے مقابلے میں ہمارا گاؤں کلکتے سے زیادہ دُور نہیں ہے۔ خط ملتے ہی پتا جی دو دن کے اندر مجھے لے جائیں گے۔ لکھنؤ سے چھٹی لے کر کلکتے آنا کوئی آسان نہیں۔ ستیش کو کم سے کم ایک ہفتہ لگ جائے گا۔ میں مزید اتنے دنوں تک یہاں نہیں رہ سکوں گی۔

تب وہ اپنے والد کو خط لکھنے لگی۔ وہ آدھے سے زیادہ خط لکھ چکی تھی۔ اُس نے لکھا تھا کہ کس طرح کھیتج اُسے بے ہوشی کی حالت میں اپنے گھر لایا، پھر اُس کا علاج کرایا۔ یہ سب قصہ وہ بیان کر چکی تو اُسے کھیتج کی بات یاد آئی کہ وہ اتنے دنوں سے گھر نہیں لوٹی۔ اس وجہ سے یقیناً گاؤں میں ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا ہوگا۔ سب کو اس کی گمشدگی کا پتہ چل گیا ہوگا۔ وہ سوچنے لگی، ایسی صورت میں پتا جی کو خط لکھ کر ایک وبال کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس سے تو یہی بہتر ہے، وہاں جا کے اور انہیں تمام باتیں تفصیل سے سمجھائے، یہ سب سوچتے ہوئے اُس کا قلم رُک گیا۔

کملا ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کرے، اسی وقت کسی نے چپکے چپکے آ کر ہاتھ بڑھایا اور ادھ لکھا خط اُلٹ دیا۔ وہ تقریباً اُچھل پڑی اور پلٹ کر دیکھا۔ اُسے جیسے اپنی آنکھوں پر یقین سا نہ آیا۔ سامنے ہی اُس کے بچپن کا ساتھی سریندر کھڑا تھا۔ اُس کے

ہونٹوں پر جانی پہچانی مسکراہٹ تھی۔

''سریندر تم!'' کملا آخر بول اُٹھی۔ ''تمہیں دیکھ کر میری جان میں جان آئی ہے۔ اب مجھے کوئی فکر نہیں رہی۔ تم نے سن ہی لیا ہوگا کہ میں کس مصیبت میں پھنس گئی......''

اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اُسے کھیتج نظر نہیں آ رہا تھا۔ سریندر اُس کا لکھا ہوا خط پڑھ رہا تھا۔ کملا نے اُسے پھر مخاطب کیا۔ ''کھیتج مجھ سے کہہ کر گئے تھے کہ آج تمہیں اپنے کالج سے اپنے ساتھ ضرور یہاں لے کر آئیں گے۔ پھر تمہیں آنے میں دیر کیوں ہوئی؟ میں دن بھر تمہارا راستہ دیکھتی رہی۔ مت پوچھو کہ میں نے یہ وقت کتنی مشکل سے گزارا...... اچھا یہ بتاؤ، کھیتج نے تمہیں کیسے تلاش کیا؟...... تم شاید آج کالج نہیں گئے تھے۔ دیکھو سریندر، میں گاؤں جا کر کاکی کو تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دوں گی۔''

اس پر بھی سریندر نے کملا کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اُس کے چہرے کی کیفیت بدلتی دکھائی نہ دی۔ وہ کملا کا لکھا ہوا خط پڑھتا رہا۔

کملا کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی اور سریندر کے ہاتھ سے خط چھین لیا، پھر ہنستے ہوئے بولی۔ ''پرایا خط پڑھنے کا تمہارا شوق ابھی تک ختم نہیں ہوا!''

''کیا تمہاری عقل پر پردہ پڑا رہے گا؟...... کیا یہ پرایا خط ہے؟...... یہ خط تم نے ہرناتھ کاکا کو لکھا ہے۔'' سریندر نے کہا۔

◆...... ◆

اُس دن بڑی مشکل سے سریندر کو تلاش کر کے کھیتج اُسے اپنے ساتھ گھر لایا تھا۔ وہ سریندر کو کملا کے پاس چھوڑ کر نیچے آ گیا اور چلانا شروع کر دیا۔ ''مہاراج، چائے کے لئے پانی گرم کیا؟...... اگر نہیں تو فوراً کیتلی چڑھا دو۔''

''کتنے پیالے پانی رکھوں؟'' ملازم مہاراج نے سوال کیا۔

''ارے یہی پانچ پیالے رکھ دو!...... آج ذرا ٹھنڈک ہے...... ارے راما! جا، بھیم ناگ کی دُکان سے آدھا سیر رس گلے تو لے آ!...... بڑی سڑک کے موڑ پر جو کلکتہ ہوٹل ہے، وہاں سے کچھ کیک وغیرہ بھی لیتے آنا!...... بسکٹ تو گھر ہی میں ہیں...... اچھا جلدی جا اور جو سامان بتایا ہے، لے آ!...... دیر نہ ہو۔''

اسی طرح فرمان جاری کر کے وہ ملازمہ سے پرچ، پلیٹ، چھری، چمچے وغیرہ دُھلوا کے صاف کرانے لگا۔ ملازم راما جا چکا تھا۔ بس اب اُس کے لوٹ کر آنے کی دیر تھی۔ کھنج اضطراب کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ اوپری منزل سے سریندر کے ہنسنے کی آواز آئی۔ کھنج کا دل قابو سے باہر ہونے لگا۔ اُس نے سریندر سے حسد محسوس کیا۔ ذرا سی دیر میں سریندر اور کملا گھل مل گئے تھے۔ کھنج اسی حسد کے عالم میں سوچنے لگا، میرے سامنے تو کملا اتنے دن میں ایک مرتبہ بھی نہیں ہنسی مگر اب سریندر کے ساتھ اس کے ہنسنے کی بھی زوردار آوازیں آ رہی ہیں!...... میرے سامنے تو کملا آنسو ہی بہاتی رہی لیکن سریندر کے آتے ہی اپنی ہنسی نہ روک سکی۔ کملا نے بتایا تھا کہ سریندر اس کے بچپن کا ساتھی ہے...... کہیں کملا اُسے چاہتی تو نہیں؟

راما بازار سے سودا خرید لایا۔ پلیٹوں میں کھانے کی چیزیں سجا کر اور چائے لانے کو کہہ کر کھنج اوپری منزل پر جا پہنچا۔ اُس نے سریندر کو کرسی پر بیٹھے کملا سے باتیں کرتے دیکھا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر کملا بیٹھی سریندر کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کی باتیں توجہ سے سن رہی تھی۔

کھنج کو دیکھتے ہی سریندر اُٹھ کھڑا ہوا اور نرمی سے بولا۔ ''آیئے کھنج بابو، بیٹھیے۔''

کھنج دوسری کرسی پر بیٹھ گیا، پھر پوچھنے لگا۔ ''آپ لوگوں نے کیا طے کیا ہے؟...... کیا صلاح ہوئی؟''

''کس بات کی صلاح؟'' سریندر نے دریافت کیا۔

''یہی ان کے بارے میں۔'' کھنج نے کملا کی طرف اشارہ کیا۔ ''تمام قصہ تو آپ سن ہی چکے ہیں۔ یہ بتایئے اب کیا کرنا چاہیے؟''

''میں نے تو انہیں اچھی صلاح ہی دی تھی۔'' سریندر نے بتایا۔ ''لیکن یہ مانتی کہاں ہیں۔ آج کل عورتیں خودمختار ہونا اور اپنی عقل پر چلنا چاہتی ہیں۔''

کھنج نے پُرتجسس نظروں سے کملا کی طرف دیکھا۔ کملا کہنے لگی۔ ''ایسی کوئی بات نہیں کھنج بابو! آپ ان کی باتوں میں نہ آئیں۔ دراصل انہوں نے مجھے کوئی صلاح نہیں دی۔ میں نے ان سے کئی بار سوال کیا کہ کیا قدم اٹھایا جائے؟...... انہوں نے ہر مرتبہ عجیب عجیب تجویزیں پیش کیں۔ آپ کے آنے سے چند لمحے پہلے یہ کہہ رہے تھے کہ

کملا! تم گاؤں جا کے کیا کرو گی؟ تم ولایت چلی جاؤ۔ ٹیگور کی کتابیں پڑھ کر انگریز بھی بنگلہ سیکھ گئے ہیں۔ ان کی کتابوں میں ہندو عورت کے بارے میں بڑی معلومات ہیں۔ بتایئے یہ بھی کوئی صلاح ہے؟'' کملا نے یہ کہتے ہوئے منہ بنایا۔ کھنج مسکرانے لگا۔

''میں نے کیا بری صلاح دی ہے کھنج بابو؟ اگر کملا کو ولایت جانا پسند نہیں تو ایک اور پلان میرے ذہن میں ہے۔'' سریندر نے کہا۔

اس اثنا میں کھانے پینے کا سامان اوپر آ گیا۔ کھنج بولا۔ ''آیئے سریندر بابو! چائے پی لیجیے، اس کے بعد صلاح مشورہ کیا جائے گا۔'' وہ دو پیالیوں میں چائے ڈالنے لگا۔ کملا اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

سریندر نے کھنج سے پوچھا۔ ''آپ نے کیا سوچا ہے؟...... کملا کو کہاں بھیجا جائے؟''

''اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔'' کھنج نے جواب دیا۔ ''کملا کو اس کے پتا کے پاس بھیج دیا جائے گا۔''

''یہ بات اتنی آسان نہیں۔'' سریندر نے کہا۔ ''کھنج بابو! آپ ہمارے سماج کو نہیں جانتے۔ اگر آپ اُسی وقت جب کملا کو بے ہوشی کی حالت میں اٹھا کر لائے تھے، گاؤں میں ان کے پتا کے پاس پہنچا دیتے یا انہیں اپنے گھر نہ لا کر ہسپتال میں بھرتی کرا دیتے تو کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ اب معاملہ کچھ اُلجھ گیا ہے جسے سلجھانا آسان نہیں ہے۔''

''اُس وقت تو مجھے صرف کملا کی حالت کا خیال تھا، کچھ اور سوجھا ہی نہیں۔'' کھنج نے گویا اپنی صفائی پیش کی۔

پھر کھنج کے ایما پر سریندر نے طرح طرح کی سبیلیں سوچ کر بتائیں لیکن کسی پر بھی اتفاق نہ ہو سکا۔ کوئی نہ کوئی خامی ہر تجویز میں نکلتی رہی اور وہ دونوں اسے رد کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد سریندر بولا۔ ''دیکھیے، صرف آپ اور میں صلاح کر کے کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پائیں گے۔ اس صلاح مشورے میں تیسری شخصیت کو بھی شامل کرنے کی ضرورت ہے۔''

''تیسری شخصیت کون؟'' کھنج نے سوال کیا۔

''کملا کے پتا ہرناتھ جی۔'' سریندر نے جواب دیا، پھر تفصیل بیان کرنے لگا۔ ''بہت ضروری کام ہے، اتنا ہی انہیں لکھا جائے اور کچھ نہ بتایا جائے۔ انہیں ہم یہاں بلوا لیں۔

جب وہ آ جائیں تو انہیں ساری بات سمجھا دی جائے۔ وہ باپ ہیں۔ مجھے اُمید ہے وہ اپنی بیٹی پر کسی طرح کا شک نہیں کریں گے۔ کملا کے بارے میں وہ بے راہ ہونے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے۔ رہ گئے گاؤں والے اور سماج تو ان سے بچاؤ کی کوئی سبیل بھی سوچنی پڑے گی۔ یہ صلاح ہم کملا کے پتا جی سے بھی کر سکتے ہیں۔'' سریندر نے یہ کہہ کر تصدیق طلب نظروں سے کھنج کی طرف دیکھا۔

''یہ صلاح بری نہیں ہے۔'' کھنج نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''اس کے سوا کوئی اور راستہ بھی تو نظر نہیں آ رہا، لیکن ایک بات ضرور سوچنے کی ہے۔ جہاں تک میں نے کملا کے پتا جی کے بارے میں اندازہ لگایا ہے، ان سے فراخ دلی کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔ وہ مجھے پرانے زمانے کے آدمی لگتے ہیں، انگریزی بھی پڑھے لکھے نہیں۔ وہ چانکیہ کو مانتے ہیں۔ ان کے بجائے تو کملا کے شوہر سے زیادہ توقع ہو سکتی ہے۔''

''لیکن ایک اور پہلو پر بھی غور کر کے دیکھئے کھنج بابو!'' سریندر نے مشورہ دیا۔ ''کملا کے شوہر ستیش بابو اس واقعے کو محبت کی عینک لگا کر دیکھیں گے، مگر ہرناتھ جی بہر حال ایک باپ ہیں۔ وہ اس میں شک یا برائی کا کوئی پہلو نہیں نکالیں گے۔ بیٹی کے لئے وہ بھلائی ہی سوچیں گے۔''

''یہ کہنا بھی آپ کا ٹھیک ہے۔'' کھنج نے یہ کہتے ہوئے طویل سانس لیا۔

''پھر یہ کہ ہرناتھ جی نے ایسا نہ بھی کیا اور سماج کے ڈر سے کملا کو گھر میں نہ رکھا تو ستیش بابو تو ہیں! اُنہیں خط لکھ کر بلا لیا جائے گا۔'' سریندر بولا۔

''یہی صلاح اچھی ہے۔'' کھنج نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''آپ ہرناتھ جی کو خط لکھ دیجئے۔ جب تک وہ نہیں آ جاتے، آپ کملا کی طرف سے کوئی فکر نہ کریں۔ وہ پہلے کی طرح یہیں رہے گی۔ یہاں اسے کسی طرح کی کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ کھنج بابو!'' سریندر خوش ہو گیا۔

کھنج کے دل کی مراد بر آئی۔ اُس کے دل سے یہ خدشہ جاتا رہا کہ سریندر کہیں کملا کو کسی عزیز رشتے دار کے گھر رکھنے کے لئے نہ لے جائے۔

''وقت کیا ہوا ہے؟ دیکھئے تو کھنج بابو!'' سریندر نے دریافت کیا۔

کھنج نے رسٹ واچ کی طرف دیکھا اور بتایا۔ ''پونے آٹھ ہوئے ہیں۔''

''تو اب اُٹھنا چاہئے۔'' سریندر بولا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے کھنج سے کہہ دیا کہ وہ کملا کو ان باتوں سے آگاہ کر دے۔

کھنج بھی اُس کے ساتھ ہو لیا۔ دونوں گھر سے نکل کر ٹہلتے ہوئے اُس طرف چل دیئے جہاں موٹر کھڑی تھی۔ وہ موٹر کے قریب پہنچے تو شوفر نے اُتر کر دروازہ کھول دیا۔

''چلئے سریندر بابو!'' کھنج نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ سریندر نے پہلے تکلف کیا، پھر موٹر میں بیٹھ گیا۔ کھنج نے بھی اُس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھئے خط رجسٹری سے بھیجئے گا۔ وجہ یہ کہ وہ ٹھہرا گاؤں، وہاں کے ڈاکیے اپنے وقت کی بچت کے لئے ایک کا خط دوسرے کو تھما جاتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو، اس معاملے کو راز ہی میں رکھا جائے۔'' یہ سن کر سریندر نے اقرار میں سر ہلایا تو کھنج نے مزید کہا۔ ''اور ہاں، لفافے پر اپنا نام پتہ ہرگز نہ لکھئے گا۔ عین ممکن ہے راستے میں ڈاکیے کے پاس آپ کا خط دیکھ کر کوئی لے لے۔ جن کی بیٹی گم ہو گئی ہے اُن کے نام زمیندار کے بیٹے نے کلکتے سے ایک رجسٹری بھیجی ہے، یہ سن کر افواہیں پھیلانے والے جانے کیا کیا باتیں بنانے لگیں۔ گاؤں والوں کے ذہنوں اور تنگ نظری سے تو آپ بھی اچھی طرح واقف ہوں گے۔''

کچھ دیر سفر جاری رہا اور پھر موٹر سریندر کے گھر کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے گاڑی سے اُتر کر کھنج کا شکریہ ادا کیا۔

گاڑی گلی کا موڑ کاٹ کر بازار کی سڑک پر پہنچی تو کھنج سوچنے لگا، ایک غلطی ہو گئی۔ میں سریندر سے یہ نہیں کہہ سکا کہ کل پرسوں یا درمیان میں کبھی کبھی آ کر کملا کی خیر و عافیت معلوم کرتے رہنا۔ خیر کوئی حرج نہیں، وہ فرصت پاتے ہی خود آئے گا۔

مین روڈ پر پہنچ کر کھنج دل ہی دل میں حساب لگانے لگا، کملا اور کتنے دن میرے یہاں رہ سکتی ہے؟ کل سریندر اُس کے باپ کو خط لکھے گا...... ایک دن! دوسرے دن خط ہرناتھ کو مل جائے گا اور پھر تیسرے دن وہ کملا کو لینے کلکتے آ جائے گا۔ گاؤں کا ڈاک خانہ ہے، دو ایک دن دیر بھی ہو سکتی ہے...... پھر بھی کلکتے پہنچنے میں ہرناتھ کو زیادہ دن نہیں لگیں گے۔ پھر کملا چلی جائے گی۔ اس خیال ہی سے کھنج کا دل بیٹھنے لگا۔ کیا میں اس کے بعد کملا کو دوبارہ کبھی نہ دیکھ سکوں گا؟

واپس اپنے گھر پہنچ کر کھنج نے سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے دیکھا کہ اُس کے کمرے

میں کملا میز پر جھکی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ وہ اوپر پہنچ کر برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔ کملا پڑھنے میں اس قدر محو تھی کہ کھتج کی آہٹ بھی اُس نے نہیں سنی۔ سامنے بجلی کا ٹیبل لیمپ جل رہا تھا۔ اس کی روشنی ہرے رنگ کے شیڈ سے چھن کر کملا کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس روشنی میں کملا کا پُرسکون چہرہ نہایت دلکش دکھائی دے رہا تھا۔

کھتج ایک بے خودی کے عالم میں کملا کو دیکھتا رہا، پھر دھیمی آواز میں بڑبڑایا۔

''بس...... دو چار دن اور یہ حسین چہرہ دیکھ لوں۔''

کمرے میں کھتج کے قدم پڑتے ہی کملا چونک اُٹھی۔ کتاب بند کر کے کھتج کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے پوچھا۔ ''آ گئے؟...... سریندر بابو کہاں ہیں؟''

سریندر کے بارے میں پوچھنے پر کھتج کا دل دُکھا تو ضرور مگر اُس نے خود پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔ ''وہ چلے گئے۔ انہیں کہیں دعوت میں جانا تھا۔''

کھتج قریب ہی رکھی کرسی پر بیٹھ گیا تو کملا نے پوچھ ہی لیا۔ ''آپ لوگوں نے کیا صلاح کی؟...... کچھ طے ہوا؟''

''ہاں۔'' کھتج بولا۔ پھر اُس نے جو بھی صلاح مشورہ ہوا تھا، مختصراً بیان کر دیا۔

''معلوم ہوتا ہے یہی ٹھیک ہے۔'' کملا نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ''پتا جی آ گئے تو پھر کوئی فکر نہیں رہے گی۔''

''وہ ناراض تو نہیں ہوں گے؟'' کھتج نے سوال کیا۔

''نہیں...... ناراض ہونے کی بجائے وہ آپ لوگوں کو آشیرواد دیں گے۔ اگر آپ نہ ملتے تو ان کی لڑکی اس شہر میں کہاں رہتی، کیسے جیتی!'' کملا بولی۔

کچھ دیر پہلے کھتج کے دل کو جو دُکھ پہنچا تھا، کملا کی بات سن کر اس میں کمی آئی۔

''خط پتا جی کے ہاتھ میں صحیح سلامت پہنچ جانا چاہئے، بس کام بن جائے گا۔'' کملا نے خوش اُمیدی کا اظہار کیا۔

''کل اتوار ہے، ہم دونوں میں سے کسی کو یہ خیال ہی نہیں آیا۔'' کھتج نے چونک کر کہا، پھر سوچا کہ چلو اچھا ہوا، ایک دن اور مل گیا! یہی الفاظ غیر ارادی طور پر اُس کی زبان پر بھی آ گئے۔ احساس ہوا تو اُس نے خجالت سے سر جھکا لیا۔

کملا حیرت سے کھتج کی طرف دیکھنے لگی۔ اُس نے پوچھا۔ ''ایک دن اور کیسے مل

گیا؟''

کھتج نے جھینپ کر جواب دیا۔ ''ایک دن...... صلاح مشورے کے لئے ایک دن اور مل گیا۔''

''اچھا۔'' کملا کے چہرے سے حیرت کا تاثر ختم ہو گیا۔ اب اُس کے چہرے سے ممنونیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ کھتج نے ایک اجنبی ہونے کے باوجود اُس کی مدد کی تھی، اُسے احساس تھا۔

''ارے نو بجنے والے ہیں۔'' کھتج نے چونک کر کہا۔ ''آپ نے اب تک کھانا نہیں کھایا۔ کھانا تیار ہونے میں کتنی دیر ہے، دیکھتا ہوں جا کر۔''

تین دن گزر گئے تو کھتج، سریندر کے گھر پہنچ گیا۔

''ہرناتھ جی کی کوئی خیر خبر ہے...... وہ آئے؟'' کھتج نے معلوم کیا۔

''نہیں، اب تک تو وہ نہیں آئے۔'' سریندر نے بتایا۔

''خط تو ٹھیک پتے پر ارسال کیا تھا؟'' کھتج نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' سریندر نے جواب دیا۔ ''پتہ لکھنے میں غلطی نہیں ہو سکتی۔ ہوا یہ کہ جس روز رجسٹری بھیجنے کے بارے میں طے ہوا تھا، اتوار تھا اسی لئے پیر کو رجسٹری بھیجنی پڑی۔ پھر بھی یہاں سے ہمارے گاؤں خط دوسرے ہی دن پہنچ جاتا ہے۔ اب تک کاکا ہرناتھ جی کو خط مل جانا چاہئے۔''

''وہاں سے گاڑی کس وقت آتی ہے؟...... کیا ابھی تک اس کے آنے کا وقت نہیں ہوا؟'' کھتج نے دریافت کیا۔

''دس بجے کے قریب ہمارے گاؤں میں ڈاک تقسیم ہو جاتی ہے۔'' سریندر بتانے لگا۔ ''خط ملتے ہی اگر وہ آنا چاہتے تو آج ضرور پہنچ جاتے۔''

''نہیں تو کل آ جائیں گے۔'' کھتج بولا۔

''یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ گاؤں میں نہ ہوں کسی کے بلاوے پر مذہبی رسوم ادا کرنے گاؤں سے باہر گئے ہوں۔'' سریندر نے خیال ظاہر کیا۔ ''ایسی صورت میں جب وہ گاؤں لوٹ کر آئیں گے تبھی انہیں خط ملے گا۔ اگر ایسا ہوا تو دو ایک دن مزید لگ سکتے ہیں۔ یہ بتائیں کہ کملا کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

"اچھی ہے ان کی طبیعت۔" کھنج نے جواب دیا۔ "آپ تو اُس دن کے بعد انہیں دیکھنے ہی نہیں آئے۔"

"فرصت نہیں ملتی کھنج بابو! کل یا پرسوں تیسرے پہر کے بعد آؤں گا۔ آپ اس وقت گھر پر ہی رہیں گے نا؟" سریندر نے معلوم کیا۔

"رہوں گا کیوں نہیں۔ آیئے گا ضرور!...... اچھا اب میں چلتا ہوں، نمسکار۔"

دو دن بعد سریندر، کھنج کے گھر آیا۔ کملا کے باپ ہرناتھ کی طرف سے ابھی تک کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ دن پر دن گزرتے گئے اور مزید ایک ہفتہ ہو گیا۔

کملا کی غیر موجودگی میں سریندر اور کھنج اس کے متعلق بات چیت کرتے اور طرح طرح کی قیاس آرائیوں میں مصروف رہتے مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ پاتے۔ خط رجسٹرڈ بھیجا گیا تھا اس لئے انہیں خط پہنچنے کا پورا یقین تھا۔ خاصے سوچ بچار کے بعد انہوں نے ایک اور خط رجسٹری کے ذریعے بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے کتنے ہی دن ہو گئے مگر ہرناتھ کی طرف سے کوئی جواب ملا نہ وہ خود کلکتے آیا۔

اب کیا قدم اٹھایا جائے؟ اس مسئلے پر سریندر اور کھنج کے درمیان تبادلہ خیال ہوتا تھا مگر کچھ بھی طے نہ ہو پاتا تھا۔ کملا کو کھنج کے گھر میں رہتے ہوئے یہ دوسرا مہینہ تھا جو ختم ہونے والا تھا۔ اب کملا نے رونا دھونا بھی شروع کر دیا تھا۔ کھنج اُسے دلاسے دیتا۔ سریندر بھی کبھی کبھی آ کر اُس کا حوصلہ بندھا جاتا۔

کملا کہتی۔ "معلوم ہوتا ہے پتا جی زندہ نہیں ہیں۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو لازمی طور پر مجھے لینے یہاں آتے۔ کچھ اور نہیں تو خط کا جواب ضرور آتا۔"

پہلا خط ارسال کئے ایک عرصہ ہو چکا تھا کہ بعد دوپہر ایک روز سریندر، کھنج کے گھر آیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔

"اسے دیکھو!" سریندر نے وہ لفافہ کھنج کی طرف بڑھا دیا۔ اب وہ ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف ہو چکے تھے۔ کھنج نے دیکھا، وہ لفافہ ڈیڈ لیٹر آفس سے آیا تھا۔ اس کے اندر سریندر کا پہلا خط رکھا تھا۔ لفافے کی پشت پر گاؤں کے ڈاکیے نے لکھ دیا تھا۔ "خط وصول کرنے والے یہاں نہیں ہیں، کلکتے گئے ہیں اس لئے خط

واپس کیا جاتا ہے۔"

اُس روز سریندر شام تک کھنج کے گھر رہا۔ کملا کے ساتھ اس کا مشورہ یہی ہوا کہ اب اسے اپنے شوہر کے پاس پٹنہ لے جانا ہی مناسب ہے۔

"تو پھر یہی کیجئے۔" کھنج کو کہنا پڑا۔ "آپ انہیں وہیں لے جایئے۔ ان کے شوہر کو ساری باتیں تفصیل سے بتا دیجئے گا۔"

"میرے اکیلے جانے سے تو بات نہیں بنے گی، تمہیں بھی ساتھ چلنا پڑے گا۔" سریندر نے زور دے کر کہا۔ "تمہیں جن حالات میں اور جہاں کملا ملی تھی، جس طرح تم نے مجبوراً اُسے اپنے گھر میں رکھا، یہ سبھی باتیں تم خود ستیش بابو کو بتاؤ تو بہتر ہے۔ یہ معاملہ نازک ہے اس لئے بغیر گواہی و ثبوت کے کام نہیں چلے گا۔"

کھنج مان گیا لیکن بولا۔ "اس وقت کالج کا ناغہ کر کے نقصان ہو گا۔ ساری پڑھائی چوپٹ ہو جائے گی۔ ویسے بھی میری حاضریاں بہت کم ہیں۔ اب اگر میں کالج نہ گیا تو حاضریاں پوری نہ ہونے کے سبب مجھے امتحان میں نہیں بیٹھنے دیا جائے گا۔ آئندہ ہفتے ہفتہ، اتوار اور پیر کے روز کی چھٹیاں ہیں۔ میں ان چھٹیوں میں تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

پھر یہی طے ہوا۔ انہوں نے اسی کے ساتھ یہ فیصلہ بھی کیا کہ ان کی آمد کے بارے میں ستیش کو پیشگی اطلاع دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

سفر والے دن تیسرے پہر ملازمہ مہری، کملا کے بال سنوار رہی تھی کہ اچانک ہی کملا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو؟" مہری نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جا تو رہی ہوں مگر...... نصیب میں کیا لکھا ہے، نہیں جانتی۔" کملا نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"کیوں دل چھوٹا کرتی ہو! قسمت میں سب کچھ اچھا لکھا ہے۔ تم لکشمی ہو، تمہارا بھلا ہی ہو گا۔" مہری بولی۔

سفر سے متعلق تمام تفصیلات پہلے سے طے کر لی گئی تھیں۔ شام کے وقت کملا کے ساتھ کھنج کو سریندر کے گھر پہنچنا تھا۔ اس کے بعد ان تینوں کو اسٹیشن جانا تھا۔ پروگرام

کے مطابق کھنج اور کملا کھا پی کر جلدی سے فارغ ہونے کے بعد گھر سے نکلنے ہی والے تھے کہ اچانک کلکتے ہی میں رہنے والے ایک دوست کی معرفت بہت ضروری خط ملا۔ لکھا تھا، بہت ضروری کام ہے، پانچ منٹ کے لئے ملتے جاؤ۔

کھنج تذبذب میں پڑ گیا۔ گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ اگر وہ اپنے دوست سے ملا تو ٹرین کا وقت نکل جائے گا۔ کھنج کو ایک ترکیب سوجھی۔ اُس نے اپنے ملازم سے کہا۔ ''مین روڈ پر جا کر ایک ٹیکسی لے آؤ۔''

چند منٹ بعد نوکر نے آ کر خبر دی۔ ''ٹیکسی دروازے پر کھڑی ہے۔''

کھنج، کملا کے ساتھ نیچے اترا۔ اس کی اپنی موٹر بھی تیار کھڑی تھی۔ کملا کو اپنی موٹر میں بٹھا کر کھنج نے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ ''انہیں سریندر بابو کے گھر لے جاؤ۔ تم نے ان کا گھر دیکھا ہی ہے۔ سریندر بابو کو بھی گاڑی میں بٹھا کر فوراً ہاوڑا اسٹیشن پہنچو۔ میں ایک ضروری کام ختم کر کے ہاوڑا اسٹیشن آتا ہوں۔ سریندر بابو سے کہہ دینا کہ میں ٹھیک وقت پر پہنچ جاؤں گا۔

پھر موٹر اور ٹیکسی کچھ دُور تک ساتھ چل کر اپنے اپنے راستے پر ہو لیں۔

اپنے دوست سے مل کر کھنج، ہاوڑا ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا تو ٹرین کی روانگی میں صرف پندرہ منٹ باقی تھے۔

''گاڑی تیز چلاؤ...... پوری رفتار سے۔'' کھنج نے ٹیکسی ڈرائیور سے تیز آواز میں کہا۔

ٹیکسی ابھی ہاوڑا برج کے قریب پہنچی تھی کہ ایک گھوڑا گاڑی سے ٹکرا گئی۔ گھوڑا گاڑی کے گھوڑے دھکے سے منہ کے بل گرے۔ ٹیکسی ڈرائیور اور گھوڑا گاڑی کے کوچوان بھی ایک دوسرے کو حادثے کا ذمے دار ٹھہرانے لگے۔ برا بھلا کہنے کی وجہ سے تماش بینوں کی بھیڑ ہو گئی۔ پولیس نے آ کر جھگڑا روکا اور ٹیکسی کے ساتھ گھوڑا گاڑی کے نمبر بھی نوٹ کر لئے۔ گھوڑا گاڑی کی دو سواریوں میں سے جو شخص شال اوڑھے ہوئے تھا، سپاہی نے اُس کا نام پتہ پوچھا۔ شاید مقدمے میں گواہی دینے کے لئے۔

''میرا نام یوگیندر ہے۔ میں ضلع بردوان کے ایک گاؤں کالی گرام کا رہنے والا ہوں۔''

کالی گرام...... ضلع بردوان! کھنج سمجھ گیا کہ یہ شخص کملا کے گاؤں سے تعلق رکھتا ہے۔

اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ سریندر کے باپ کا نام یوگیندر ہے۔

کھنج یہ بھی نہ جان سکا کہ یوگیندر ہی کالی گرام گاؤں کا زمیندار ہے اور اُس کے ساتھ جو دوسرا آدمی ہے، وہ کملا کا باپ ہرناتھ ہے۔ وہ دونوں آج ہی ایک ٹرین سے کلکتے پہنچے تھے اور سریندر جہاں سکونت پذیر تھا، وہاں جا رہے تھے۔

اسی دوران میں کچھ لوگوں نے گھوڑوں کو اٹھا کے کھڑا کر دیا۔ ٹیکسی اسٹیشن کی طرف چل دی۔ ٹرین کی روانگی میں صرف تین منٹ باقی تھے جب کھنج نے پلیٹ فارم پر قدم رکھا۔ سریندر ٹرین کے ایک ڈبے سے سر نکالے اُس کا انتظار کرتے ہوئے پلیٹ فارم پر نظریں دوڑا رہا تھا۔ ٹرین کا یہ مخصوص ڈبہ تھا۔

بمبئی میل میں فرسٹ اور سیکنڈ کلاس پر مشتمل ایک ڈبہ ایسا ہوتا ہے جسے مغل سرائے پر الگ کر کے لکھنؤ جانے والی گاڑی کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔ اس ڈبے کے مسافروں کو اُتر کر گاڑی بدلنی نہیں پڑتی۔ کھنج اور سریندر نے اسی لئے بمبئی میل کا انتخاب کیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں کھنج اس مخصوص ڈبے تک پہنچ گیا تو سریندر نے اُس سے کہا۔ ''آ گئے تم!...... میں تو سمجھا تھا کہ شاید اب تم نہیں آ سکو گے۔''

''بڑے جھنجٹ میں پڑ گیا تھا۔'' کھنج بتانے لگا۔ ''راستے میں میری ٹیکسی ایک گھوڑا گاڑی سے ٹکرا گئی تھی۔''

''کیسے؟'' سریندر نے پُرتشویش آواز میں دریافت کیا۔ ''چوٹ تو نہیں لگی؟''

''نہیں۔'' یہ کہہ کر کھنج ٹرین پر سوار ہو گیا۔ اندر ڈبے میں سیٹ پر بیٹھ جانے کے بعد اُس نے سب حال سنا دیا، پھر بولا۔ ''اور دلچسپ بات یہ ہوئی کہ اس گھوڑا گاڑی میں جو آدمی سوار تھے، وہ کملا جی کے گاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک نے پولیس والے کے پوچھنے پر بتایا کہ وہ کالی گرام ضلع بردوان کے رہنے والے ہیں۔ اس عجیب اتفاق پر مجھے حیرت بھی ہوئی۔''

''وہ کالی گرام کے تھے؟'' کملا چونک کر بولی۔ ''کون تھے وہ کھنج بابو؟''

''نام بتایا تو تھا...... بھلا سا نام تھا...... بھولا جا رہا ہے۔ شاید ہتیندر نام بتایا تھا۔ ہاں ہاں، یہی نام تھا۔'' کھنج نے جواب دیا۔

"بھتیندر نام کا تو ہمارے گاؤں میں کوئی نہیں۔" کملا نے کہا۔

سریندر نے بھی ذہن پر زور دیا مگر اُسے اس نام کا کوئی شخص یاد نہ آیا۔ اسی اثناء میں بمبئی میل اسٹیشن چھوڑ چکی تھی۔

ادھر تو بمبئی میل ہاوڑا اسٹیشن سے روانہ ہوئی اُدھر یوگیندر، کملا کے باپ ہرناتھ کو ساتھ لئے گھوڑا گاڑی میں بیٹھا اپنے بیٹے سریندر کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ زمیندار یوگیندر کی پیشانی پر حسب معمول بل پڑے ہوئے تھے۔

سفر تمام ہوا تو یوگیندر نے گاڑی بان کو کرایہ دے کر رخصت کر دیا۔

وہ کئی منزلہ ایک مکان تھا۔ اسی کے مکینوں سے زمیندار یوگیندر نے معلوم کیا کہ اس کا بیٹا سریندر مکان کے کس حصے میں رہتا ہے۔

"تیسری منزل پر جنوب مشرقی حصے میں سریندر بابو رہتے ہیں۔" ایک شخص نے بتایا۔

وہ دونوں زینوں کے ذریعے تیسری منزل کے مطلوبہ حصے میں پہنچ گئے۔ مکان کا وہ حصہ دو کمروں پر مشتمل تھا۔

دستک دینے پر دروازہ کھلا۔ دروازہ کھولنے والا سریندر کا ملازم خودی رام تھا۔ وہ بھی کالی گرام ہی کا تھا۔ اُس نے خلاف توقع زمیندار یوگیندر کو اپنے سامنے کھڑے دیکھا تو گھبرا گیا اور پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر جھکتے ہوئے پرنام کیا۔

"سب ٹھیک ہے نا خودی رام؟" زمیندار نے اپنے مخصوص سخت لہجے میں خیریت دریافت کی۔

"جی مالک!......آپ کی کرپا (مہربانی) ہے۔" خودی رام نے جواب دیا۔

"سریندر کہاں ہے؟" زمیندار یوگیندر نے سوال کیا۔

"وہ پچھم کی طرف گھومنے گئے ہیں مالک!...... سوموار کو لوٹ آنے کا کہہ گئے ہیں۔" خودی رام نے بتایا۔

"اکیلا ہی گیا ہے یا کوئی اور بھی اُس کے ساتھ ہے؟" یوگیندر نے خودی رام کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

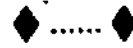
"جی...... وہ اُن کے ساتھ صرف......" خودی رام کچھ کہتے کہتے رُک گیا، پھر اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگا۔ حال ہی میں کالی گرام کا ایک گوالا کلکتے آیا تھا، خودی رام نے اُسی کی

زبان سے سریندر اور کملا کے بارے میں ایک افواہ سنی تھی۔

"ٹھیک ٹھیک سب کچھ بتا دے حرام زادے!" زمیندار یوگیندر چیخ اُٹھا۔ "اگر کچھ چھپایا تو تیرے سر پر اتنے جوتے ماروں گا کہ ایک بال بھی باقی نہیں بچے گا۔"

خودی رام ہاتھ جوڑ کر کانپتے ہوئے بولا۔ "سب...... سب کچھ بتا...... بتاتا ہوں مالک!"

"جلدی سے بتا۔" زمیندار یوگیندر نے خودی رام کو مزید دھمکایا۔



اپنی لرزتی کانپتی آواز میں خودی رام بتانے لگا۔ ''مالک!...... ان کے جانے سے پہلے ایک موٹر گاڑی دروازے پر آ کر رکی تھی۔ گاڑی کی آواز سن کر چھوٹے مالک نے مجھ سے چلنے کو کہا تھا۔ میں اُن کا بیگ، چھاتا، چھڑی وغیرہ لے کر ساتھ گیا۔ چھوٹے مالک نے نیچے کھڑی موٹر گاڑی کے قریب جا کر دھیمی آواز میں کہا۔ ''کملا تم اکیلی آئی ہو؟'' میں جواب نہ سن سکا۔ پھر بھی میں نے گاڑی کے اندر دیکھا۔ انہی، ہرناتھ جی کی بیٹی کملا، موٹر گاڑی کی پچھلی طرف بیٹھی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ چھوٹے مالک سے بھی اس بارے میں کچھ پوچھنے کا وقت نہیں ملا۔ وہ جیسے ہی گاڑی میں بیٹھے تو گاڑی چل دی۔

ہرناتھ کے چہرے پر جیسے تاریکی پھیل گئی۔ وہ ایک آہ بھر کے قریب ہی پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اچھا یہ بتاؤ......'' زمیندار یوگیندر نے کسی قدر نرم لہجے میں پوچھا۔ ''تم نے اور بھی کسی دن کملا کو کلکتے میں دیکھا؟''

خودی رام نے مؤدب آواز میں جواب دیا۔ ''جی نہیں مالک! اور کسی دن نہیں دیکھا، یہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

''کس گاڑی سے گئے ہیں وہ؟...... کیا بتایا تھا تم نے؟''

''بمبئی میل سے مالک!'' خودی رام نے بتایا۔

ایک لمبی ''ہوں'' کے بعد زمیندار یوگیندر بھی ایک اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیگ سے ریلوے ٹائم ٹیبل نکال کر اُس نے ورق گردانی کی، پھر بولا۔ ''بمبئی میل ہاوڑا ریلوے اسٹیشن سے نو بج کر پینتیس منٹ پر چلتی ہے۔ اسے گئے تو اب خاصا وقت ہو چکا ہے۔''



بمبئی میل تیز رفتاری سے سفر طے کرتی ہوئی اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسی

کے ایک ڈبے میں کملا، کھنج اور سریندر بیٹھے تھے۔ کملا اپنے شوہر کے پاس جا رہی تھی، وہی شوہر جو اُسے ایک دن کے لئے بھی جدا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اُس سے اتنے دن تک جدا رہنے کے بعد واپس جا رہی تھی۔ اس پر کملا خوش تھی، مگر ذہن میں مختلف اندیشے بھی تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اتنے دن گھر سے باہر رہی ہے۔ یہ خبر اُس کے شوہر ستیش کو مل گئی ہوگی۔ کیا وہ اس کی بات پر یقین کر کے اسے اپنا لے گا؟ کملا کی گود سُونی رہنے کی وجہ سے اُس کی ساس یوں بھی ستیش کی دوسری شادی کرنے کو تیار تھی۔ صرف بیٹے کی رضامندی نہ ہونے پر وہ اپنا یہ ارادہ پورا نہیں کر پا رہی تھی۔ ممکن ہے، اس کی گمشدگی سے فائدہ اٹھا کر اب تک وہ ستیش کی دوسری شادی کر چکی ہو! کیا اسے اب اپنی جگہ کوئی دوسری عورت نظر آئے گی؟ صرف گھر پر ہی نہیں، شوہر کے دل پر بھی اس دوسری عورت نے قبضہ کر لیا ہوگا۔ اب اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی؟

کملا کے ذہن پر سوالوں نے یورش کر دی۔ پھر اُس نے سوچا، اتنے دنوں تک ستیش نے اس کو تلاش کیا ہوگا۔ اپنے بارے میں اُس نے ستیش کو کوئی خبر نہیں دی۔ پتا جی کو بھی مطلع نہیں کیا۔ اگر اسے بے دخل کر دیا گیا تو کون ذمے دار ہوگا؟ اس کی ساس، شوہر یا وہ خود۔ وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ اگر ستیش نے اُسے نہ اپنایا تو وہ کہاں جائے گی؟ اسے کون سہارا دے گا؟ وہ اپنے ماں باپ کے پاس کس منہ سے جائے گی۔ کیا وہ اس کی باتوں پر اعتبار کر لیں گے؟ کملا کی ذہنی رو کھنج کی طرف مڑ گئی۔

کھنج نے اُسے بے سہارا اور مصیبت میں پڑی ہوئی دیکھ کر آسرا دیا تھا۔ اس کے گھر وہ کس حق اور کس حیثیت سے رہے گی؟ اُس نے ہر عورت کی طرح کھنج کی آنکھوں میں اپنے لئے محبت کی تحریر پڑھ لی تھی، مگر وہ ایک شادی شدہ عورت کی پرورش کیوں کرے گا؟ کملا کا یہ سہارا بھی اُس کے لئے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ دل میں یہ خیال آتے ہی کملا نے منہ پھیر کر دیکھا۔ دوسری سیٹ کے کونے پر کھنج خاموش بیٹھا ہوا تھا، مگر اُس کی نگاہوں کا مرکز کملا ہی تھی۔ کملا نے ادھر سے نظر ہٹا لی۔ پھر اس نے سریندر کو دیکھا اور سوچا، سریندر تو بڑے باپ کا بیٹا ہے، کیا وہ اسے سہارا نہ دے سکے گا؟ ایسی عورت کو جسے اس کے شوہر نے ٹھکرا دیا ہو، سریندر ہی کیا کوئی بھی اسے اپنے ساتھ نہیں رکھے گا۔

گاڑی آندھی طوفان کی طرح دوڑی جا رہی تھی۔ کھنج سوچ رہا تھا، جس تیزی سے

گاڑی آگے بڑھ رہی ہے، کملا بھی اسی تیزی کے ساتھ اپنے شوہر کے قریب ہو رہی ہے اور اس سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ جب تک کملا اس کی نظروں کے سامنے ہے، غنیمت ہے۔ کاش یہ چہرہ ہمیشہ سامنے رہ سکے!...... شاید اب میں کملا کو پھر کبھی نہ دیکھ پاؤں گا۔ شوہر سے مل کر یقیناً وہ ان برے دنوں کی یاد کو اپنے ذہن سے جھٹک دے گی۔

کملا اور کھیتج کی طرح سریندر بھی سوچ میں گم تھا۔ اُس کے والد اُسی کی تلاش میں کلکتے آئے ہوں گے۔ اس طرح کالج سے ناغہ کر دینے اور کلکتے سے باہر چلے جانے پر وہ غصہ کریں گے...... مگر جب میں لکھنؤ سے واپسی پر کملا کی مصیبت کا حال اُن سے بیان کروں گا تو ان کا غصہ دور ہو جائے گا۔ پھر اسے خیال آیا، میں کملا کے ساتھ ایک ہی موٹر میں بیٹھ کر آیا ہوں اور خودی رام نے بھی یہ دیکھا ہے۔ پتا جی اگر سنیں گے کہ میں کملا کو کلکتے سے کہیں اور لے گیا ہوں تو کیا سوچیں گے؟ سریندر کے ذہن میں خدشات اُبھرنے لگے۔ کملا کے ساتھ اس طرح جانے پر میرے بارے میں بدظنی بھی تو پیدا ہو سکتی ہے۔ کسی کو کچھ نہ بتا کر اس طرح میرا چلا آنا اچھا نہیں ہوا۔ کملا کو مصیبت سے نکالتے ہوئے خود میں مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔

ان باتوں کو سوچتے ہوئے سریندر کو کملا پر غصہ آنے لگا۔ وہ تینوں ہی اپنی اپنی سوچ میں کھوئے ہوئے تھے۔ معاً سریندر اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''اچھا کھیتج بابو، تمہاری ٹیکسی سے جن لوگوں کی گھوڑا گاڑی ٹکرائی تھی، ان میں سے کسی کا نام تم نے جتیندر بتایا تھا، یہ نام یوگیندر تو نہیں تھا؟''

کملا اور کھیتج دونوں ہی سریندر کے سوال پر چونک اُٹھے اور گھوم کر بیٹھ گئے۔

''شاید یہی نام بتایا ہو۔'' کھیتج نے جواب دیا۔ ''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ اس وقت اسٹیشن آنے کی جلدی تھی۔ نام بھی ایک ہی بار سنا تھا۔''

''چہرہ مہرہ اور ڈیل ڈول کیسا تھا؟ کچھ بتا سکتے ہو؟'' سریندر نے دریافت کیا۔

''ہاں یاد ہے۔ چہرہ چوڑا اور رُعب دار تھا۔ رنگ گورا تھا۔ ناک نوکیلی اور اُونچی تھی۔ مونچھ کے بال کھچڑی تھے۔ آنکھوں سے پتہ چلتا تھا سخت غصے میں ہیں۔''

کھیتج نے جو تفصیل بیان کی اسے سن کر سریندر کا چہرہ فق ہو گیا۔ فوری طور پر وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

''تب تو وہ کاکا ہی تھے۔'' کملا بول اُٹھی۔ ''سریندر کے پتا جی...... اُن کا نام کیا تھا کھیتج بابو، اُن کے ساتھ جو تھے؟ کچھ اُن کے متعلق بتائیں۔''

''انہیں میں تو نہیں پہچانتا اور نہ ہی نام سنا ہے۔ ہاں ان کا بھی حلیہ ہی بیان کر سکتا ہوں، شاید تم جان لو۔ وہ پستہ قد اور گول مٹول تھے۔ بدن کا رنگ چمک دار سیاہ تھا۔ داڑھی مونچھ منڈی ہوئی اور سر پر موٹی چوٹی تھی، ناک کے اوپر ایک نشان تھا۔'' کھیتج نے بتایا۔

''وہ تو میرے پتا جی تھے۔'' کملا بول اُٹھی۔ ''انہوں نے شاید پوسٹ ماسٹر سے سنا ہوگا کہ سریندر کی رجسٹری آ کر لوٹ گئی ہے۔ وہ اسی لئے یوگیندر کاکا کو ساتھ لے کر سریندر کے ٹھکانے پر میری خبر لینے آئے ہوں گے۔'' سریندر کچھ نہ کہہ سکا۔ کھیتج بھی خاموش رہا۔ کملا ہی چند لمحوں کے بعد دوبارہ بولی۔ ''اگلے اسٹیشن سے ہم کلکتے واپس کیوں نہ چلیں؟''

کملا کی تجویز سن کر سریندر نے کھیتج کی طرف دیکھا۔ کھیتج بولا۔ ''اگلا اسٹیشن تو بردوان ہے۔ آج رات کلکتے لوٹنے کے لئے کوئی گاڑی نہیں۔ کل سویرے کی گاڑی سے ہم جب تک کلکتہ پہنچیں گے، اسی وقت ہم لکھنؤ پہنچ سکتے ہیں۔ جس کی چیز اسی کو واپس کر کے ہم پیر کو ہی کلکتے لوٹ آئیں گے۔ تب تک تمہارے اور کملا کے پتا جی دونوں ہی کلکتے میں رہیں گے۔ ظاہر ہے، وہ فوری طور پر گاؤں واپس نہیں جائیں گے۔''

''جس کی چیز ہے......'' کے الفاظ ادا کرتے ہوئے کھیتج کے لہجے میں جو تضاد تھا، کملا نے اچھی طرح محسوس کر لیا۔ کھیتج کی زبانی اس انداز میں اپنے شوہر کا تذکرہ سن کر وہ شرما گئی اور دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ کھیتج نے دیکھا، کملا کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح سرخ ہو گیا ہے۔ اس پر ہرے رنگ کی روشنی پڑنے سے وہ اور بھی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا، کملا یقیناً اس کی چاہت سے بے خبر نہیں ہو گی، مگر اس سے کیا حاصل! وہ تو اپنے شوہر کے پاس جا رہی ہے!



کملا کا شوہر لکھنؤ میں ملازمت کرتا تھا۔ کھیتج، سریندر اور کملا لکھنؤ ریلوے اسٹیشن پر اُتر کر کرائے کی ایک گاڑی سے مطلوبہ پتے کی طرف روانہ ہو گئے۔ کملا کو یہ پتہ زبانی یاد

تھا۔ مطلوبہ پتے پر پہنچ کر انہیں گھر کے دروازے پر تالا لگا ہوا ملا۔ پڑوسیوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ستیش اپنی اماں کے ساتھ گاؤں چلا گیا ہے۔

''اب کیا، کیا جائے؟'' کھنج نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے سریندر اور کملا سے پوچھا۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو وہ خود ہی بولا۔ ''اب تو کلکتے ہی لوٹنا پڑے گا۔''

''اس کے سوا اور چارہ بھی کیا ہے!'' سریندر نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

گھوڑا گاڑی نے کھنج کے کہنے پر واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ کملا چہرے سے انتہائی فکرمند نظر آ رہی تھی۔ اُسے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ کہیں اس کا شوہر دوسری شادی کرنے تو گاؤں نہیں گیا؟ سریندر بھی تشویش میں مبتلا تھا۔ اگر کملا کا شوہر مل جاتا تو کوئی مسئلہ نہ تھا، لیکن اب کملا کے ساتھ دوبارہ کلکتے لوٹتے ہوئے اُسے خوف آ رہا تھا۔ وہاں اُس کے اور کملا کے والد کیا سوچ رہے ہوں گے! سریندر سے اگر وہ پوچھیں گے کہ اُس نے ہرناتھ کو اطلاع کیوں نہ دی؟ یا کملا کے والد کا گھر کلکتے سے قدرے قریب ہونے کے باوجود وہاں نہ جا کر لکھنؤ جانے کی کیا ضرورت تھی؟ ان سوالوں کا کوئی جواب نہ سوجھنے پر سریندر کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

ٹرین کے ذریعے کلکتے کی طرف لوٹتے ہوئے کملا اور سریندر دونوں ہی کے چہرے اُترے ہوئے تھے۔ صرف کھنج کی حالت ان دونوں سے برعکس تھی۔ وہ اندر ہی اندر بہت خوش تھا جیسے اُس کے دل کی مراد بر آئی ہو۔ لکھنؤ جاتے وقت اُس کے چہرے پر جو اُداسی تھی، اب اس کا نام ونشان نہیں تھا۔

وہ تینوں تیسرے پہر کلکتہ پہنچے۔ کھنج نے اسٹیشن سے نکل کر ایک ٹیکسی روکی، کملا کو اس میں بٹھایا، پھر سریندر سے کہا۔ ''آؤ بیٹھو!''

''میں اس وقت تم لوگوں کے ساتھ نہیں جا سکوں گا۔'' سریندر خشک لہجے میں بولا۔ ''پتا جی اور ہرناتھ کاکا کہاں ہیں، یہ پتہ لگانے کے بعد شام کو تم لوگوں سے آ کر ملوں گا۔''

''جہاں تک ممکن ہو، جلد آ کر ملنا!'' کملا نے تاکید کی۔

''اچھا۔'' سریندر نے جواب دیا۔

کھنج ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ چند لمحے بعد ہی ٹیکسی تیزی سے دوڑنے لگی۔ اس عرصے

میں سریندر دوسری ٹیکسی میں اپنا بستر اور ہینڈ بیگ رکھ کر روانہ ہو گیا۔

سریندر نے عمارت کے مشترکہ باورچی خانے میں پہنچ کر اپنے ملازم کو پکارنا شروع کر دیا۔ ''خودی رام!...... خودی رام!''

باورچی خانے کی ملازمہ نے بتایا۔ ''خودی رام تو یہاں نہیں ہے بابو جی!''

سریندر غصے میں آ کر کہنے لگا۔ ''کہاں گیا یہ نواب زادہ؟ کہیں سیر سپاٹے کو تو نہیں چلا گیا؟''

''آپ کے گاؤں سے بڑے بابو جی آئے تھے۔ وہ خودی رام کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔'' ملازمہ نے بتایا۔

سریندر کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کی رفتار تیز ہو گئی۔ بڑی مشکل سے وہ سنبھل پایا۔ نیچے جا کر اُس نے ٹیکسی سے خود ہی سامان اتارا۔ ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر اُس نے رخصت کیا، پھر سامان اٹھا کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اوپر پہنچ کر جب اُس نے اپنے اقامتی کمرے میں قدم رکھا تو حیران رہ گیا۔ وہاں اُس نے ایک اور اجنبی شخص کو دیکھا۔ اُس کا ساز وسامان وہاں نہیں تھا۔ اجنبی شخص لنگی باندھے اس طرح چلم سے دُھواں چھوڑ رہا تھا جیسے چھوٹی لائن کا انجن دُھواں چھوڑ رہا ہو۔

سریندر ابھی حیران پریشان سا اپنی جگہ ہاتھ کا سامان رکھ کر کھڑا تھا کہ اتنے میں میس کا پرانا کارندہ گورنگ اُس کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اُس نے قریب آ کر سریندر کو مخاطب کیا۔ ''ارے سریندر بابو، آپ کب لوٹے؟''

''کیا معاملہ ہے گورنگ......؟ میرے کمروں پر کسی دوسرے نے کیسے قبضہ کر لیا اور...... میرا سامان بھی یہاں نہیں؟'' سریندر نے پوچھا۔

''آپ کو کچھ نہیں معلوم......؟ جس دن آپ یہاں سے گئے تھے اُسی دن آپ کے پتا کسی شخص کے ساتھ آئے تھے۔ آپ کے پتا نے سب کرائے داروں کو بلا کر کہا، سریندر اب یہاں نہیں رہے گا۔ میں اس کا سامان لے جا رہا ہوں۔ اگر مکان کا کرایہ اور میس کے واجبات ہوئے تو میں ادا کر دوں گا۔ پھر آپ کے پتا جی نے سارے واجبات ادا کر دیئے۔ بلڈنگ کے مالک کو دوسرا کرائے دار مل گیا ہے۔ یہ بلاس بابو کے سالے ہیں۔''

یہ سب کچھ سن کر سریندر نے خود کو سنبھالا اور پُرسکون لہجے میں بولا۔ ''اچھا تو یہ بات ہے...... ! سنو تم میرا سامان اپنی کوٹھری میں رکھ لو، میں پھر کسی وقت آ کر لے جاؤں گا۔''

گورنگ نے پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہیں آپ؟''

سریندر نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ ''پتا جی کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ آیا وہ کلکتے ہی میں ہیں کہ گاؤں چلے گئے؟ یہ پتہ لگانا ہے۔''

''رات کا کھانا تو یہیں کھائیں گے نا؟'' گورنگ نے دریافت کیا۔ ''مہاراج سے آپ کے لئے بھی کھانے کو کہہ دوں؟''

''نہیں۔'' سریندر نے بلند آواز میں کہا۔ وہ زینے تک پہنچ گیا تھا۔ ''میرے لئے کھانا پکوانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

سریندر کو اس وقت تنہائی میں بیٹھ کر تمام حالات کا جائزہ لینے کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بلڈنگ سے نیچے اُتر آیا تھا۔ پیدل چلتے چلتے ولنگٹن اسکوائر پہنچ گیا۔ وہیں واقع ایک باغ میں داخل ہو کر وہ ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔

وہ سوچنے لگا، مجھے کچھ بتائے بغیر پتا جی نے یہاں سے میرا ساز و سامان کیوں اٹھا لیا؟ اس سے آخر ان کا مقصد کیا ہے؟ کافی سوچ بچار کے باوجود سریندر کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ صرف ایک دُھندلا سا خیال اُس کے ذہن میں ضرور آیا کہ اس واقعے کا تعلق کملا سے ہو سکتا ہے، مگر کملا کے کھو جانے یا اپنے والدین سے بچھڑ جانے میں اس کی کیا خطا ہے؟ اس سوال کا جواب بھی وہ لاکھ سوچنے پر تلاش نہ کر پایا۔ پھر اُس نے سوچا، شاید پتا جی مجھ سے ناراض ہیں کہ کسی کو بھی کچھ نہ بتا کر میں لکھنؤ چلا گیا۔ خیر جو ہو گیا سو ہو گیا...... اب کیا کرنا چاہئے؟ جو کچھ ہو چکا، اس کے بارے میں سوچنا لاحاصل ہے۔ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ میں پتا جی سے مل کر انہیں ساری بات بتا دوں اور مجھ پر جو الزامات لگائے جائیں ان کی صفائی پیش کر دوں۔ میں نے کوئی غلط کام تو نہیں کیا۔ سریندر اپنے دل کو تسلی دینے لگا۔ اپنے گاؤں کی کسی لڑکی کی مدد کرنا کوئی جرم تو نہیں! خاص طور پر ایسی صورت میں کہ جب وہ لڑکی پردیس میں بے سہارا اور پریشان ہو...... شاید میں احساسِ کمتری کا شکار ہوں۔ پھر اُس کی ذہنی رو ایک اور طرف بھٹک گئی۔ پتا جی نے میری توہین کی ہے۔ سریندر کے ذہن میں نیا خیال آیا۔ کچھ سوچے سمجھے

اور جانے بغیر پتا جی مجھے سزا دینے پر تیار ہو گئے۔ سریندر نے جیب سے بٹوا نکالا اور اس کا جائزہ لیا۔ بٹوے میں اکیاون روپے ساڑھے تیرہ آنے تھے۔ اُس کے ہاتھ میں ہیرے کی ایک قیمتی انگوٹھی اور گلے میں سونے کی ایک زنجیر تھی۔ یقیناً چند روز تک وہ بے فکری کے ساتھ اپنا خرچ برداشت کر سکتا تھا۔

''میں آخر کیوں پتا جی کے آگے سر جھکاؤں جب کہ میں نے کوئی قصور نہیں کیا۔'' سریندر بڑبڑایا۔

اُس نے کافی دیر سوچ بچار کے بعد اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اسٹیٹس مین اور دو بنگالی اخباروں کے دفتروں میں جا کر وہ نوکری کے لئے درخواستیں دے آیا۔ اُس نے طے کر لیا تھا کہ کسی پر بوجھ نہیں بنے گا۔

درخواستیں دے کر سریندر نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اس فکر سے نجات حاصل ہونے کے بعد وہ کھنج کو اپنے والد کے بارے میں خبر دینے چل دیا۔ وہ اس سے لاعلم تھا کہ اُس کا باپ واپس گاؤں پہنچ گیا ہے۔ گاؤں میں اُس کے ساتھ کلکتے آنے والا ہرناتھ بھی اب کلکتے میں نہیں تھا۔ کالی گرام کا بدصورت اور یک چشم ششی مکرجی اپنے بڑے بڑے میلے دانت نکالے مسرت بھرے لہجے میں ہرناتھ کے سامنے کھڑا کہہ رہا تھا۔

''جناب عالی! آج رات آپ میرے گھر پر کھانا کھایئے گا۔ میں نے ایک منت مانی تھی اسی لئے کالی ماتا کے آگے دو بکروں کی قربانی دی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ گاؤں کے سبھی دوست جمع ہو کر ماتا کا پرشاد لیں۔''



اسٹیٹس مین کے دفتر سے نکل کر سریندر، دھرم تلے سے گزرتا ہوا کھنج کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ معاً اُسے خیال آیا کہ نوکری کے لئے درخواستیں دے کر اس نے غلطی کی ہے۔ چلتے چلتے اُس کے قدم غیر ارادی طور پر رُک گئے۔ اُس نے سوچا، جا کر درخواستیں واپس لے لے، پھر خیال آیا کہ درخواستیں دینے سے کیا ہوتا ہے، نوکری کرنا یا نہ کرنا تو اس کے اختیار میں ہے۔ یہ سوچنے کی بھی ایک بڑی وجہ تھی۔ کالج میں ایک تنظیم تھی۔ اس تنظیم کا مقصد نوکری کے رجحان کو ختم کرنا تھا۔ سریندر اس تنظیم کا ایک اہم رُکن تھا۔ نوکری کا رجحان دراصل ہماری تباہی کا موجب بنا ہے، اس موضوع پر اکثر وہ

طالب علموں سے بحث مباحثہ کیا کرتا تھا۔ سریندر نے اس سلسلے میں تنظیم کے ایک حلف نامے پر بھی دستخط کئے تھے کہ وہ کسی اشد ضرورت کے باوجود بھی نوکری نہیں کرے گا۔ حلف نامے پر صرف اُسی نے دستخط نہیں کئے تھے بلکہ دوسرے طلباء سے بھی دستخط کرائے تھے۔ تقریباً ایک ہزار طلباء نے اس حلف نامے پر دستخط کئے تھے۔ مختصر عرصے میں سریندر نے تنظیم کے لئے خاصا کام کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تنظیم کے سبھی ارکان دل سے اُس کی عزت کرتے تھے۔ سریندر کو بھی اس پر فخر تھا۔

ذہنی تناؤ اور جلد بازی میں دی جانے والی نوکری کی درخواست پر سریندر کو پچھتاوے کا احساس ہونے لگا۔

"اب کیا کرنا چاہئے؟" سوچتے سوچتے وہ بڑبڑانے لگا۔

حلف نامے کے دو تین فارم اب بھی اُس کی جیب میں پڑے تھے۔ اُسے محسوس ہوا کہ یہ فارم ایک بھاری پتھر کی طرح اُس کے سینے پر رکھے ہوئے ہیں۔ غصے کے مارے اُس نے ان فارموں کو پُرزے پُرزے کر کے پھینک دیا۔ یہ پُرزے اِدھر اُدھر ہوا میں اُڑنے لگے۔ سریندر کی سماعت میں ان طالب علموں کے الفاظ گونجنے لگے جو اُس کی مخالفت کرتے اور کہتے تھے کہ دستخط کرنا تو آسان ہے مگر عمل کرنا مشکل ہے۔

میں اگر ملازمت نہیں کروں گا تو پھر کیا کروں گا؟ سریندر نے سوچا۔ اکیاون روپے ساڑھے تیرہ آنے میں تو زندگی بسر نہیں ہو سکے گی! کس طرح کیا ہوگا، یہ پھر دیکھا جائے گا۔ یہی سوچتے ہوئے اُس نے ہر فکر کو ذہن سے جھٹک دیا۔

شیام بازار میں ٹرام کے ایک اسٹاپ پر سریندر رُکا۔ ٹرام آئی تو اُس نے ڈنڈا پکڑ کر سوار ہونا چاہا۔ ٹرام میں بہت بھیڑ تھی اور پاؤں رکھنے تک کی جگہ نہیں تھی۔ وہ اسی لئے ٹرام میں نہیں چڑھا اور پیدل ہی چلنے لگا۔ سریندر چند قدم ہی فٹ پاتھ پر چلا ہوگا کہ کوئی ٹرام سے کود کر اُس کی طرف جھپٹا۔

"بھاگتے کہاں ہو؟" پیچھے سے سریندر کے کوٹ کا کالر پکڑ کر کوئی زور سے بولا۔

سریندر اس طرح روکے جانے پر اُچھل پڑا۔ اُس کے قدم رُک گئے۔ کوٹ کا کالر اس مضبوطی سے پکڑا گیا تھا کہ وہ فوری طور پر مُڑ کر دیکھ ہی نہ سکا کہ اُسے پکڑنے والا کون ہے! اُس نے خیال کیا کہ ضرور کوئی غنڈا ہے۔ راہ چلتے لوگوں کو کسی بھی بہانے

لوٹ لینے کے بارے میں اُس نے بہت کچھ سنا تھا۔ اس کے علاوہ اخبارات میں بھی اس طرح کی خبریں چھپتی رہتی تھیں۔ سریندر نے سوچا، میرے ساتھ بھی ایسی ہی یہ واردات ہو رہی ہے۔ اس وقت سریندر ایسی کیفیت میں نہیں تھا کہ کسی سے اُلجھتا۔ کسی کو مدد کے لئے پکارنا بھی اُس نے باعث توہین سمجھا۔

اُس نے اپنی جیب سے بٹوا نکال کر سڑک پر پھینکتے ہوئے کہا۔ "اس کے سوا میرے پاس کچھ نہیں۔" اسی کے ساتھ اُس نے بٹوے میں موجود رقم کے متعلق بتا دیا۔

جس اجنبی نے سریندر کا کالر پکڑ رکھا تھا، بٹوا اُٹھا کر اُسے واپس کر دیا۔

سریندر حواس باختہ سا ہو گیا۔ اُس نے کملا کے بھائی کو اپنے سامنے کھڑے دیکھا جو غصے کی زیادتی کے سبب کانپ رہا تھا۔ سریندر نے جسے غنڈا سمجھا، وہ کملا کا بھائی ارون ہی تھا۔ اُسے دیکھ کر سریندر بہت خوش ہوا۔ اسی کے ساتھ اُسے یہ حیرت تھی کہ ارون نے کوٹ کا کالر کیوں پکڑ لیا تھا۔

"ارے ارون! تم یہاں؟...... اپنے آنے کی مجھے خبر کیوں نہیں کی؟...... آؤ چلو!" سریندر نرم لہجے میں ارون سے مخاطب ہوا۔

دراصل ارون کو غلط فہمی ہوئی تھی کہ سریندر اُسے دیکھ کر ٹرام میں نہیں چڑھا۔ سریندر کے رویئے نے اُس کی غلط فہمی دُور کر دی۔

"دیدی کہاں ہے؟" ارون نے سریندر کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔ "کچھ جانتے ہو سریندر دادا! (بھائی)"

"وہیں تو تمہیں لے جا رہا ہوں۔" سریندر نے بتایا۔

ارون کے دل میں ایک بار پھر سریندر کے خلاف جذبات پیدا ہونے لگے۔ اُس نے سوچا، تب تو افواہ جھوٹی نہیں۔ گاؤں میں لوگ جو کچھ کہتے ہیں، سچ ہے۔

"ارے تم رُک کیوں گئے چلتے چلتے؟" سریندر حیرت سے بولا۔

"تو تم نے واقعی ہمیں تباہ و برباد کیا ہے!" ارون رندھے ہوئے گلے سے گردن جھکا کر کہنے لگا۔

"تباہ و برباد؟...... کیا مطلب؟...... میں سمجھا نہیں۔"

"یہ تباہی نہیں تو اور کیا ہے؟" ارون چیخ اُٹھا۔ "ایک شادی شدہ لڑکی......" وہ کوشش

کے باوجود مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

سریندر مزید حیران ہوا، پھر کہا۔ ''شادی شدہ لڑکی سے میں نے کیا، کیا ہے؟''

''اُلٹا مجھ سے پوچھ رہے ہو کہ تم نے کیا، کیا ہے؟'' ارون بدستور غصے میں بولا۔

اب سریندر کچھ کچھ سمجھنے لگا کہ ارون کی ان باتوں کے پیچھے کون سا جوالا مکھی پنہاں ہے! اُس نے اسی لئے اپنے لہجے کی نرمی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''صاف صاف کہو ارون، تم آخر کیا کہنا چاہتے ہو؟ ابھی تک تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آسکیں۔''

ارون نے نگاہ اُٹھائی۔ سریندر کا چہرہ اُسے پہلے ہی کی طرح بے داغ و معصوم دکھائی دیا۔ اُس کے چہرے پر فریب و ریاکاری کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ وہ تذبذب میں مبتلا ہوگیا۔ سریندر کو وہ دادا (بھائی) کہتا تھا۔ اُس نے سوچا، کیا کوئی بھائی سے جھوٹ بول سکتا ہے؟

''خاموش کیوں ہوگئے!'' سریندر سنجیدگی سے بولا۔ ''کہو نا، تم کیا کہہ رہے تھے؟''

''تم...... تم نے میری...... میری دیدی (باجی) کو چھپا رکھا ہے۔'' ارون نے آخر ہمت کر کے دل کی بات کہہ ہی دی۔

''تمہاری دیدی کو میں نے چھپا رکھا ہے؟'' سریندر نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''کیوں چھپا کے رکھوں گا؟''

ارون سمجھا، سریندر بات کو دانستہ اُلجھا رہا ہے۔ اُس نے اسی لئے بحث کی۔ ''تو پھر دیدی کہاں ہے؟''

''تمہاری دیدی، کھنج بابو کے گھر ہیں۔'' سریندر نے بتایا۔

ارون نے تعجب سے پوچھا۔ ''کھنج بابو کون ہیں؟''

''انہوں نے تمہاری دیدی کی جان بچائی ہے۔'' سریندر نے جواب دیا، پھر وہ ارون کے اظہارِ حیرت پر تفصیل بیان کرنے لگا۔ ''تمہاری دیدی بھیڑ میں پھنس کر بے ہوش ہوگئی تھی۔ وہ بے سدھ ایک سڑک کے کنارے پڑی تھی۔ کھنج بابو اُسے وہاں سے اٹھا کر اپنے گھر لے گئے اور علاج کرا کے اس کی جان بچائی۔''

''اب تو دیدی اچھی ہے؟'' ارون نے دریافت کیا۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' سریندر نے اقرار میں سر ہلایا۔

ارون کی آنکھوں کے سامنے سے جیسے دُھند کا بھاری پردہ ہٹ گیا۔ اُس کے دل میں سریندر کی طرف سے کسی قسم کا شک وشبہ نہیں رہا۔ اسی بنا پر اُس نے مزید کوئی سوال کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس کے باوجود وہ جلد از جلد اپنی بہن کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔

''سریندر دادا!'' ساتھ چلتے ہوئے ارون نے مخاطب کیا۔ ''یہ ششی مکرجی تو بڑا ہی پاجی آدمی ہے۔''

''کیوں...... ؟ اُس نے کیا، کیا؟'' سریندر نے یوں ہی بے توجہی سے پوچھ لیا۔

''اُس نے تمہیں اور دیدی کو گاؤں بھر میں بدنام کر دیا ہے۔'' ارون نے کہا۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ کہیں دل کی گہرائی میں کملا کی محبت موجود تھی، مگر سریندر نے اسے تھپکیاں دے کر سلا دیا تھا۔ یوں بھی اب کملا پرائی ہو چکی تھی۔ اپنی محبت کا اظہار اُس نے کملا تک سے نہیں کیا تھا، پھر کسی اور کو اُس کے دل کی بات کیسے پتہ چل گئی! سریندر کے دل کو اسی لئے دھچکا سا لگا۔

''کس طرح ششی مکرجی نے ہم دونوں کو بدنام کیا ہے؟'' سریندر نے ارون سے وضاحت چاہی۔

ارون نے جواب دیا۔ ''اُس نے گاؤں بھر میں یہ بات اُڑائی ہے کہ تم نے دیدی کو اغوا کیا ہے۔ تم دونوں نے پہلے ہی یہ طے کر رکھا تھا۔''

یہ سن کر سریندر کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی، لیکن اُس نے کچھ ہی دیر میں خود پر قابو پالیا۔ وہ سوچنے لگا، کملا اتنے دن سے غائب ہے چنانچہ اس پر گاؤں میں باتیں تو بنی ہوں گی۔ یہ اندیشہ تو سریندر کو پہلے سے تھا کہ گاؤں والے کملا کی گمشدگی پر خاموش نہیں رہیں گے۔ پھر بھی اُس نے یہ بات نہیں سوچی تھی، اُسے یہ الزام دیا جائے گا کہ اس نے ہی سازش کر کے اسے بھگا دیا ہے۔ کملا کہیں تھی اور وہ کہیں تھا۔ خاصے دنوں بعد تو کملا سے اُس کی ملاقات ہوئی تھی۔ گاؤں والوں نے کس طرح اس پر الزام لگا دیا، وہ حیران تھا۔ عرصہ دراز سے تو وہ گاؤں بھی نہیں گیا تھا۔ پھر کملا کے ساتھ مل کر اُس نے یہ سازش کب اور کیسے بنا لی!

''اچھا ارون، کیا گاؤں والوں نے ششی مکرجی کی باتوں پر یقین کر لیا؟'' سریندر

نے سوال کیا۔

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔'' ارون بولا۔

''کس نے یقین کیا؟'' سریندر نے معلوم کیا۔

''سبھی نے۔'' ارون نے جواب دیا۔ ''تمہارے اور میرے گھر والوں نے بھی اس پر یقین کرلیا کہ دیدی کو تم ہی نے بھگایا ہے۔ مجھے اس بات پر یقین نہیں تھا سریندر دادا کہ تم ایسا کر سکتے ہو، مگر جب سکول کے لڑکے مجھے چھیڑنے لگے تو میں بھی مجبور ہو گیا۔ اگر میں یقین نہ کرتا تو کیا کرتا دادا؟''

سریندر نے کچھ نہیں کہا، اُس کے دل کو چیر کر ایک گہری آہ ''ہوں'' کی صورت میں منہ سے نکل گئی۔ اس پر اُسے رنج ہوا کہ ماں باپ تک نے اسے ذلیل اور بدمعاش سمجھ لیا۔ ارون سے اُس نے پوچھا۔ ''کملا کے بارے میں لوگ کیا کہتے ہیں؟''

''کسی اور کی بات تو چھوڑو دادا، پتا جی یہ کہتے ہیں کہ اگر کملا مر جاتی تو اتنا دُکھ نہ ہوتا۔''

تو کملا کا بھی میری طرح کوئی نہیں رہا۔ سریندر نے بڑے دُکھ سے سوچا۔ ''کملا کا کیا ہوگا؟''

''ہونا کیا ہے۔'' ارون نے بلا جھجک کہا۔ ''جب حقیقت سامنے آئے گی تو الزام لگانے والوں کے سر جھک جائیں گے۔''

''کیا اب تمہارے ماں باپ، کملا کو اپنے گھر میں نہیں رکھیں گے؟...... تمہارا کیا خیال ہے؟'' سریندر نے پوچھا۔

''کیوں نہیں رکھیں گے!'' ارون نے جواب دیا۔

''تمہیں ستیش بابو کے بارے میں بھی کچھ پتہ ہے؟'' سریندر نے کہا۔

''پتہ ہے۔'' ارون دھیمی آواز میں بولا۔

''انہیں کملا کے بارے میں معلوم ہے؟''

''ہاں...... اور لگتا ہے کہ...... کہ انہوں نے بھی لوگوں کی باتوں پر یقین کر لیا ہے۔ مجھے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کی دوسری شادی کے بارے میں بھی سنا ہے۔''

باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں کھتج کے گھر پہنچ گئے۔

''اتنی دیر کر دی سریندر بابو!'' کھتج کے لہجے میں شکایت تھی۔ ''کملا کو تمہارا بہت انتظار تھا۔'' یہ کہتے ہوئے کھتج کی سوالیہ نظریں ارون کی طرف اُٹھیں۔

''یہ ہمارا ارون ہے۔'' سریندر نے بتایا۔

کملا واقعی بڑی بے چینی سے سریندر کی منتظر تھی۔ لکھنؤ جانے کے باوجود وہ اپنے شوہر سے نہیں مل سکی، کملا کو اس کا بہت دُکھ تھا۔ اتنے دن گزر جانے کے باوجود کملا ابھی تک مایوس نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی اُس کا ذہن پریشان تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں جا کھڑی ہوتی تھی۔

اتنی دیر میں سریندر کی آواز سن کر کملا ہڑبڑا کر نیچے اُتر آئی۔ اسی اثناء میں اُس نے ارون کا نام سن لیا۔

کملا کو اچانک نشست گاہ میں داخل ہوتے دیکھ کر کھتج چونک اُٹھا۔ اُسے کملا کا اس طرح وہاں آنا ٹھیک نہیں لگا۔

''دیدی!'' کملا پر نظر پڑتے ہی ارون گویا چیخ اُٹھا۔

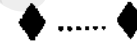
''ارون!...... تو آ گیا؟'' کملا کی آواز جیسے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔

سریندر خاموشی سے بہن بھائی کا یہ ملاپ دیکھ رہا تھا۔ کملا نے پہلے ماں باپ کی خیریت دریافت کی، پھر ارون کا ہاتھ پکڑ کر اُسے لے گئی۔ جاتے ہوئے ارون کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ گھر، کمرہ، کھتج اور سریندر سب شناسا ہیں۔ اس جگہ کا ماحول اُسے پاکیزہ لگا۔ لوگوں کی گندی باتیں اُسے جھوٹ معلوم ہوئیں۔ اس ماحول میں اپنی بہن کو دیکھ کر دل کے تمام خدشات دُور ہو گئے۔

گھر میں ایک نیا مہمان آیا تھا۔ رات بھی ہو گئی تھی۔ آج کملا کے لئے خوشی کا دن تھا۔ کھتج کو ان باتوں کا احساس تھا وہ اسی لئے کھانے کا اہتمام کرنے کی خاطر فوراً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے بار بار یہی خیال آیا تھا کہ کملا اب اس کے گھر سے چلی جائے گی۔ گھر کی رونقیں اب ختم ہو جائیں گی۔ در و دیوار سونے سونے لگیں گے۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو کہانیوں کے جنوں کی طرح کملا کو کسی نامعلوم پہاڑ کی چوٹیوں پر لے جاتا۔

سریندر خاموشی کے ساتھ نشست گاہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چوٹ کھائے ہوئے دل میں غصے کے جذبات کروٹیں لے رہے تھے۔ اُسے محض اپنے ماں باپ پر ہی غصہ

نہیں تھا بلکہ پوری دنیا اسے اپنی دشمن معلوم ہو رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں کملا سے اپنی محبت کو جھوٹ قرار دے رہا تھا۔ میں کسی کو نہیں چاہتا...... پھر میں...... میں نے تو اسے بھلا بھی دیا تھا تو کیوں وہ دوبارہ میرے راستے میں آ گئی؟ وہ سوچ رہا تھا۔ جسے میں نے بچپن سے چاہا تھا وہی کملا اب میرے پاس لوٹ آئی ہے۔ عورت کے صرف دو ہی آسرے ہوتے ہیں، ماں باپ یا شوہر!...... ان میں سے کوئی بھی کملا کو اپنانے پر آمادہ نہیں تھا، مگر میں بھی تو ہوں!...... کملا میری ہے۔ سریندر ایک ایسا خواب دیکھنے لگا جس کی تعبیر سے وہ بے خبر تھا۔ اُسے آج پہلی بار کملا سے اپنی شدید محبت کا احساس ہوا تھا۔



ارون سے ملاقات کے بعد کملا کو محسوس ہونے لگا جیسے اب اُس کے سارے دُکھ دُور ہو جائیں گے۔ ارون نے اپنے بہنوئی کے بارے میں جو دوسری شادی کی افواہ سنی تھی، اس کا تذکرہ کملا سے نہیں کیا۔ کملا نے ارون کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ زیادہ ذکر اس میں کھنج کا تھا۔ وہ اب کھلے دل سے کھنج کی تعریف کر رہی تھی۔ ارون بھی کھنج سے عقیدت سی محسوس کرنے لگا۔ کملا نے کہا۔ ''اتنے دنوں سے پرائے گھر میں ہوں، مگر ایک دن بھی مجھے احساس نہیں ہوا کہ یہ کسی غیر کا گھر ہے۔''

''کھنج بابو واقعی بہت اچھے آدمی ہیں۔'' ارون نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''اچھے ہی نہیں۔'' کملا بولی۔ ''اچھے آدمی تو بہت مل جائیں گے لیکن اس طرح کے اپنے، یعنی غیر ہو کر بھی سگے سے بڑھ کے کام آنے والے کتنے مل سکتے ہیں!''

''یہ تو ہے۔'' ارون نے تائید کی۔ ''دیکھو نا، اپنا سب کام کاج چھوڑ کر انہوں نے تمہارے لئے کیا نہیں کیا! تمہیں لے کر ستیش بابو کے پاس تک دوڑے گئے، لیکن دیدی!...... سریندر دادا نے بھی کوئی کمی نہیں کی۔''

''ارے سریندر کو تو یہ سب کچھ کرنا ہی چاہئے!...... وہ ہمارے گاؤں کا ہے۔ ایک طرح سے اپنا ہی ہوا۔ اگر وہ بھی پردیس میں مدد نہ کرتا تو کون کرتا!''

''سریندر دادا کو تو خیر میں پہلے سے جانتا ہوں لیکن جب سے کھنج دادا کو دیکھا ہے، وہ بھی اپنے سے معلوم ہونے لگے ہیں۔''

''تم نے یہ ٹھیک کہا۔ کھنج بابو کو تم دادا (بھائی) ہی کہنا۔'' کملا نے اپنے بھائی کو

تاکید کی۔

ارون کو تاکید کرنے کے بعد ہی کملا کو خیال آیا کہ اور کتنے دن یہاں رہنا ہے! پھر کھنج کہاں ہوگا، ہم کہاں ہوں گے؟...... کھنج اپنے کام دھندے میں پھنس کر سب کچھ بھول جائے گا...... لیکن میں...... میں شاید اسے نہیں بھول سکوں گی۔ لکھنؤ پہنچ کر جہاں سنتے ہیں، بنگالی نہیں وہاں مجھے یقیناً کھنج کی بہت یاد آئے گی۔ اسے دیکھنے کو دل بہت چاہے گا۔ لیکن دیکھ نہیں سکوں گی۔ رہ رہ کر اس کی یاد آتی رہے گی۔ یہ سوچتے ہوئے کملا نے غیر ارادی طور پر ٹھنڈا سانس بھرا اور پھر اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جانے کی تیاری ہو چکی تھی۔ کھنج، ارون کو کھانا کھلانے کے لئے بلانے اوپر آیا۔ اُس نے کملا کی آنکھوں میں آنسو تیرتے دیکھے۔ اُسے خبر نہیں تھی کہ کملا جب سے اُس کے گھر میں آئی تھی، روئی بھی تھی یا نہیں! کملا کی آنکھوں میں اُس نے بہرحال آنسو نہیں دیکھے تھے۔

''آؤ کھنج بابو!'' کملا نے منہ پھیر کر آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

پھر جب سریندر اور ارون کھانا کھانے بیٹھے تو کملا نے کھنج سے بھی ساتھ بیٹھنے کو کہا۔ اس پر کھنج بولا۔ ''پہلے ان لوگوں کو کھانا کھا لینے دو، یہ مہمان ہیں۔''

''مہمان یا میزبان یہاں کوئی نہیں، سبھی اپنے لوگ ہیں، گھر کے آدمی ہیں۔ تم بھی بیٹھو!'' کملا کہنے لگی۔

''میرے لئے تم اتنی فکرمند کیوں ہو!...... میں تو بے گھر بار کا آدمی ہوں، جہاں جو مل جاتا ہے، وہی کھا لیتا ہوں۔'' کھنج نے کہا۔

''آج یہ نہیں ہوگا۔ آج میں تمہیں اپنے ہاتھ سے پروس کر کھلاؤں گی۔''

کملا کے اصرار پر کھنج حیرت سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا، پھر بولا۔

''آج یہ تم پر کیا دھن سوار ہو گئی؟''

''اب تو میں پھر کبھی تمہیں اپنے ہاتھ سے کھانا نکال کر نہیں کھلا سکوں گی۔'' کملا نے مغموم لہجے میں کہا۔ ''کل تو میں یہاں سے چلی ہی جاؤں گی۔''

سریندر اب تک خاموش تھا، وہ بول اُٹھا۔ ''کہاں جاؤ گی؟''

''کالی گرام جاؤں گی۔'' کملا نے جواب دیا۔

''کس کے ساتھ؟'' سریندر نے سوال کیا۔

''ارون کے ساتھ۔'' کملا نے بتایا، اسی کے ساتھ بولی۔ ''تم بھی ساتھ چلو نا سریندر!''

''نہیں۔'' سریندر نے انکار کر دیا۔ ''اس کے علاوہ میرے نزدیک یہ بھی مناسب نہیں کہ تم ارون کے ساتھ کالی گرام جاؤ۔''

سریندر سے یہ سن کر کملا کے دل کو دھچکا سا لگا۔ اُسے سریندر سے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اس کے گاؤں جانے پر کوئی اعتراض کرے گا۔ سریندر ایسا کیوں کر رہا ہے، کملا کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے اسی لئے حیران ہو کر پوچھا۔ ''منع کیوں کر رہے ہو سریندر؟''

کملا نے جب کئی بار استفسار کیا تو بھی سریندر نے یہی کہا۔ ''کہا نا میں نے کہ تمہارا گاؤں جانا ٹھیک نہیں۔''

ارون اور کملا دونوں ہی حیرت سے سریندر کا منہ تکنے لگے۔ انہیں محسوس ہوا جیسے سریندر ایک ایسے مقام پر آ کھڑا ہوا ہے جہاں سے جو حکم دے گا، دونوں کو ماننا پڑے گا۔ کملا کا جی چاہا کہ وہ سریندر کی اس ہدایت کو نہ مانے، مگر اس میں اتنی جرأت پیدا نہ ہو سکی۔ سریندر کے چہرے پر ایک ایسی کیفیت نظر آ رہی تھی جو کسی اندرونی جوش کو روکنے سے پیدا ہوتی ہے۔ کملا کو یہ بھی معلوم تھا کہ سریندر اگر کسی بات پر اڑ جاتا تو کسی طرح اُسے اس کی ضد سے باز رکھنا ممکن نہ ہوتا۔

''آج تمہیں کیا ہو گیا ہے سریندر؟...... تم ناراض سے کیوں ہو؟'' کملا کچھ توقف سے پھر بولی۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' سریندر نے بے پروائی سے کہا۔

کھنج نے بھی یہ بات محسوس کر لی کہ سریندر آج کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ کملا اس بار کھنج سے مخاطب ہوئی۔ ''تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو کھنج بابو، مجھے ارون کے ساتھ گاؤں جانا چاہئے یا نہیں؟''

''جب سریندر بابو تمہیں گاؤں جانے سے منع کر رہے ہیں تو پھر تمہارا یہاں سے نہ جانا ہی بہتر ہے۔'' کھنج نے جواب دیا۔

کملا کو محسوس ہو رہا تھا کہ سریندر اُسے گاؤں نہ جانے کی اجازت دے کر ٹھیک نہیں کر رہا۔ جتنے دن اس کے یہاں گزریں گے، اتنا ہی اس کے لئے برا ہو گا۔ اُس نے

کھنج کی طرف ملتجی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''لیکن یہ تو کچھ بتاتے نہیں کہ کیوں منع کر رہے ہیں!''

''وجہ کیا بتاؤں!'' سریندر بول اُٹھا۔ ''بس میں نے کہہ دیا، تم کالی گرام نہیں جاؤ گی۔''

کملا کو یہ سن کر غصہ آ گیا۔ اُس نے کہا۔ ''میں ضرور جاؤں گی...... تم مجھے روکنے والے کون ہو؟''

جواب میں سریندر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ کھنج نے اُسے یہ موقع نہیں دیا۔ وہ بولا۔ ''نہیں کملا! سریندر بابو کے ساتھ تمہیں اس طرح بات نہیں کرنی چاہئے۔ سریندر بابو کا کہنا بالکل درست ہے۔ تمہارے گھر سے جب تک تمہیں کوئی لینے نہ آئے تب تک تمہارا جانا ٹھیک نہیں ہو گا۔''

کھنج کے لہجے میں اس قدر اپنا پن تھا کہ کملا کچھ نہ کہہ سکی۔ اُس کا دل نرم پڑ گیا۔ اُس نے سوچا، کھنج جو کہہ رہا ہے اسے وہی کرنا چاہئے۔ اپنی کسمپرسی کی حالت دیکھ کر اُس کا دل بھر آیا اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''تو پھر کیا میں یہیں پڑی رہوں گی؟'' کملا بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

کملا کی اس درد بھری آواز سے سریندر کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اُس نے کہا۔ ''یہاں کیوں رہو گی کملا؟...... میں تمہیں اپنے ساتھ یہاں سے لے جاؤں گا۔ جہاں میں رہوں گا، وہاں تم بھی رہنا!'' یہ کہتے ہوئے سریندر کے دل میں اس خواہش نے جنم لیا کہ کاش کملا ہمیشہ اُس کے ساتھ رہ سکے۔

''وہ تو پھر ایک ہی بات ہوئی۔'' کملا مردہ سے لہجے میں کہنے لگی۔ ''اگر ایسا ہی ہے تو پھر یہیں رہنے میں میرا کیا نقصان ہے!''

''نہیں۔'' سریندر نے بے ساختہ کہا۔ ''یہ...... یہ تو پرایا گھر ہے...... تمہیں یہاں نہیں رہنا۔''

''تم یہ کیا کہہ رہے ہو سریندر......! تمہیں یہ خیال بھی نہیں کہ تمہاری بات سے کھنج بابو کو کتنا دُکھ ہو گا! کھنج بابو میرے لئے غیر تو نہیں ہیں۔''

سریندر پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کے بجائے سریندر کو کھنج سے رقابت سی

محسوس ہوئی۔ اگر کھنج نہ ہوتا تو کملا اُسی کے ساتھ رہتی۔ کملا کے لئے اب تک کھنج نے جو کچھ کیا تھا اور جو رویہ اختیار کیا تھا، اسے ملحوظ رکھتے ہوئے کملا کا کہنا ٹھیک ہی تھا، مگر وہ اپنے دل کو کیسے سمجھاتا جو کملا کو ساتھ رکھنے کی خاطر مچل رہا تھا۔ محبت کی یہ شدت سریندر نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ سریندر کو یہ بات بھی کھٹکی کہ کھنج کے ایک مرتبہ کہنے ہی سے کملا نے گاؤں جانے کی ضد چھوڑ دی۔

''تو پھر میں کل صبح کی گاڑی سے گھر لوٹ جاؤں گا۔'' ارون بول اُٹھا۔ ''گاؤں جا کر ماں اور پتا جی کو دیدی کے بارے میں بتا دوں گا۔''

''ہاں یہی بہتر ہوگا۔'' کھنج نے کہا۔ سریندر خاموش ہی رہا۔

دوسرے دن جب ارون اپنی بہن کملا سے رخصت ہو رہا تھا تو کملا نے کہا۔ ''ارون! تمہیں میرا ایک کام چپکے سے کرنا ہوگا۔ اسے کوئی جاننے نہ پائے۔''

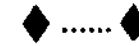
''کیا؟'' ارون نے پوچھا۔

کملا نے ایک بند لفافہ اُس کے ہاتھ میں دیا اور بولی۔ ''تم یہ خط اپنے ہاتھ سے دے کر آنا۔''

''کس کو؟'' ارون نے سوال کیا۔

''خود ہی پتہ پڑھ کر دیکھ لو۔'' کملا نے جواب دیا۔

ارون نے دیکھا، لفافے پر لکھا تھا۔ ''شری ستیش چندر رائے کی سیوا (خدمت) میں۔'' لفافے پر اپنے بہنوئی کا نام پڑھ کر ارون نے اقرار میں سر ہلا دیا۔



اپنی ماں دُرگا دیوی کی ہدایت کے مطابق کملا کے شوہر ستیش نے اپنے سسر ہرناتھ کو ایک تار ارسال کر دیا اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔ یہ وہ دن تھے کہ ہرناتھ، زمیندار یوگیندر کے ساتھ کلکتے گیا ہوا تھا۔ ستیش کا بھیجا ہوا تار اسی لئے واپس آ گیا۔ دُرگا دیوی نے تار واپس آنے سے اندازہ لگا لیا کہ معاملہ خراب ہے۔ اُس نے بیٹے سے کہا۔ ''میں گاؤں جانا چاہتی ہوں، کیا تم کسی طرح مجھے وہاں بھیج سکتے ہو؟''

ستیش کچھ سوچ کر بولا۔ ''بھیج سکتا ہوں۔ یہاں قریبی نہر سے کچھ ہی فاصلے پر ششر بابو رہتے ہیں۔ ان کی بیوی بہت بیمار ہیں۔ اُسے دیکھنے اُن کی ماں اور وہ خود

کلکتے جا رہے ہیں۔ تم اُن کے ساتھ جاؤ گی تو وہ تمہیں جگدلیش پور اتار دیں گے، لیکن تم گاؤں کیا کرنے جا رہی ہو؟...... یہاں تمہیں کیا پریشانی......''

دُرگا دیوی درمیان میں بول اُٹھی۔ ''نا..... نا.....! میرے گئے بنا کام نہیں چلے گا۔ گاؤں جاتے ہی میں تیرے لئے ایک اچھی سی لڑکی دیکھوں گی تاکہ اس سے تیرا بیاہ کر دوں۔''

ستیش کو جب سے کملا کی بدنامی کا خط ملا تھا، اُس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ دنیا داری ترک کر کے وہ الگ ہو جانا چاہتا تھا۔ جب کملا ہی اُس کے ساتھ وفا نہ کر سکی تو پھر کسی اور سے یہ توقع رکھنا اُسے فضول اور بے معنی معلوم ہوا۔ اس کے ساتھ ہی کملا کے بغیر زندگی میں اُسے کوئی حُسن اور کسی طرح کی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ درحقیقت دنیا سے اُس کا دل اُٹھ گیا تھا۔ دنیا سے تیاگ لینے کے بارے میں ستیش کئی مرتبہ اپنے گرو دیو آتما آنند سوامی سے بات چیت کر چکا تھا۔ اپنے گرو دیو سے گفتگو کر کے دنیا داری چھوڑنے کا ارادہ مزید پختہ ہو چکا تھا۔ ان حالات میں جب ستیش کو پتہ چلا کہ ماں ایک بار پھر شادی کا پھندا اُس کے گلے میں ڈالنا چاہتی ہے تو اُسے بہت تشویش ہوئی۔ اُس نے دُرگا دیوی سے تو کچھ نہیں کہا مگر کڑی دُھوپ میں سیدھا سوامی جی کے آشرام کی طرف چل دیا۔

گومتی ندی کے کنارے موتی محل کے پاس چھوٹے سے ایک پختہ مکان میں جو گھاٹ ہی کا حصہ تھا، ستیش کا گرو اپنی بیوی کے ساتھ سکونت اختیار کئے ہوئے تھا۔ لکھنؤ میں رہنے والے ڈاکٹر، وکیل، ملازمت پیشہ کچھ بنگالی بھگتوں یا چیلوں کی دی ہوئی کمائی سے گرو کا خرچ آرام سے چل جاتا تھا۔ وہ فارغ البالی کے ساتھ بھجن پڑھنے اور اُپدیش دینے میں اپنا وقت گزارتا تھا۔ دوپہر کی دُھوپ میں جھلستا ہوا ستیش جب گرو کے پاس پہنچا تو وہ کھانے کے بعد ہرن کی کھال کے ملائم بستر پر نیم دراز آرام کر رہا تھا۔ مجبوراً ستیش کو باہر انتظار کرنا پڑا۔

مکان کے سامنے ہی گومتی ندی بہتی تھی۔ اردگرد کا منظر دیکھ کر ستیش کو اپنا گاؤں یاد آ گیا، اسی کے ساتھ وہ پُرسکون دن بھی جو اُس نے کملا کے ساتھ گزارے تھے۔ سہ پہر کے وقت گرو کی آنکھ کھلی اور ستیش کو اس سے ملنے کا موقع نصیب ہوا۔ گرو بھی بنگالی تھا، مگر کس ذات کا تھا کسی کو خبر نہ تھی۔ اُس کا رنگ انتہائی سیاہ تھا۔ سر چوڑا، چہرہ لمبوترا، قد

ٹھگنا اور گول گول چھوٹی چھوٹی آنکھیں! آنکھوں میں گانجے کے نشے کی وجہ سے ہلکی سرخی رہتی تھی۔ داڑھی مونچھ شہد کی مکھی کا لٹکتا ہوا چھتا معلوم ہوتے تھے۔ گرو نے نیند سے بوجھل آواز میں ستیش کو مخاطب کیا۔ ''آؤ بیٹھو!...... بتاؤ کیسے آنا ہوا؟''

ستیش نے دونوں ہاتھ جوڑ کر متانت کے ساتھ کہا۔ ''بہت مصیبت میں پڑ گیا ہوں سوامی جی!...... ماں جی پھر میرا بیاہ کرنا چاہتی ہیں۔ وہ اسی مقصد کے لئے گاؤں جا رہی ہیں کہ کوئی لڑکی دیکھ سکیں...... اور...... اور سوامی جی، آپ کو پتہ ہے کہ میں دنیا داری تیاگنا چاہتا ہوں۔''

''ہوں!'' گرو نے طویل سانس لیا اور آلتی پالتی مارنے لگا۔

ستیش یہ دیکھ کر اُٹھا اور گرو کے پیر پکڑ لئے، پھر بولا۔ ''میں اب کیا کروں سوامی جی!...... مجھے آپ ہی پر بھروسا ہے کہ راستہ دکھائیں گے۔''

گرو نے گھنے بالوں والی بھنوؤں کو ذرا اُٹھا کر کہا۔ ''سنسار ایک مایا نگری ہے۔ یہاں حرص اور لالچ کا کوئی انت نہیں۔ گرہستی بھاری جھنجٹ ہیں۔ اس میں دُکھ اور تکلیف کی بھی حد نہیں۔ میں تو تمہیں کب سے یہ مشورہ دے رہا ہوں کہ سب چھوڑ چھاڑ کر گرہستی سے نکل جاؤ اور دیر مت کرو۔''

ستیش منہ بنا کر بولا۔ ''لیکن میں تو دو مسئلوں کے درمیان پھنس گیا ہوں۔ ادھر ماں کا حکم ہے بیاہ کرو، ادھر آپ کہہ رہے ہیں دنیا چھوڑ دو! میں کس کا حکم مانوں؟''

گرو نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ ''تو پھر ماں کا حکم مانو۔ پرنتو (مگر) مکتی (نجات) کی اُمید چھوڑ دو۔'' گرو نے جس لہجے میں یہ الفاظ کہے تھے اس سے خفگی جھلک رہی تھی۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' ستیش بولا۔ ''میں نے تو دنیا کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے لیکن......''

''لیکن اور اگر مگر ہی کی وجہ سے مکتی نہیں مل پاتی۔'' گرو نے لمبی جماہی لی۔ ''اسی بنا پر کچھ لوگوں کو تین تین جنم تک مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔''

''تین جنم تک؟'' ستیش نے حیرت کا اظہار کیا۔

''ہاں۔'' گرو نے جواب دیا۔ ''یہ صرف میرا اندازہ ہے۔ ورنہ ایک آدھ جنم زیادہ بھی ہوسکتا ہے۔''

''پھر تو میرے لئے مکتی کا کوئی راستہ ہی نہیں۔'' ستیش نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''تین جنم تو کیا نو جنم تک اگر مگر کا چکر نہیں چھوٹے گا۔''

گرو کہنے لگا۔ ''گرو کے لئے بھگتی اور عقیدت رکھ کر تجھے مکتی مل سکتی ہے۔ اس کا حکم مان کر ہی اس جنم میں مکتی ملے گی۔ اس میں شک نہ کر!''

''یہ تو ٹھیک ہے گرو دیو، مگر...... اور یہ مگر خود بخود ذہن میں آتا ہے۔ اس کا کیا علاج ہو...... ورنہ میں تو آپ کے حکم کو حرف بہ حرف بجا لانے کو تیار ہوں۔''

''کس بارے میں ''مگر'' کی اڑچن (مشکل) ستاتی ہے؟'' آتما آنند نے پوچھا۔

ستیش کہنے لگا۔ ''بہت ساری باتوں میں ''مگر'' کا سوال اُٹھتا ہے۔ سب سے زیادہ اپنی بیوی کے کردار کی بابت یہ ''مگر'' دکھائی دیتا ہے۔ مجھے ایک گمنام خط ملا ہے جو میری بیوی کے متعلق ہے۔ مجھے اس خط پر یقین نہیں آتا۔ وجہ یہ کہ میں اپنی بیوی کے کردار کو کافی حد تک جانتا ہوں۔ ''مگر'' کا دوسرا سوال دوسری شادی کے بارے میں ہے۔ تیسرا ''مگر'' گھر چھوڑ کر جانے سے متعلق ہے۔ کیا گھر میں رہ کر ریاضت و عبادت ممکن نہیں؟...... سب سے مشکل ''مگر'' نوکری چھوڑنے کے متعلق ہے۔ نوکری چھوڑنے کا مطلب ہے ماں کو بھوکا مارنا...... اور کملا کو چھوڑنے کا مطلب ہے اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹنا۔''

بے چارہ ستیش کڑی دُھوپ میں جلتا جھلتا آیا تھا اور گرو ٹھنڈک بھرے گھر میں سوچ رہا تھا۔ اسی وجہ سے ستیش کے جوش میں آنے پر بھی وہ ٹھنڈا رہا۔ اُس نے نرم آواز میں اپنے ایک چیلے کو پکارا۔ ''سدھیر! ذرا یہاں تو آؤ۔''

گھٹنوں تک لمبا چوڑا گیروے رنگ کا ایک چغہ سا پہنے اور منڈوائے ہوئے سر والا ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔

آتما آنند نے ستیش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس نوجوان سے کہا۔ ''انہیں ذرا پرشاد کھلا کے ٹھنڈا پانی پلاؤ تاکہ یہ شانت ہوں۔ تب تک میں ہاتھ منہ دھو آؤں۔'' یہ سن کر ستیش نے گرو کے کھڑاؤں آگے بڑھا دیئے۔

کھڑاؤں پہن کر گرو ''کھٹ کھٹ'' کرتا اندر چلا گیا۔ ستیش نے طویل سانس لے کر سدھیر کو مخاطب کیا۔ ''مجھے کوشش کے باوجود آج تک مکتی نہیں ملی۔ گرو جی کہتے ہیں

مجھے اس کے لئے کم سے کم تین جنم لینے پڑیں گے تب جا کر کہیں مکتی نصیب ہوگی۔"

سدھیر نے ہنس کر کہا۔ "اگر میں ایسی ترکیب بتا دوں کہ ایک ہی جنم میں مکتی مل جائے تو مجھے کیا انعام دو گے؟"

"میرے پاس تو کچھ بھی نہیں جو تمہیں دے سکوں۔" ستیش جواب میں بولا۔ "بس زندگی بھر تمہارا غلام بنا رہوں گا۔"

سدھیر نے ستیش کی پشت تھپکی اور کہنے لگا۔ "اچھا پہلے کھا پی لو، پھر بتاؤں گا۔"

"مجھے بھوک پیاس بالکل نہیں، تم وہ ترکیب بتاؤ!" ستیش بولا۔

"دیکھو بندرا بن چلے جاؤ۔" سدھیر نے مشورہ دیا۔ "وہاں تمہیں مور، بندر وغیرہ دکھائی دیں گے جو ایک ہی جنم میں آزاد ہو جاتے ہیں۔ ان کا دوسرا جنم ہوتا ہی نہیں۔ اگر تمہیں میری باتوں پر بھروسا نہ ہو تو وشنو گرنتھ دیکھ لو۔"

"لیکن گرو جی تو مجھے ہمالیہ پر جا کر تنہائی میں ریاضت کرنے کو کہتے ہیں۔" ستیش بول اُٹھا۔ "اچھا تو بتاؤ کہ اپنی بیوی کملا اور ماں کو چھوڑ کر اگر میں یہاں سے پہاڑوں پر چلا جاؤں تو کیا ان کے ساتھ ناانصافی نہ ہوگی؟ مجھے پاپ (گناہ) نہیں لگے گا؟"

اس پر سدھیر نے مسکرا کر کہا۔ "اگر تم نوکری سے فوری طور پر استعفیٰ دے کر چلے جاؤ گے تو لازماً ناانصافی ہوگی۔ میں تو کہتا ہوں کہ پہلے بیماری کی چھٹی لے کے کچھ دن اکیلے گھر میں رہو۔ تمہیں اس طرح کئی برے خیالات سے نجات مل جائے گی، ساتھ ہی تمہارا دماغ بھی ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"اچھی بات ہے۔" ستیش پُر جوش نظر آنے لگا۔ "تمہارا مشورہ مجھے قبول ہے۔ میں آج ہی چھٹی کی درخواست بھیج کے ماں کو گھر روانہ کر دوں گا۔"

"جو کچھ کرنا ہے، یہیں بیٹھ کر کرو۔" سدھیر بولا۔ "گھر جاؤ گے تو پھر "اگر مگر" کے چکر میں پھنس جاؤ گے۔ پہلے تم کچھ کھا پی لو!"

اس مرتبہ ستیش نے انکار نہیں کیا۔ وہ سر جھکائے سوچ بچار میں ڈوبا سدھیر کے پیچھے پیچھے چل دیا!

♦......♦

ستیش کو تو پہلی مرتبہ شادی کرنے پر اعتراض تھا، پھر وہ دوسری شادی کے لئے کیسے راضی ہو جاتا۔ پہلی شادی بھی اُس نے کملا کو دیکھ کر کی تھی۔ کملا کے بے مثال حُسن نے ستیش پر جیسے جادو سا کر دیا تھا۔ وہ اتنی ہی حسین تھی کہ ستیش اُس کے ساتھ شادی سے انکار نہ کر سکا۔ دُرگا دیوی اسی بنا پر ستیش کو بیاہ کے بندھن میں باندھ سکی تھی۔ یہ بندھن کملا کی گمشدگی سے ڈھیلا پڑنے لگا تو دُرگا دیوی فکر مند ہو گئی۔ اُسے یہ دیکھ کر رنج ہوا کہ ستیش کے اندر پھر پرانا مرض پیدا ہو رہا تھا۔ وہ بخوبی جانتی تھی کہ ایک طرف تو سوامی آتما آنند کی نصیحتیں، دوسری جانب کملا کی کمی نے ستیش کے ذہن میں ایک ہیجان برپا کر دیا ہے۔ ستیش اب دوسری شادی کا پھندا ڈالنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ اس پر بھی دُرگا دیوی کو یقین تھا کہ لکھنؤ ہی میں بیٹھے رہنے کی بجائے وہ اپنے گاؤں جگدیش پور پہنچ گئی تو وہاں کوئی نہ کوئی سبیل نکال ہی لے گی۔ یہی سوچ کر اُس نے ستیش کی واپسی سے پہلے ہی اپنا سامان باندھ کے جانے کی تیاری کر لی۔

شام ہو گئی۔ باہر چراغ جل اُٹھے۔ ستیش کے گرد و نواح میں رہنے والے دفتری بابو اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔ ستیش اب بھی نہیں لوٹا تھا۔ دُرگا دیوی سلاخوں دار کھڑکی کھولے کھڑی ستیش کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد آتما آنند کا چیلا سدھیر اُس سے آ کر ملا اور بولا۔ "ماں! کیا آپ نے جانے کی تیاری کر لی ہے؟ چلئے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔"

دُرگا دیوی نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا میرا ستیش نہیں آئے گا؟... اُس سے ملے بغیر..."

"یہ لیجئے!" سدھیر نے بات کاٹ دی اور گیروے چوغے کی جیب سے لکھا ہوا ایک کاغذ نکال کر دُرگا دیوی کے ہاتھ میں دے دیا۔ "خود پڑھ لیجئے کہ ستیش نے کیا لکھا ہے۔"

"تو پڑھ کر سنا دے بیٹا! میں پڑھ نہیں سکتی۔ ستیش تو ٹھیک ہے نا؟" دُرگا دیوی نے کہا۔

سدھیر خط پڑھنے لگا۔ اس میں لکھا تھا۔ "ماں! تم گاؤں کیوں جا رہی ہو، یہ میں بخوبی جانتا ہوں۔ یہ بات اپنی جگہ مگر تم اچھی طرح سمجھ لو کہ میں دوسری شادی نہیں کروں گا۔ تمہارے حکم سے میں نے پہلی شادی کر لی تھی۔ خیر صرف تمہارے حکم سے کہنا بھی ایک دھوکا ہوگا کیونکہ میں تمہاری بہو کملا کو شادی سے پہلے دیکھ آیا تھا اور اُس پر فدا ہوگیا تھا...... بہرحال میری خواہش اور تمہاری کوشش کامیاب ہوگئی، مگر مالک کی مرضی کچھ اور ہی تھی۔ اس نے کسی بہانے مجھے اس بندھن سے آزاد کر دیا۔ مجھے اپنا ماضی ایک خواب کی طرح لگ رہا ہے۔ اب خواب کے بجائے حقیقت کو دیکھنے کا وقت آ گیا ہے۔ اس کے لئے دنیا داری چھوڑ دینے کی اشد ضرورت ہے۔ میرے گرو دیو بھی یہی بات کہتے ہیں۔ انہی کے حکم کو بجا لانے کی خاطر میں گوشہ نشینی اور ریاضت کے لئے ہمالیہ پر جا رہا ہوں۔ مجھے معاف کر دینا۔ خط لے کر آنے والے میرے گرو بھائی سدھیر ہیں۔ یہی تمہیں اسٹیشن پر ششر بابو کو سونپ آئیں گے۔ تمام بندوبست میں نے کر دیا ہے۔
تابعدار، ستیش۔"

اتنے طویل خط میں صرف دو باتیں ہی دُرگا دیوی کی سمجھ میں آئیں، ہمالیہ اور ریاضت! وہ سمجھ گئی کہ ستیش اب لوٹ کر نہیں آئے گا، اسے گاؤں جانا ہی پڑے گا۔ اُسے گمان بھی نہ تھا کہ ستیش اُسے اس طرح چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔ اُس نے آنکھوں میں آ جانے والے آنسوؤں کو آنچل سے پونچھا اور سدھیر کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوگئی۔

سدھیر نے ایک یکہ بلا کر اس پر سامان لادا اور مکان کے دروازے پر تالا ڈال دیا۔ پھر وہ دُرگا دیوی کے ساتھ یکے میں سوار ہو کر اسٹیشن کی طرف چل دیا۔

ستیش کی فطرت میں بیراگ (ترکِ دنیا) کا رجحان تھا۔ اچانک کملا کو دیکھ کر اُس کے حُسن کا نشہ ستیش پر سوار ہوگیا تھا۔ کملا جب اُس کے گھر آئی تو بیراگ کے بجائے اُس کے دل میں محبت کا سمندر موجزن ہونے لگا۔ یہی سمندر اُسے اپنے ساتھ بہائے لئے جا رہا تھا اور اس کی لہریں دنیا داری کی طرف مائل کر رہی تھیں۔ دُرگا دیوی نے اس کا بہت خیال رکھا تھا مگر کملا کی گمشدگی کے بعد اس کا فطری بیراگ پھر عود کر آیا۔ محبت کی جس زنجیر نے اُسے اب تک باندھے رکھا تھا، اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ دُرگا دیوی

کو اس کا احساس ہوگیا تھا وہ اسی لئے ستیش کے پیروں میں جلد سے جلد دوسری شادی کی زنجیر ڈال دینا چاہتی تھی۔ کملا کے جانے یا گم ہونے سے جو خلا پیدا ہوگیا تھا، دُرگا دیوی اسے فوراً پُر کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ اسی لئے گاؤں جا رہی تھی۔ اُس نے ستیش کو سمجھا بجھا کر قائل کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی، اب سب کچھ فضول تھا۔

اُدھر ستیش کا یہ حال تھا کہ کملا کے بارے میں اُسے جو خط ملا تھا، اس پر بالکل یقین نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کملا کوئی غلط قدم نہیں اُٹھا سکتی۔ وہ اندر سے بہت دُکھی تھا۔ کبھی کبھی جیسے کوئی اس کے اندر سے کہتا کہ جو ہونا تھا، وہ ہوگیا۔ اب فضول کوشش کرنے اور دنیا داری کے بندھن میں بندھے رہنے کی کیا ضرورت ہے! موہ اور ممتا کے بندھن کاٹ کر بھاگنا ہی بہتر ہے۔ اُس نے خود ہی اپنے پیروں میں زنجیر ڈالی تھی۔ اب حالات بدل گئے ہیں تو ان میں گرو دیو کی نصیحت کے مطابق دنیا داری میں نہ پھنسا جائے۔ اُس کے سامنے مکتی کا راستہ صاف ہے۔

ستیش کو یہ خیال بھی آتا، کیا کملا واقعی قصوروار ہے؟ ایک گمنام خط کی عبارت پر یقین کر کے کملا کو عمر بھر کے لئے داغِ مفارقت دے دینا، اُس کی زندگی برباد کر دینا کیا مناسب ہوگا؟ وہ سوچتا کہ اس تمام معاملے کی تحقیقات کرنے کی خاطر اس کے لئے ہمالیہ جانے سے کہیں زیادہ اہم کالی گرام جانا تھا۔ پھر اُس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا کہ اگر افواہ درست ہوئی تو؟ ستیش کا دل کبھی تو ہمالیہ جانے کو مچلتا، کبھی کالی گرام جانے کے لئے! وہ کبھی اپنے دفتر جاتا اور کبھی گرو کے ٹھکانے پر جا پہنچتا۔ وہ ابھی تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔

دوسری طرف پنجاب میل وقت مقررہ پر دُرگا دیوی کو اُتار کر چلی گئی۔ اُسے اپنے گھر پہنچے ایک ہفتے سے زیادہ ہوگیا تھا پھر بھی ستیش ابھی تک ہمالیہ جانے کے منصوبے پر عمل نہیں کر سکا تھا، مگر اُس کا دل مکتی کے لئے تڑپ رہا تھا۔ یہ بات اُس کے دفتری ساتھی اور سارے گرو بھائی بھی سمجھ گئے تھے۔ رُخصت کی درخواست منظور ہو جانے پر ستیش کدھر جائے گا، شمال مشرق یا جنوب مشرق کی طرف؟ اس سلسلے میں قیاس آرائیاں کی جانے لگیں۔

♦......♦

باہر بوندا باندی ہو رہی تھی اور ارون ناشتے کی میز پر کھیتج کے سامنے بیٹھا تھا۔ کھیتج نے ارون سے پوچھا۔ ''کیا بارش ہی میں اپنے گاؤں جاؤ گے؟''

''نہیں۔'' ارون نے انکار میں سر ہلایا۔ ''ستیش دادا سے مل آؤں پھر جاؤں گا۔''

''لکھنؤ جاؤ گے؟...... وہاں تو ستیش بابو نہیں ہیں۔'' کھیتج بولا۔ اُس کے علم میں تھا کہ کملا نے اپنے شوہر تک پہنچانے کے لئے ایک خط ارون کو دیا ہے۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے وہ مزید کہنے لگا۔ ''لکھنؤ تو ہم ہو آئے ہیں۔ وہ اپنے گاؤں جگدیش پور گئے ہوئے ہیں۔''

ارون نے چائے کا گھونٹ بھر کر کہا۔ ''میں لکھنؤ نہیں بلکہ جگدیش پور ہی جا رہا ہوں۔''

ناشتہ کر کے ارون، سریندر سے جا کر ملا اور پھر واپسی میں کملا سے رخصت کی اجازت چاہی۔

مقررہ وقت پر ارون کلکتے سے روانہ ہو گیا۔ جگدیش پور کے اسٹیشن پر ٹرین کم وقت کے لئے رُکتی تھی۔ ارون اس لئے پہلے ہی سے تیار تھا۔ اسی اسٹیشن پر کالی گرام جانے کے لئے اُترا جاتا تھا کیونکہ جگدیش پور سے کالی گرام زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ ارون کو اپنی جان پہچان کے دو قلی مل گئے۔

''کالی گرام جاؤ گے بھیا؟...... لاؤ اپنا سامان مجھے دے دو۔'' ایک قلی نے ارون کو مخاطب کیا۔

''میں تو جگدیش پور جاؤں گا۔'' یہ کہتے ہوئے ارون نے اپنا بیگ قلی کو تھما دیا، پھر مزید بولا۔ ''ستیش بابو کا گھر تو تمہیں معلوم ہوگا، وہیں چلو!''

''گھر کیوں نہیں جانتا!'' قلی نے کہا۔ ''لیکن ستیش بابو گھر پر نہیں ہیں، صرف اُن کی ماں ہے۔''

ارون نے سوچا، جب ستیش ہی گھر پر نہیں تو جانا بے کار ہے، پھر خیال آیا کہ اگر ستیش نہیں تو اس کی ماں ہی سے مل لوں گا۔ اس کے بعد میں کالی گرام چلا جاؤں گا۔

بھادوں کے دن تھے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، مگر ہوا کا نام و نشان نہیں تھا۔ ارون کا سامان لے کر قلی تیز قدمی کے ساتھ اتنا آگے نکل گیا تھا کہ دکھائی بھی نہیں

دے رہا تھا۔ آخر کار دُھول میں اٹا ہوا وہ گاؤں پہنچ ہی گیا۔

گاؤں میں صرف ایک ہی راستہ تھا۔ اسی راستے کے دونوں طرف دُکانیں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ شیو اور ہنومان کے پرانے مندر، اسکول اور ایک ڈسپنسری تک موجود تھی۔ چھوٹی سی ایک لائبریری اور اسی سے ملحق ایک ہال بھی تھا۔

ارون نے چلتے چلتے اسی لائبریری کے قریب پہنچ کر دیکھا کہ قلی اُس کا سامان لئے کھڑا ہے۔ کچھ دور چل کر ہی قلی نے ایک مکان کے بند دروازے پر ارون کا سامان رکھ دیا۔ ارون نے دروازے پر دستک دے کر ستیش کی ماں کو پکارا۔ دو تین مرتبہ دستک اور پکار کا جب کوئی جواب نہ ملا تو ارون نے قلی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تیرا کہنا تو یہ تھا کہ ماں گھر میں ہے؟''

''گھر میں تو ہے۔'' قلی نے جواب دیا۔ وہ بھی اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ''اُسے بخار آ رہا تھا۔ ممکن ہے تیز بخار کی وجہ سے وہ اُٹھنے سے معذور ہو۔''

''تو اب تک بتایا کیوں نہیں گدھے!'' ارون نے یہ کہہ کر دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔ اندر صحن میں چبوترے پر بیگ رکھ کر ارون نے قلی کو مزدوری دی اور بولا۔ ''ڈسپنسری سے ذرا ڈاکٹر بابو کو جا کر بلا لاؤ۔''

قلی چلا گیا تو ارون اندھیری کوٹھری کے اندر گیا جہاں دُرگا دیوی لیٹی ہوئی تھی۔ ارون نے قریب جا کر دُرگا دیوی کو پکارا اور پاؤں چھوئے۔

''کون...... ستیش؟'' دُرگا دیوی نے چونک کر کہا۔

''ستیش نہیں، میں ارون ہوں۔'' ارون نے قریب بیٹھ کر جواب دیا۔

''ارون!...... گھر میں تو سب خیریت ہے بیٹا؟...... میری......'' دُرگا کی آواز بھرا گئی۔

''تمہاری بہو اچھی ہے، فکر نہ کرو۔'' ارون بول اُٹھا۔ ''وہ گنگا اشنان کرنے گئی تھی، وہیں بھیڑ میں کھو گئی تھی۔ ہمارے گاؤں کے سریندر نے دیکھا کہ راستے میں بیٹھی رو رہی ہے۔ تب وہ اُسے اپنے دوست کھیتج کے گھر لے گئے۔ وہاں وہ بہت بیمار ہو گئی۔ سریندر دادا اور کھیتج نے علاج کرایا تو اُس کی جان بچ گئی۔

دُرگا دیوی نے ارون کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''اب وہ کہاں ہے؟''

ارون نے کسی جھجک کے بغیر جواب دیا۔ ''اب دیدی میرے پاس ہے۔'' یہ کہتے

ہوئے وہ چادر سے اپنا منہ صاف کرنے لگا۔

دُرگا دیوی نے طویل سانس لے کر پوچھا۔ ''تو وہ افواہ؟...... کیا سب جھوٹ ہے؟''

''ہاں......'' ارون نے تائید کی۔ پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں ذرا باہر جا کر دیکھ آؤں، شاید ڈاکٹر بابو آ گئے ہوں۔''

دُرگا دیوی کے پاس بیٹھے رہنا فضول ہی تھا، ارون اسی لئے وہاں سے اُٹھ آیا۔ پھر وہ اسی وقت کوٹھڑی میں گیا جب ڈاکٹر آ گیا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ اگر دُرگا دیوی نے کملا کی گمشدگی اور اس کے نتیجے میں بدنامی کی بابت زیادہ پوچھ گچھ کی تو وہ کوئی جواب نہ دے سکے گا۔

ڈاکٹر نے دُرگا دیوی کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا۔ ''انہیں ٹائیفائڈ ہو گیا ہے۔ اسی کی وجہ سے بخار ہے۔ تیمارداری کے لئے کسی نرس کو یہاں ہونا چاہئے۔'' ڈاکٹر نے یہ بھی کہا۔ ''گاؤں والے طرح طرح کے وہموں کا شکار ہوتے ہیں اس لئے کوئی شاید ان کے پاس نہ رہے کہ کہیں اسے بھی یہ بیماری نہ لگ جائے اور یہ بھی درست ہے کہ......''

ارون بول اُٹھا۔ ''اس ذکر کو اس وقت جانے دیں۔ آج رات بھر یہاں رہنے کے لئے آپ ہی کسی کو ڈسپنسری سے یہاں بھیج دیں۔ میں آج ہی کلکتے سے ایک نرس لانے جاتا ہوں۔ کل تک میں ضرور واپس آ جاؤں گا۔ تب تک آپ ان کی دیکھ بھال کر سکیں تو بہت مہربانی ہو گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' ڈاکٹر یہ کہہ کر چلا گیا۔

ڈاکٹر کا تعلق ایک سماجی تنظیم ''راما کرشن مشن'' سے تھا۔ اسی تنظیم نے یہاں صحت کا مرکز کھولا تھا۔ کوئی اور پیشہ ور ڈاکٹر ہوتا تو شاید ارون کی درخواست پر کان نہ دھرتا۔

ارون ڈاکٹر کو رخصت کر کے دُرگا دیوی کے پاس آیا اور کہا۔ ''ستیش دادا کا پتہ کیا ہے ماں جی؟ میں انہیں تار بھیجوں گا۔''

''تار تو اُسے نہیں مل سکے گا۔'' دُرگا دیوی نے بتایا۔ ''وہ تو بیراگ دھارن کر کے ہمالیہ پر چلا گیا ہے۔''

''تو پھر کیا، کیا جائے؟'' ارون نے چونک کر دریافت کیا۔ ستیش کے ترکِ دنیا کی خبر ارون کے لئے حیران کن تھی۔ چند لمحے توقف کے بعد ارون بولا۔ ''ماں جی! آپ کی

خدمت کے لئے میں نرس لانے کلکتے جا رہا ہوں۔''

نرس کے بارے میں سن کر دُرگا دیوی نے بھنویں سکیڑ کر کہا۔ ''نہ...... نہ...... نرس کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''تو پھر دیدی کو لے آؤں؟'' ارون نے موقع غنیمت جان کر سوال کیا۔

''ہاں یہی اچھا ہو گا۔'' دُرگا دیوی نے جواب دیا، پھر کہنے لگی۔ ''بہو سے کہنا کہ میں نے اس گم نام خط پر یقین نہیں کیا، نہ ہی کبھی کر سکتی ہوں۔ میری بہو سراپا لکشمی ہے۔''

ارون کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر کی بھیجی ہوئی خدمت گار رام کلی آ گئی۔ اُسے دیکھ کر ارون نے دُرگا دیوی کو مخاطب کیا۔ ''ماں جی! آج رات بھر کے لئے اس نوکرانی کو میں آپ کے پاس چھوڑ جاتا ہوں۔ کل میں دیدی کو لے کر آ جاؤں گا۔ اپنا بیگ میں یہیں چھوڑے جا رہا ہوں۔''

دُرگا دیوی کے پاؤں چھو کر ارون جانے ہی والا تھا کہ دُرگا دیوی نے نوکرانی سے کہا۔ ''دیکھو پاس والی کوٹھڑی میں کچھ بتاشے اور ایک ڈاب (کچا ناریل) رکھا ہے، لا کر ارون کو دے دو۔'' نوکرانی نے اس ہدایت پر عمل کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔

ارون نے کچھ بتاشے کھائے اور ڈاب کا سارا پانی پی لیا۔ پھر گھر سے نکل کر اسٹیشن کی طرف چل دیا۔



◆......◆

ارون کی زبان سے ساس کے سخت بیمار ہونے کی خبر سن کر کملا رونے لگی۔ یہ جان کر تو کملا کا برا حال ہو گیا کہ ستیش کا کچھ پتہ نہیں، وہ شاید ہمالیہ کی کسی چوٹی پر چڑھ کے ریاضت کر رہا ہو گا۔ اُسے ماں کے بارے میں اطلاع دینا ممکن نہیں ہے۔

ستیش گھر بار چھوڑ کر کیوں چلا گیا؟ یہ سوچ کر کملا کو اپنے دل پر بوجھ سا محسوس ہوا۔

''صرف اتنا ہی نہیں۔'' ارون کہنے لگا۔ ''ڈاکٹر کہتا تھا کہ تمہاری ساس کے پاس کوئی نہیں پھٹکتا کہ اسے بیماری نہ لگ جائے۔ کوئی ان کے منہ میں دو بوند پانی ڈالنے کو تیار نہیں۔ اس گاؤں میں عجیب بے حس لوگ بستے ہیں۔''

''تو کیا ماں جی اکیلی ہی پڑی ہیں ارون؟'' کملا بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''انہیں کوئی دیکھنے والا نہیں؟''

"کہہ تو دیا کہ ایسی ہی حالت ہے۔" اروِن نے کہا۔ "ڈاکٹر نے ایک نوکرانی کو ان کی دیکھ ریکھ کے لئے بھیج دیا ہے۔"

ریندر بھی اس وقت وہاں موجود تھا۔ وہ ساری بات سن کر بولا۔ "ٹھیک ہی کیا۔ آج کی رات تو کٹے۔ صبح پانچ بجے گاڑی جاتی ہے۔ اگر وہ گاڑی مل جائے تو آٹھ بجے تک کملاؤ وہاں پہنچایا جا سکتا ہے۔" سریندر نے طویل سانس لے کر کھنج کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا۔

"کملا کو وہاں لے جانے سے کیا فائدہ ہوگا؟" کھنج بولا۔

"فائدہ......؟ ستیش وہاں موجود نہیں۔ ایسی صورت میں ساس کی تمام ذمہ داری کملا ہی پر تو عائد ہوتی ہے۔" سریندر نے کہا۔ "کملا کے سوا بڑھیا کو اور کون دیکھنے والا ہے۔ سن تو لیا تم نے بیماری لگ جانے کے خوف سے کوئی گاؤں والا بڑھیا کے پاس نہیں آتا۔"

کھنج کسی بھی معاملے میں زیادہ سوچ بچار کا قائل نہیں تھا، مگر یہ معاملہ ذرا مختلف تھا۔ کملا کی جدائی پر وہ اپنے دل کو راضی کیسے کر لیتا!

"تمہارا یہ کہنا ٹھیک ہے سریندر!...... مگر کیا خبر محلے والوں کو بڑھیا کے بیمار ہونے کا علم ہی نہ ہو۔" کھنج نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ "میں بھی ایک گاؤں ہی کا رہنے والا ہوں۔ گاؤں والے اس قدر بے مروت یا سنگ دل نہیں ہوتے، وہ ایک دوسرے کے دُکھ درد بانٹتے ہیں۔"

کھنج کی بات میں وزن تھا، سو سریندر بولا۔ "مان لیا، مگر پرائے تو پرائے ہوتے ہیں! اصل ذمہ داری تو اپنوں پر ہوتی ہے۔"

"پھر کیا پتہ کہ بڑھیا کو ٹائیفائڈ ہی ہے۔" کھنج نے کہا۔ "ایک روز بخار آنے سے اتنی بڑی بیماری کا اندازہ کس طرح کیا جا سکتا ہے؟"

"تو کیا، کیا جائے، تم ہی بتاؤ!" سریندر نے دریافت کیا۔ "میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔"

اب تک سریندر اور کھنج کے درمیان ہونے والی گفتگو کے دوران میں اروِن خاموش ہی رہا تھا۔ ان دونوں کے چپ ہونے کے بعد وہ بولا۔ "میں تو وہی سب کچھ سن کر آیا

ہوں جو بتایا ہے۔ بخار آج ہی آیا ہے یا کئی دن پہلے سے آ رہا ہے، یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ شاید انہیں کئی دنوں سے ہے......"

کھنج نے اروِن کی بات پوری نہیں ہونے دی بلکہ اس پر توجہ ہی نہیں دی۔ وہ درمیان ہی میں بول اٹھا۔ "اس کے سوا ایک بات اور بھی غور طلب ہے سریندر! بخار تو خیر دو چار دن میں اُتر جائے گا لیکن کملا کے وہاں جانے سے اور بہت سی باتیں شروع ہو جائیں گی۔ ظاہر ہے کہ کملا کی گمشدگی کا علم جگدیش پور کے باسیوں کو بھی ہوگا۔ ستیش کی ماں نے سب کو کملا کے غائب ہو جانے کے بارے میں بتا دیا ہوگا۔ کملا کے ماتھے پر اس طرح کلنک...."

"کھنج بابو!" کملا روہانسی آواز میں بول اُٹھی۔ "کیا...... کیا آپ لوگ مجھے یہیں قید کر کے رکھ چھوڑنا چاہتے ہیں؟...... میری ساس بیمار ہے۔ وہ ان کے پاس نہیں ہیں۔ میرا مطلب ہے، اروِن کے جیجا جی!...... اگر میں ایسی حالت میں نہیں جاؤں گی تو کب جاؤں گی؟"

"تمہارا یہ کہنا ٹھیک...... ٹھیک ہے۔ مگر سوچ کر دیکھنے سے......"

کملا نے کھنج کی بات کاٹ دی۔ "کیا سوچ کر دیکھنا چاہتے ہو، میں بھی تو ذرا سنوں!...... صرف سوچ سوچ کر ہی تو آج تم لوگوں نے میری یہ حالت کر دی ہے۔" پھر کملا نے سریندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے کوئی خطا نہیں کی۔ اگر تم لوگوں نے میری بھلائی کی خاطر زیادہ سوچ بچار نہ کیا ہوتا، یہ سب نہ کرتے اور اس کے بجائے سیدھے مجھے گھر لے جاتے تو میرا بھلا ہی ہوتا اور تمہیں بھی میری وجہ سے اتنا سوچنے کی تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔ میں اب تم لوگوں کی مدد نہیں چاہتی۔ اروِن کو ساتھ لے کر میں کل صبح جگدیش پور چلی جاؤں گی۔ میرے نصیب میں جو لکھا ہے، ہو جائے گا۔ اب تم لوگ میری بھلائی کی فکر نہ کرو۔"

سریندر اور کھنج دونوں ہی چونک اُٹھے۔ کملا نے اس سے پہلے ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔ انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ خود کملا بھی اپنے برے بھلے کے بارے میں سوچ سکتی ہے۔ فوری طور پر وہ دونوں کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ سچ یہ ہے کہ دونوں ہی کے دل میں چور تھا۔ غیر ارادی طور ہی پر سہی، وہ کملا کو خود سے جدا کرنا نہیں چاہتے تھے۔

کملا کی آنکھوں سے اس عرصے میں آنسو بہنے لگے تھے۔ اُس نے آنسو پونچھ کر کہا۔

''تم لوگ یہ کبھی نہ سمجھنا کہ میں کبھی تمہاری مہربانی بھول سکوں گی، مگر آج...... ہاتھ جوڑ کے پرارتھنا (درخواست) کرتی ہوں کہ......'' یہ کہتے ہوئے کملا کی آنکھوں سے لگی آنسوؤں کی جھڑی تیز ہوگئی۔ اس بار کملا نے آنسو پونچھنے کی لاحاصل کوشش نہیں کی۔ ہاتھ جوڑ کر اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں مزید کہا۔ ''میری وجہ سے تم لوگوں نے کتنا دُکھ اٹھایا ہے، یہ میں اچھی طرح جانتی ہوں اور بھگوان کو بھی اس کی خبر ہے، مگر اب میں ایک دن کی بھی دیر کرنا نہیں چاہتی۔ آج سے اپنی بدقسمتی کا سارا بوجھ میں نے خود پر لادلیا ہے۔ کھتج بابو ایک دن مجھے راستے سے اٹھا لائے تھے اور میری جان بچائی تھی۔ اسی طرح آج مجھے حوصلہ دو کہ اس مشکل سے بھی نکل جاؤں اور تمہیں دُکھ دینے کے لئے دوبارہ لوٹ کر نہ آؤں۔''

کھتج نے منہ دوسری طرف کرلیا۔ شاید وہ اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کررہا تھا۔

''ہم دونوں ہی کی یہ آرزو ہے کملا کہ تمہاری مصیبت دُور ہو جائے۔'' سریندر نے کہا۔ ''کل صبح میں بھی کیوں نہ تمہارے ساتھ چلوں؟''

''نہیں۔'' کملا نے انکار کردیا۔

''آخر کیوں نہیں؟'' سریندر تیز آواز میں بولا۔ ''کملا! کیا تم سوچتی ہو، میں جھوٹی بدنامی سے ڈرتا ہوں؟...... اپنے پتاجی کی نامناسب سزا کی پرواہ کرتا ہوں؟ میں تمہارے ساتھ گاؤں ضرور جاؤں گا۔ دیکھوں گا، میرے منہ پر مجھے کون کچھ کہتا ہے!...... کوئی کچھ بولا تو میں جواب دوں گا۔ مگر ارون جواب نہیں دے سکے گا۔ یہ ابھی بچہ ہے۔''

کملا نے پُرنم آنکھوں سے سریندر کی طرف دیکھا، پھر کہنے لگی۔ ''یہ سچ ہے کہ ارون کسی الزام کا کوئی جواب نہیں دے سکے گا، لیکن تمہیں بھی جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنا بوجھ مجھے خود اٹھانے دو۔ میرے مسئلے کو اب اور زیادہ مت اُلجھاؤ۔''

''گاؤں کے لوگوں کی فطرت کے بارے میں سوچو کملا!'' سریندر کا انداز سمجھانے والا تھا۔ ''وہاں اکیلے جانے سے تمہارے ساتھ کہیں کوئی سنگین مذاق نہ ہو۔''

''ایسا...... شاید ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے...... مجھے بھروسہ ہے۔'' کملا بولی اور پھر اُٹھ کر تیزی سے برابر والے کمرے میں چلی گئی۔

کچھ دیر تک کسی کی زبان سے کوئی بات نہ نکلی۔ سبھی مبہوت سے جیسے بُت بنے بیٹھے رہے۔ پھر ارون کی آواز ہی سے یہ خاموشی ٹوٹی۔

''میں شاید ایک بات بتانا بھول گیا۔'' ارون بولا۔ ''ستیش بابو کی ماں سے میں کہہ آیا ہوں کہ کھو جانے کے بعد دیدی صحت مند ہونے تک میرے پاس رہی ہے۔''

''پاگل ہو تم!'' سریندر نے کہا۔ ''تم ابھی بچے ہو۔ کملا تمہارے پاس کلکتے میں ہے، اس بات پر کون یقین کرے گا!...... کیوں کھتج؟''

''ہوں۔'' کھتج نے چونک کر ہنکارا بھرا، پھر اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''اب میں چلتا ہوں، مجھے بہت زور کی نیند آرہی ہے۔''

کھتج یہ کہہ کر اوپری منزل پر چلا گیا۔ مہمانوں کی موجودگی میں اس طرح اُٹھ کر چلے جانا کھتج کے مزاج کے برعکس تھا۔ سریندر اور ارون کو اسی لئے سخت حیرت ہوئی۔ انہیں کھتج سے ایسی بداخلاقی کی توقع نہیں تھی۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ کملا کی جدائی کے احساس کی وجہ سے کھتج اندر ہی اندر بکھر چکا تھا۔



''کھتج بابو!'' آواز کے ساتھ ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں کملا، ذرا دروازہ کھولو۔''

کھتج اُٹھا اور دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ اُسے کملا کھڑی دکھائی دی۔ رات کا اندھیرا اب تک باقی تھا۔ آسمان پر بھی ستارے چمکتے نظر آرہے تھے۔ صرف مشرق ہی میں آسمان قدرے صاف تھا۔ برآمدے کے ایک گوشے میں لالٹین جل رہی تھی، مگر روشنی دھیمی تھی۔

کملا پیلے رنگ کی ایک چادر سر سے پاؤں تک اوڑھے ہوئے تھی۔ اُس کے ساتھ کچھ فاصلے پر ارون کھڑا تھا۔ اُس نے دھاری دار کوٹ کے اوپر کمر سے ایک چادر لپیٹی ہوئی تھی۔ کملا دھیمی آواز میں بولی۔ ''میں چلتی ہوں کھتج بابو!...... گاڑی کا وقت ہوگیا ہے۔''

آخر کار بچھڑ جانے کا لمحہ آ ہی گیا تھا۔ اس احساس کی بنا پر کھتج کے دل پر چوٹ سی لگی۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ ''جا رہی ہو، اچھا!''

"اتنے دنوں تمہیں تکلیف دی اور" کملا کا گلا رندھ گیا۔

"تکلیف؟......نہیں تو...... مجھے تکلیف تو نہیں دی تم نے۔" یہ کہہ کر کھنج نے ارون سے پوچھا۔ "موٹر کے لئے تو کہہ دیا ہے نا؟"

"جی ہاں۔" ارون نے جواب دیا۔ "سریندر دادا تو نیچے موٹر ہی پر بیٹھے ہیں۔ وہ اسٹیشن تک ساتھ جائیں گے۔ آپ نہیں چلیں گے کیا؟"

"نہیں، میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

کملا دُور ہی سے پرنام کر کے رفتہ رفتہ نیچے اُتر گئی۔ ارون کو کھنج نے بضد ہو کر ایک لفافہ دے دیا جس میں کچھ روپے تھے۔ ارون تنہا نیچے پہنچا۔

"کھنج بابو نہیں آئے ارون؟" سریندر نے پوچھا۔

اس سوال کا جواب خود کھنج نے دیا جو اوپر راہ داری کی ریلنگ کے سہارے کھڑا تھا۔

"مجھے سردی سی لگ رہی ہے۔ ایسے میں باہر نکلنا ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"تو پھر تم اندر کمرے میں جا کے آرام کرو۔ میں انہیں چھوڑ کر تمہاری خیریت معلوم کروں گا۔" سریندر بولا۔

موٹر کار میں جلد ہی وہ اسٹیشن پہنچ گئے۔ گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ صبح کا وقت تھا، بھیڑ نہیں تھی۔ انہیں جگہ مل گئی۔ ٹکٹ وہ پہلے ہی لے چکے تھے۔

سریندر نے کملا کو مخاطب کیا۔ "فی الحال میں کہاں رہوں گا، خود بھی نہیں جانتا۔ مجھ سے رابطہ کرنے کی ضرورت ہو تو معرفت......"

ارون نے فوراً کاغذ کا ایک ٹکڑا اور پنسل سریندر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھہریں سریندر دادا...... اس پر اپنا پتہ لکھ دیں۔" سریندر نے کاغذ اور پنسل لے کر پتہ لکھ دیا۔ "کھنج دادا ابھی مجھ سے کہہ رہے تھے کہ آج دوپہر کی گاڑی سے یوپی چلے جائیں گے۔ افسوس کہ میں ان سے پتہ لینا بھول گیا۔

"پھر تو مجھے لوٹ کر اُسے روکنا ہوگا۔" سریندر کہنے لگا۔

"کیوں؟......تم کھنج بابو کو کس لئے روکنا چاہتے ہو؟" کملا نے سوال کیا۔

"کھنج کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" سریندر نے جواب دیا۔ "ایسے میں کھنج کا باہر جانا کسی طرح مناسب نہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ سے کھنج کا یہاں رہنا بہت ضروری ہے۔

تم گاؤں جا رہی ہو کملا!...... کیا خبر گاؤں والے کوئی واویلا کھڑا کر دیں!...... ضرورت پڑنے پر میں تو کالی گرام جاؤں گا ہی، کھنج کو بھی لوگوں کی زبان بند کرنے کے لئے سامنے لے جا کر کھڑا کر دوں گا۔ تم کیا مجھے ڈرپوک سمجھتی ہو؟"

کملا نے سر ہلا کر کہا۔ "نہیں، ڈرپوک نہیں سمجھتی لیکن تم میں سے کسی کو میرے لئے وہاں نہیں جانا پڑے گا۔"

سریندر حیران ہو کر بولا۔ "نہیں جانا پڑے گا؟...... کسی کی ضرورت نہیں ہوگی؟ خیر نہ ہو، نہ سہی! کیا تم گاؤں والوں کی فطرت کو ابھی تک پہچان نہیں سکیں؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنے دن میری عقل کہاں چلی گئی تھی۔" کملا کہنے لگی۔ "میں کیوں اپنا بوجھ تم لوگوں پر ڈالے ہوئے تھی۔ واقعی مجھ سے بھول ہوئی، لیکن اب تم لوگوں کی گواہی طلب کرنے کی غلطی کسی طرح مناسب نہیں۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔" اتنا کہہ کر اُس نے پتہ لکھے ہوئے کاغذ کو ارون سے لے کر پھاڑ دیا۔

گارڈ نے سبز جھنڈی ہلا دی اور پھر گاڑی چل دی۔ سریندر پُرنم آنکھوں کی وجہ سے کملا کے دُھندلائے ہوئے چہرے کو نہیں دیکھ سکا۔ چند روز کے لئے کملا کی صورت میں جیسے بہار کا ایک جھونکا اُس کی زندگی میں آ کر چلا گیا تھا۔ سریندر اس وقت تک اپنی جگہ کھڑا رہا جب تک گاڑی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ کملا نے بھی اس دوران میں ایک بار کھڑکی سے سر نکال کر اُسے دیکھا تھا۔

ٹرین اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی اور ارون اپنی بہن کو تسلی دینے کے لئے جانے کیا کیا کہے جا رہا تھا! کملا اس کی باتوں پر دھیان نہیں دے رہی تھی۔ کملا خاموش بیٹھی رہی۔ وہ سریندر کی یہ بات بھولی نہیں تھی کہ ارون کی باتوں پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔ اپنی ساس کی طرف سے بھی کملا فکرمند تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ گودسونی ہونے کی وجہ سے اُس کی ساس اُسے پسند نہیں کرتی۔ یہ ناپسندیدگی کسی بھی شکل میں ظاہر ہو سکتی تھی۔ وہ گاؤں والوں کے مزاج سے واقف تھی۔

جگدیش پور اسٹیشن پر گاڑی رُکی تو کملا اور ارون جلدی سے اُتر گئے۔ وہاں گھوڑا گاڑی ملنے میں کافی وقت ہوئی۔ بہت کوشش کر کے ارون ایک گاڑی کا انتظام کر پایا۔

جب گھوڑا گاڑی ستیش کے مکان کے سامنے پہنچی تو دن بہت گزر چکا تھا۔

ڈرگا دیوی دو تین میلے تکیوں کو اوپر تلے رکھ کر ان کے سہارے بیٹھی ایک کٹورے میں گرم گرم دودھ پی رہی تھی۔ قدرے ہٹ کر زمین پر بیٹھی ایک پڑوسی بیوہ عورت دھان بین بین کے الگ کر رہی تھی جو وہ کھیتوں سے لائی تھی۔ ڈرگا دیوی کو اس وقت بھی حرارت تھی۔ لیکن ٹائیفائڈ کی کوئی علامت نظر نہیں آتی تھی۔ ارون پر نظر پڑتے ہی وہ بول اُٹھی۔ ''ارے ارون، آ گئے بیٹے...! آؤ بیٹھو...! وہ دروازے کے پاس کون کھڑا ہے؟''

''دیدی آئی ہیں۔'' ارون نے جواب دیا۔

''دیدی؟...... کون، بہو؟''

جیسے ہی کملا اندر داخل ہو کر اپنی ساس ڈرگا دیوی کے پاؤں چھونے لگی، ڈرگا دیوی نے پاؤں سمیٹ لئے۔

دودھ کا کٹورا منہ سے ہٹا کر ڈرگا دیوی کہنے لگی۔ ''رہنے دو...... رہنے دو بہو! پاؤں چھونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دن بھر کے بعد تو چھٹانک بھر دودھ پی رہی ہوں، پاؤں چھو کر اسے بھی برباد نہ کر دینا...... تمہارے تو سائے سے بھی دُور رہنا چاہئے۔''

جو عورت دھان الگ کر رہی تھی، وہ اپنی جگہ سے کچھ اور دُور جا بیٹھی۔

کملا تو چپ رہی مگر ڈرگا دیوی کی بات سن کر ارون جل بھن گیا اور بولا۔ ''جھوٹی کہیں کی! کل پھر تم نے کیوں کہا تھا کہ تمہیں افواہ پر یقین نہیں اور......''

''واہ!...... ذرا اس لڑکے کی باتیں تو سنو!'' ڈرگا دیوی نے اُرون کی بات کاٹ دی۔ ''اگر بخار کی حالت میں کوئی بات منہ سے نکل گئی تو کیا اسے بھی پکڑو گے؟''

''اگر مجھے پہلے یہ پتہ ہوتا تو دیدی کو یہاں نہ لاتا۔'' ارون نے کہا۔

ڈرگا دیوی نے دودھ کا خالی کٹورا ایک طرف رکھا اور بولی۔ ''بگڑ کیوں رہے ہو! سنیاسی دادا آ جائیں، رام بابو کو خبر کر دوں...... وہ جو ٹھیک سمجھیں گے، وہی ہو گا۔ تب تک بہو گھر کے باہر ٹھہرے...... گھر میں کھانے پینے کو سب ہے۔ تھوڑی بہت جو زرعی زمین ہے، اس کی آمدنی سے مجھ بڑھیا کی دال روٹی چل جاتی ہے اور کچھ بچ بھی رہتا ہے۔ ٹیلا کی ماں تم لوگوں کو کھانے پینے کے لئے دے دے گی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں، بہو دروازے پر چار روٹیاں سینک کر تمہیں کھلائے اور خود بھی کھائے۔''

یہ سن کر ارون اور بھی جل گیا۔ اُس نے کہا۔ ''تم کیا سمجھتی ہو ہمیں!...... کیا ہم

بھکاری ہیں؟ یہاں بھیک مانگ کر کھانے آئے ہیں؟ یاد رکھو، تم ہمارے ساتھ جو سلوک کر رہی ہو، تمہارے آگے آئے گا۔'' یہ کہہ کر اُس نے کملا کا ہاتھ تھام لیا۔ ''چلو دیدی، چلیں! ابھی دروازے پر ہماری گاڑی کھڑی ہے۔ اب میں اس بڑھیا کا منہ دیکھنے کا روادار نہیں ہوں۔'' ارون کے چہرے سے شدید غصے کا اظہار ہو رہا تھا۔

کملا نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور بولی۔ ''ٹھہرو!...... ابھی چلتی ہوں۔'' اس کے بعد کملا نے سر پر آنچل درست کیا اور ڈرگا دیوی سے آنکھیں ملا کر نہایت متانت کے ساتھ کہنے لگی۔ ''ماں! میں جا رہی ہوں۔ لیکن میں بھی اس گھر کی بہو ہوں۔ تمہاری طرح یہ میرے سسر کا گھر ہے۔ میں نے ابھی تک کوئی پاپ نہیں کیا جس پر شرمندگی ہو اور نہ ہی کوئی ایسا جرم کیا ہے کہ گھر کے باہر دروازے پر بیٹھوں۔''

''میں کیا جانوں۔'' ڈرگا دیوی نے رُکھائی سے کہا۔ ''وہ تو لوگ کہتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اُس کی نظر کملا کے چہرے پر پڑی اور اُس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

کملا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اپنی ساس کی بات کا کوئی سخت جواب دینے والی تھی مگر موقع نہ ملا۔ ارون مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اُسے باہر لے گیا۔



کچھ دن بندرابن میں رہ کر ستیش کو اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ بیراگ (ترکِ دنیا) تصور میں خواہ کتنا ہی خوبصورت ہو، مگر حقیقتاً قابل عمل نہیں۔ دنیا میں رہ کر دنیا چھوڑ دینا ناممکن سی بات ہے۔ اسی بنا پر لکھنؤ سے بندرابن جا کر ستیش بے فکر ہو کے نہ بیٹھ سکا۔ دنیا، دنیاداری اور ماضی کی یادیں اُسے مایا کے بندھن میں باندھ کر چاروں طرف سے کھینچنے لگیں۔ وہ سوچنے لگا، گرو دیو کہتے ہیں دنیا مایا جال ہے، فریب ہے مگر مجھے تو اس بات پر اب تک شک ہو رہا ہے۔ اپنے تمام تر حواس کے ساتھ میں جس حقیقت کو محسوس کر رہا ہوں، اسے فریب یا دھوکا کیسے مان لوں؟''

اپنے گرو کا حکم مان کر ہی وہ کسی پاگل کی طرح ہمالیہ کی طرف دوڑ گیا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرے؟ کیا لکھنؤ واپس جانا ہی ٹھیک ہو گا؟ مگر آتما آنند کی نصیحتیں، نجات پر تقریر وغیرہ کے بارے میں سوچتے ہی لکھنؤ جانے کا ارادہ اُس نے ترک کر دیا۔

پھر ستیش کو اپنے گاؤں جگدیش پور کا خیال آیا جہاں اُس کی ماں گئی تھی۔ اُسے یاد آ

گیا کہ ماں اُس کی دوسری شادی کرانے پر بضد ہے۔ یہ سوچ کر اُس نے اپنے گاؤں جانے کے خیال کو بھی ذہن سے جھٹک دیا۔ اچھا اگر میں کالی گرام جاؤں تو کیسا رہے گا؟ اُس نے سوچا۔ یہ بات ذہن میں آتے ہی اُسے کملا کے غائب ہو جانے کا واقعہ بھی یاد آ گیا۔ یہ خبر جس انداز میں ستیش تک پہنچی تھی، اس پر اُسے یقین نہیں آیا تھا۔ اس کے باوجود حقیقت جاننے کے لئے دل میں تجسس تھا۔ کملا کے بغیر گھر کا تصور اُس کے لئے کسی برے خواب سے کم نہیں تھا۔ اس کے علاوہ گاؤں والوں کی چہ میگوئیاں، طعن و دشنام، ہنسی وغیرہ سے آلودہ فضا میں رہنا اُس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ وہ عجیب سی اُلجھن میں مبتلا تھا۔

وہ سوچنے لگا، یہ مجھ پر کیسی مصیبت آن پڑی ہے نہ تو میں سماج کو چھوڑ کر سنیاسی بننے کو تیار ہوں اور نہ ہی گھر واپس جانے کو جی چاہتا ہے، نہ ہی بے کار بیٹھے رہنے سے دل کو سکون ملنے کا امکان دکھائی دیتا ہے۔ یہ بکھیڑا کیسے دُور ہو؟ کافی سوچ بچار کے بعد آخر اُس نے یہی فیصلہ کیا کہ گوشہ نشینی ختم کر دے گا۔ ابھی چھٹی کے کچھ دن باقی تھے۔ یہ دن قابل دید تاریخی مقامات کی سیر کر کے گزارے جا سکتے تھے۔ اُسے تاج محل دیکھنے کی بڑی خواہش تھی۔ اگلے ہی روز وہ تاج محل دیکھنے کے لئے آگرہ روانہ ہو گیا۔

شاعر مزاج مغلیہ تاجدار شاہ جہاں کے سنگ مرمر کے بنوائے ہوئے بے مثال تاج محل کو ان گنت لوگوں نے اپنے اپنے زاویئے سے دیکھا ہے، مگر ستیش کو تاج محل دیکھ کر محسوس ہوا جیسے یہ اُس کی محبوبہ کا مجسمہ ہو۔ محبوبہ؟ اُس کے ذہن میں سوال اُبھرا۔ کیا کملا؟......نہیں، یہ محبوبہ کملا نہیں ہو سکتی جس نے محبت، عزت اور وقار سبھی کو بالائے طاق رکھ کر اُسے مذاق کا نشانہ بنا دیا تھا۔ وہ تو اس کے حال اور مستقبل کو اندھیروں میں دھکیل کر اور اسے چھوڑ کے چلی گئی تھی۔ اس کے بارے میں ستیش کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا، مگر اُسے خود پر اختیار کب تھا! کملا کو بھلانے کی خاطر ہی تو اُس نے گوشہ نشینی کا فیصلہ کیا تھا، مگر اس کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ اُس نے کملا کے ساتھ جو شب روز گزارے تھے، انہیں کس طرح بھلا دیتا! کملا مکمل سپردگی تھی۔ ستیش کو اس سے بے وفائی کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ آج کی بے وفا کملا اور محبت کرنے والی پہلی کملا میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

آگرہ میں رہتے ہوئے اُسے خاصے دن گزر گئے۔ وہاں سے کہیں اور جانے کو اُس کا دل نہیں چاہتا تھا۔ وہ گھنٹوں تاج محل کو تکتا رہتا۔ محبت کی اس یادگار نے اُس کے دل

میں بجھتے ہوئے محبت کے شعلے کو جیسے ایک بار پھر پوری شدت سے بھڑکا دیا تھا۔ وہ جیسے سنگ مرمر کی خاموش زبان سننے اور سمجھنے لگا تھا۔ ستیش نے ارادہ کیا کہ یہیں رہ کر چھٹیوں کے بقیہ دن گزار دے گا۔ اِدھر اُدھر مارے مارے پھرنا بے کار تھا۔ یہاں رہتے ہوئے اُس کے دل کو سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ پونم کی رات تھی۔ چاندنی نے تاج محل کو اور بھی شفاف و حسین بنا دیا تھا۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر موجود چبوترے کے اوپر کرتی اتار کے تکیے کی جگہ سر کے نیچے رکھ کر ستیش تاج محل کی خوبصورتی کو دیکھ رہا تھا۔ چاندنی اور تاج محل ایک دوسرے کے ساتھ جیسے گھل مل رہے تھے۔

اچانک فضا کے دوش پر بانسری کی دردناک لے اُبھری۔ اس کے سُروں میں سوز و گداز جیسے کسی نے کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ جیسے بانسری کی وہ دل گداز لے کسی کو پکار رہی تھی۔ یہ درد بھری آواز سن کر ستیش کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

کچھ ہی دیر میں وہ آواز آنا بند ہو گئی۔ ستیش کو یوں لگا جیسے ہر طرف سناٹا پھیل گیا ہو۔ اُس نے طویل سانس لیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بانسری بجانے والے کو دیکھنا چاہتا تھا۔ آخر وہ کون تھا جس کے سینے میں اتنا درد بھرا ہوا تھا جسے بانسری کی لے میں سمو رہا تھا!

ستیش نے دیکھا، قریب ہی جمنا کی طرف منہ کیے ایک شخص خاموش بیٹھا ہے۔ لباس سے وہ کوئی بنگالی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے قریب بیٹھ کر ستیش نے اُسے مخاطب کیا۔ ''میری درخواست پر کیا آپ دوبارہ بانسری بجا سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں!'' اُس شخص نے دھیمے لہجے میں جواب دیا اور دوبارہ بانسری بجانی شروع کر دی۔ اس بار ایک درد بھری راگنی سے فضا بھر گئی۔

اُس شخص نے بانسری بجانی بند کی تو ستیش کہنے لگا۔ ''آپ کی بانسری کی لے میں بڑا درد بھرا ہے۔''

وہ شخص مسکراتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا دل رکھنے کے لئے میری بانسری خوشی کے نغمے بھی سنا سکتی ہے، سنیں گے تو سنئے!'' اتنا کہہ کر اُس نے دوبارہ بانسری اپنے ہونٹوں سے لگالی، مگر ستیش نے اُسے روک دیا تو اُس نے پوچھا۔ ''کیوں، کیا ہوا؟''

''خوشی کا نغمہ شاید یہاں کی فضا کے مطابق نہ ہو۔'' ستیش نے کہا۔

"اسی لئے تو میری بانسری درد کی لے سنا رہی ہے۔" اُس شخص نے ستیش کے چہرے پر نگاہ ڈالی، پھر بولا۔ "اس غمزدہ دنیا میں آپ کو درد بھرے سُروں کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔" گفتگو سے وہ شخص ستیش کو بہت بھلا معلوم ہوا۔

ستیش ہی کے ایما پر اُس شخص نے اپنے بارے میں بتایا۔ "میرا نام کھنج چوہدری ہے، گھر کمل ڈانگا میں ہے۔ آپ کا نام؟"

"میرا نام ستیش چندر رائے ہے۔ میں جگدیش پور گاؤں کا رہنے والا ہوں۔"

کھنج تقریباً اُچھل پڑا۔ اُس کے ہاتھ سے بانسری گر گئی، چہرے پر شدید حیرت کے آثار تھے۔ وہ ستیش کے چہرے کو تکے جا رہا تھا۔

"دیکھئے، بانسری ٹوٹ تو نہیں گئی؟" ستیش بولا۔

اس دوران میں کھنج نے خود کو سنبھال لیا اور پھر ستیش سے مخاطب ہوا۔ "جگدیش پور میں کیا آپ کا کوئی ہم نام بھی ہے؟"

"جی نہیں۔" ستیش نے جواب دیا۔ "ہاں لکھنؤ میں جہاں میں ملازمت کرتا ہوں، میرا ایک ہم نام رہتا ہے، میرے ہی محلے میں۔"

اب کھنج کو کوئی شک نہیں رہا۔ پھر بھی اُس نے مزید یقین کی خاطر دریافت کیا۔ "آپ کی سسرال کیا کالی گرام میں ہے؟"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" اس مرتبہ ستیش بھی چونک اُٹھا۔ اُس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

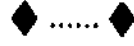
"ستیش بابو! آپ کے اس سوال کا جواب میں بعد میں دوں گا۔" کھنج کے لہجے سے خوشی جھلک رہی تھی۔ "اس وقت بھگوان کی دیا (مہربانی) سے عجیب وغریب حالات میں آپ ملے ہیں۔ اب میں آپ کو چھوڑوں گا نہیں۔ یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر میں ٹھہرا ہوں، آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"مجھے آپ کے ساتھ...... چلنا ہوگا؟" ستیش نے حیرت کا اظہار کیا۔ "مگر آپ مجھے اپنے ٹھکانے پر کیوں لے جا رہے ہیں؟"

"اس کیوں کا جواب آپ کو میرے ساتھ چل کر ہی ملے گا۔" کھنج دھیرے سے ہنس دیا۔

"آپ کون ہیں؟" ستیش نے سوال کیا۔

پھر کھنج اُسے اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔



ہرناتھ دو دن کے بعد ایک قریبی گاؤں سے واپس کالی گرام آ رہا تھا۔ اُسے ایک زمیندار نے مذہبی رسوم ادا کرنے کے لئے بلایا تھا۔ اُس کے پیچھے پیچھے دو آدمی آ رہے تھے۔ اُن کے سروں پر گٹھڑیاں تھیں۔ ان گٹھڑیوں میں زمیندار سے ملا ہوا سامان تھا۔

کڑی دُھوپ سے بچنے کے لئے ہرناتھ اپنے صفاچٹ سر پر بھیگا ہوا انگوچھا کئی تہیں کر کے رکھے ہوئے تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

چند ہی روز میں ہرناتھ کمزور سا دکھائی دینے لگا تھا۔ اُس کی کمر قدرے جھک گئی تھی، آنکھیں اندر کی طرف دھنس گئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے تھے۔ اس کا چہرہ دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے اندر آگ سی جل رہی تھی جس کی تپش چہرے سے عیاں تھی۔

بلاووں میں اب ہرناتھ کے لئے کوئی کشش نہیں رہ گئی تھی۔ وہ بہت مجبور کرنے ہی پر کہیں جاتا تھا۔ اس کا اصل مقصد اپنے غم زدہ دل کو بہلانا ہوتا تھا۔ ہرناتھ آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی۔ "یہ شہ...... اور یہ بات!"

سنائی دینے والی یہ آواز ہرناتھ کے لئے پسندیدہ نہیں تھی۔ ہرناتھ سمجھ گیا کہ ششی مکرجی کے گھر حسب معمول شطرنج کا اڈا جما ہوا تھا۔ اُس نے ششی ہی کی آواز سنی تھی۔

اُس نے نظر بچا کے نکل جانے کی غرض سے چھتری کو دائیں طرف جھکا لیا۔ کملا کے گم ہو جانے کے بعد اُس نے اچھی طرح جان لیا تھا کہ ششی مکرجی اُس کے بدخواہوں میں سے ہے۔ ششی کے منحوس چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ اندر سے سلگنے لگتا تھا۔ یوں جیسے کسی نے ان کے زخموں پر نمک چھڑک دیا ہو۔ ششی کی ایک ہی آنکھ سانپ کی طرح تیز تھی۔ ہرناتھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ اپنی چیختی سی آواز میں بولا۔ "ہرناتھ دادا!...... اپنے اس سیوک (خدمت گار) سے نظر بچا کر کہاں جا رہے ہو؟"

مجبوراً ہرناتھ رُک گیا۔ چھتری ہٹا کر اُس نے خشک لہجے میں کہا۔ "اس وقت تیز دُھوپ میں نہیں ٹھہروں گا، سیدھا گھر جاؤں گا۔"

ششی مکرجی اپنی جگہ سے اُٹھ کر ہرناتھ کے قریب پہنچ گیا اور کہنے لگا۔ ’’دادا! پیاس لگی ہو تو ڈاب (کچا ناریل) پی لو میرے ساتھ چل کر۔‘‘

’’گاؤں میں تو آ ہی گیا ہوں......‘‘ ہرناتھ نے کہا۔ ’’اشنان اور پوجا کرنا ابھی باقی ہے۔ سب سے فراغت پا کر ہی پانی پیوں گا۔‘‘ اُس نے آگے بڑھنا چاہا۔

’’رُک تو جاؤ دادا! ڈاب نہیں پیتے تو نہ پیو، ایک خبر ہی سنتے جاؤ۔‘‘

’’خبر کا نام نہ لو!‘‘ ہرناتھ نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ ’’اب میرے لئے اچھی اور بری دونوں خبریں برابر ہیں۔‘‘

ششی مکرجی کا سیاہ چہرہ مزید سیاہ ہو گیا، پھر وہ اپنے میلے دانت نکال کر بولا۔ ’’ہرناتھ دادا!...... اس طرح دنیا سے مایوس ہو جانا ٹھیک نہیں۔ میں واقعی کوئی خوشخبری سناؤں گا تو مجھے بھلا کیا کھلاؤ گے، بتاؤ!‘‘

ہرناتھ یہ سن کر شک میں پڑ گیا۔ اُسے خبر تھی کہ ششی بلاوجہ کوئی بات کرنے والا نہیں ہے۔ اچانک ہی اُس کی طرف سے یگانگت جتانے کی وجہ آخر کیا ہو سکتی ہے؟ یہ سوچتے ہوئے اُس نے تجسّس بھرے لہجے میں کہا۔ ’’ششی! تم کیا چاہتے ہو؟...... کیا تمہیں کملا کی کوئی خبر ملی ہے؟ اتنے دنوں سے میں جو چاہ رہا تھا، وہی ہوا۔ کیا کملا مر گئی؟ بولو، اس سے بڑھ کر اب میرے لئے کوئی خبر نہیں ہو سکتی۔‘‘

ششی مکرجی مصنوعی ہمدردی جتانے لگا۔ ’’یہ کیا کہہ رہے ہو دادا!...... باپ ہو کر بیٹی کے مرنے کی خواہش تو نہ کرو۔‘‘

ہرناتھ کا شک اور بڑھ گیا۔ اُس نے جلدی سے کہا۔ ’’ششی! تمہیں جو کہنا ہے، جلدی کہو۔‘‘

’’ارون، کملا کو لے کر کلکتے سے لوٹ آیا ہے۔‘‘ ششی مکرجی نے آخر بتا ہی دیا۔

ہرناتھ کو کچھ دیر کے لئے جیسے سکتہ سا ہو گیا۔ اسی عالم میں اس پر غصہ غالب آ گیا۔ اُس نے شعلہ بار آنکھوں سے ششی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’ارے مہا پاپی، کیا یہی خوشخبری ہے؟ تجھ پر بجلی گرے۔ تو تباہ و برباد ہو جائے!‘‘ یہ کہہ کر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

ششی کے گھر پر موجود افراد کے قہقہے جیسے ہرناتھ کا تعاقب کرنے لگے۔ درحقیقت یہ لوگ اس قدر ’’دلچسپ‘‘ ڈرامے کو بڑے تجسّس کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ ہرناتھ کو جاتے

دیکھ کر ان کے قہقہے نہ رُک سکے۔ انہی میں سے ایک شخص بولا۔ ’’اتنے دنوں تک دولت کی گرمی سے ہرناتھ کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے، لیکن اُسے یہ خبر نہیں ہو گی کہ دولت ہی دنیا میں سب کچھ نہیں، عزت بھی کوئی چیز ہے! بھلا بتاؤ ہرناتھ گھر جا کے کیا کرے گا؟ بیٹی کو گھر پر رکھے گا کہ نکال دے گا؟‘‘

’’لگتا تو یہی ہے کہ نکال دے گا۔‘‘ ششی مکرجی نے بے غیرتی سے ہنستے ہوئے کہا۔ ’’پھر بھی یقینی طور پر ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ گھر پہنچتے پہنچتے اُس کا غصہ ٹھنڈا پڑ جائے! پھر یہ کہ کچھ بھی ہو، ہے تو باپ۔ لڑکی کو دیکھ کر، اُس کا رونا دھونا سن کر دل پگھل جائے گا۔ خیر میں مالک کو یہ خبر دے آؤں۔‘‘

’’جا کر کیا کہو گے؟‘‘ کسی نے پوچھا۔

’’کہوں گا کہ ہرناتھ لوٹ آیا ہے۔‘‘ ششی مکرجی نے جواب دیا۔ ’’کملا کے آنے کی خبر زمیندار بابو کو پہلے ہی پہنچا دی ہے۔ وہ ہرناتھ کے گاؤں میں نہ ہونے کی وجہ سے اب تک اپنے غصے کو قابو میں کئے ہوئے تھے۔‘‘ یہ کہتے ہی وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

دوسری جانب ہرناتھ کسی تیز آندھی کی طرح گھر میں داخل ہوا۔ اُس کی بیوی نے کملا اور ارون کے سامنے کھانے کی تھالیاں رکھی ہی تھیں۔ ہرناتھ کو سب سے پہلے کملا نے دیکھا۔ فوراً روتی ہوئی آگے بڑھی اور پھر ہرناتھ کے پیروں سے لپٹ گئی۔

ہرناتھ کی بیوی خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات کی شدت میں بہہ کر رو پڑی اور بولی۔ ’’تمہاری کمل بھگوان کی کرپا (کرم) سے لوٹ کر آ گئی ہے۔‘‘

ہرناتھ کی حالت عجیب تھی۔ اُس نے ایک بار کملا کی طرف اور پھر بیوی کی جانب پاگلوں کی طرح دیکھا۔

’’ارون!‘‘ معاً ہرناتھ چیخ اُٹھا۔

ارون سہم گیا۔ یہی حال ہرناتھ کی بیوی کا ہوا۔ ہرناتھ کا غصہ پورے گاؤں میں مشہور تھا۔

’’تجھے کملا کہاں ملی؟‘‘ ہرناتھ نے ارون سے سوال کیا۔

’’کھنج بابو کے گھر میں۔‘‘ ارون نے خوفزدہ آواز میں جواب دیا۔

ہرناتھ نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔ ’’کھنج کون ہے؟‘‘

اروِن اس غصے سے بھرے ہوئے باپ کو مزید سوالوں کے جواب دینے سے قاصر تھا۔ اُس نے اسی لئے رحم طلب نظروں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

ہرناتھ کی بیوی تیزی سے اپنے شوہر کی طرف بڑھتے ہوئے کہنے لگی۔ ''اجی یہ بہت لمبا قصہ ہے۔ کملا اور اروِن کی زبان سے میں سب حال سن چکی ہوں۔ بات یہ ہے......''

اپنی بیوی کو ہرناتھ نے ڈانٹ دیا۔ ''تم چپ رہو جی! ان لوگوں کی جن باتوں پر تم نے اعتبار کرلیا ہے، ان پر گاؤں والے اعتبار نہیں کریں گے۔''

''کیوں؟'' ہرناتھ کی بیوی بھول پن سے پوچھ بیٹھی۔

''کیوں اعتبار نہیں کریں گے، یہ بھی کیا کھول کر کہنے کی بات ہے؟ اس کیوں کا جواب یہ ہے کہ لوگ تمہاری لڑکی کو بدچلن کہتے ہیں۔'' ہرناتھ نے کہا۔

اب تک کملا اپنے باپ ہرناتھ کے قدموں میں بیٹھی آنسوؤں سے زمین تر کر رہی تھی۔ باپ کی زبان سے خود کو بدچلن کہتے ہوئے سن کر وہ چوٹ کھائی ہوئی کسی ناگن کی طرح تیزی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بدچلنی کی تہمت اُس سے برداشت نہ ہوئی۔ وہ بول اُٹھی۔

''پتا جی! کیا تم مجھے ایسا ہی سمجھتے ہو؟ لوگوں کی اس بات پر تم بھی اعتبار کرتے ہو؟''

''ہوں!'' ہرناتھ نے ہنکارا بھرا۔

کملا کی دونوں آنکھوں سے جیسے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ اُس نے فخر کے ساتھ سر اُٹھا کر تیز لہجے میں کہا۔ ''تم بھی پتا جی..... تم بھی میرے باپ ہو کر ایسا..... مجھے ایسا جانتے ہو؟''

ہرناتھ نے حیرت سے کملا کو دیکھا۔ آج سے پہلے کملا نے کبھی ایسے لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود ہرناتھ کی کیفیت نہیں بدلی۔ اس کی بڑی وجہ وہ باتیں تھیں جو اُسے اب تک کملا کے بارے میں معلوم ہوئی تھیں۔ گاؤں کے زمیندار یوگیندر کے ساتھ وہ کلکتے گیا تھا۔ وہاں اُسے پتہ چلا تھا کہ کملا زمیندار کے نوجوان بیٹے سریندر کے ساتھ ٹرین میں بیٹھ کر پورب کی طرف گئی ہے۔ اس کے علاوہ کھیتج کون تھا؟ کملا اُس کے گھر میں کیوں تھی؟ اس سے بڑھ کر کملا کی بدچلنی کا اور کیا ثبوت ہوسکتا تھا! انہی ساری باتوں پر غور کرتے ہوئے وہ اچانک چیخ اُٹھا۔

''ہاں مجھے لوگوں کی باتوں پر یقین ہے۔ جو بات میں خود جا کے معلوم کر کے آیا ہوں، اس پر یقین نہ کروں تو اور کیا کروں؟ اتنے دنوں بعد تو یہاں کیوں آئی ہے؟ تو مر

کیوں نہ گئی! تو کیوں......''

''اب اور نہیں سن سکتی!'' کملا نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ ''بس بہت ہوگیا..... بھگوان! تو نے عورت کو اتنا مجبور کیوں بنایا ہے؟'' یہ کہتے ہوئے کملا کو غش سا آ گیا۔ وہ زمین پر گرنے ہی والی تھی کہ ماں نے جھپٹ کر اُسے سنبھال لیا۔

کملا کی یہ حالت دیکھ کر بھی ہرناتھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اُس نے کملا پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ دوسری طرف منہ پھیر کر اٹل لہجے میں اُس نے کہا۔ ''میرے گھر میں کلنکنی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہاں پر تیرا ایک گھڑی رہنا بھی ممکن نہیں..... چلی جا... ابھی چلی جا ورنہ...''

ہرناتھ کی بیوی بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ ''اجی، کیا تمہارے سینے میں دل کی جگہ کوئی پتھر ہے؟ ایسی بات زبان پر نہ لاؤ۔''

ہرناتھ نے ترش لہجے میں کہا۔ ''دیکھو جس قصور پر زمیندار نے اپنے اکلوتے بیٹے اور بیوی کو چھوڑ دیا، اسی ایک خطا کی گناہ گار عورت کو میں کس منہ سے اپنے گھر میں رکھ لوں؟''

''اچھا اگر باپ نے بیٹے کو چھوڑ دیا تو کیا ہوا؟ سماج تو ماں اور بیٹے کو خود سے الگ نہیں رکھے گا۔ پھر یہ کہ سریندر مرد ہے اور کملا ایک عورت ہے۔ اس صورت میں اگر تم اسے سہارا نہیں دو گے تو کون ایسے وقت پر اس کا سہارا بنے گا؟''

''کملا کو سہارا دینے والی بس ایک ہی ہستی ہے، یم راج۔ (ملک الموت) اگر کملا کے بدن میں میرے خون کی ایک بوند بھی ہے تو اسے ابھی جا کر یم راج کا آسرا لینا چاہئے۔'' یہ کہتے ہوئے ہرناتھ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

کملا نے یکایک خود کو ماں کی گرفت سے الگ کر کے باپ کی طرف دیکھا، پھر پُرسکون آواز میں بولی۔ ''اچھی بات ہے پتا جی، یہی ہوگا۔ تم سب نے مل کر میرے لئے جو آسرا طے کیا ہے، دیکھوں وہ یم راج مجھے قبول کرتا ہے یا نہیں!'' پھر کملا نے گھوم کر ماں پر نگاہ ڈالی اور دھیمی آواز میں کہا۔ ''ماں! اپنے داماد سے اگر کبھی تمہاری ملاقات ہو تو ان سے میری یہ آخری گزارش کر دینا کہ میں نے ان کی امانت میں خیانت نہیں کی۔'' یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے کملا کا گلا رندھ گیا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس پر بھی اپنے

جذبات پر قابو پاتے ہوئے وہ تیزی کے ساتھ گھر کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھی، لیکن دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی ٹھٹک کر رُک گئی۔

اچانک سریندر کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر صرف کملا ہی نہیں، سب ہی حیرت زدہ رہ گئے۔ وہ کملا کے سامنے کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ ''میں پہلے ہی جانتا تھا کہ ایسا ہی ہو گا۔ میں اسی وجہ سے کلکتے میں تمہیں الوداع کہہ کر سیدھا یہاں آ گیا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ تمہاری تلاش میں پہلے میں جگدیش پور گیا تھا، وہیں سے سارا حال سن کر یہاں آیا ہوں۔''

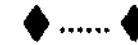
ہرناتھ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کہ سریندر اس طرح ہمت کر کے اس کے گھر میں قدم رکھ سکتا ہے۔ ایسا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا، خاص طور پر ایسے حالات میں جبکہ کملا کے ''اغوا'' میں بھی ملوث تھا۔ ایک تو شدید گرمی اور بھری دوپہر میں وہ لمبے سفر سے لوٹا تھا۔ سفر میں وہ پیدل چلا تھا جس کی وجہ سے اُس پر تھکن غالب تھی۔ اس کے علاوہ وہ بھوکا پیاسا بھی تھا۔ اس پر یہ اشتعال انگیز صورتحال وہ برداشت نہ کر سکا اور بے قابو ہو گیا۔

''نہیں!'' ہرناتھ اچانک چیخ اُٹھا۔ ''اب میں اور برداشت نہیں کر سکتا۔ ہے بھگوان! مجھے اس اگنی پریکشا (آگ کے امتحان) سے چھٹکارا دے۔ پربھو! میرے حال پر دیا کر!'' یہ کہتے ہوئے وہ زمین پر بیٹھ گیا اور دونوں گھٹنوں میں اپنا سر چھپا لیا۔

عین اسی وقت کسی نے سنجیدہ لہجے میں دروازے کی طرف سے پکارا۔ ''ہرناتھ گھر میں ہیں؟''

ہرناتھ پتھر کے کسی مجسمے کی طرح جہاں تھا، وہیں بیٹھا رہا۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

سریندر نے کملا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''یہ آواز میرے پتا جی کی ہے۔''



کھیتج کے ٹھکانے سے نکل کر ستیش سڑک پر آ کھڑا ہوا۔ اس وقت رات بہت گزر چکی تھی۔ سناٹے میں وہ خود سے اُلجھتا رہا۔ اُس کی سماعت میں کھیتج کے الفاظ گونج رہے تھے۔ کھیتج نے اُسے کملا کے بارے میں ساری حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا۔ اُس کے دل کا ایک پہلو جیسے خوشی سے بھر گیا، دوسرے پہلو میں کئی وسوسوں نے جنم لے لیا۔ اُسے اپنی ماں کی بات یاد آ گئی۔ ''دیکھ بیٹا، ہزار ان پڑھ کیوں نہ ہو ماں، ماں ہی ہوتی ہے۔ وہ اپنی اولاد کے دُکھ کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔'' وہ شروع سے کہہ رہی تھی کہ گمنام خط پر یقین کر کے اس نے حماقت کی ہے۔

ستیش اس جگہ زیادہ دیر کھڑا نہ رہ سکا اور دھیرے دھیرے تاج محل کی طرف بڑھتے ہوئے اس جگہ پہنچ گیا جہاں کھیتج سے ملاقات ہوئی تھی۔ دُور جمنا کا پانی لہریں لے رہا تھا۔ دریا کے کنارے چمکیلی ریت پر چاندنی جیسے اُسی کی طرح جاگ رہی تھی۔ اس کے اوپر سے ایک چمگادڑ اُڑتا ہوا گزر گیا۔ وہ کملا کے بارے میں سوچنے لگا، کملا اُس کی ماں کے بیمار ہونے کا سن کر دنیا داری اور بدنامی کی پرواہ نہ کر کے اس کی خدمت کرنے دوڑ گئی ہے وہ؟...... وہ بزدل ہے۔ اُس کی آنکھوں میں کملا کا حسین چہرہ گھومنے لگا۔ ستیش کے دل میں محبت جاگ اُٹھی۔ جذبات کی شدت کے سبب اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ اُسے محسوس ہوا کہ اس کا سب سے اہم فرض ماں کی خدمت کرنے میں کملا کا ہاتھ بٹانا ہے۔ پھر وہ غیر ارادی طور پر بڑبڑانے لگا۔ ''کملا! مجھے تم پر اعتبار کرنا چاہیے تھا۔''

اسی وقت چوکیدار کی بلند آواز سنائی دی۔ ''ادھر کون بیٹھا ہے؟''

ستیش نے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں جواب دے کر چوکیدار کو بتایا کہ وہ ایک مسافر ہے۔

''بابو جی! کیا آپ بانسری بھی بجاتے ہیں؟'' چوکیدار نے پوچھا۔

ستیش نے دیکھا، کھیتج کی بانسری اب تک وہیں پڑی تھی۔ وہ بھول میں بانسری بھی

وہیں چھوڑ گیا تھا۔ ستیش نے بانسری اٹھالی اور کھتج کے بارے میں سوچنے لگا، کھتج ایک نیک دل شخص ہے جو اس نے کملا کی جان بچالی۔ اتنا ہی نہیں میری امانت مجھے سونپنے کے لئے بھاری رقم خرچ کر کے لکھنؤ تک دوڑا گیا، مگر میرا نصیب، میں وہاں نہ تھا۔ میرے نصیب میں شاید اسی طرح بھٹکنا تھا۔

معاً ستیش کا دل کملا کے لئے مچل اٹھا۔ اُسے خیال آیا کہ اب کملا کے پاس پہنچنے میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ آج رات ہی وہاں سے روانہ ہو جائے گا۔ ستیش تیزی کے ساتھ اس ہوٹل کی طرف چل دیا جہاں ٹھہرا ہوا تھا۔

ہوٹل اوسط درجے کا تھا۔ اس کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ دستک دینے پر چوکیدار نے دروازہ کھولا اور بولا۔ ''بابو جی! آج بہت دیر کر دی آپ نے!''

''یہ بتاؤ اس وقت کوئی گاڑی مل جائے گی؟ اگر لا سکے تو انعام دوں گا۔'' ستیش نے کہا۔

''جو حکم۔'' کہہ کر چوکیدار گاڑی کی تلاش میں نکل گیا۔

اُس کے پاس زیادہ سامان نہیں تھا۔ یوں بھی وہ تیاگ پر نکلا تھا اور صرف انتہائی ضروری سامان ہی ساتھ لیا تھا۔

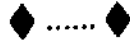
ہوٹل کے منیجر کو جگانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ عموماً دن کے وقت سوتا اور رات کو جاگتا تھا۔ اپنی دانست میں وہ اس طرح ہوٹل کی حفاظت کرتا تھا۔ وہ شکی مزاج تھا۔ اُسے شک رہتا تھا کہ کہیں ہوٹل میں ٹھہرنے والا کوئی مسافر بغیر چیکنگ کے سامان لے کر فرار نہ ہو جائے۔ ہر چند کہ اس ہوٹل میں کوئی ایسی قیمتی چیز نہیں تھی جسے کوئی لے جا سکتا، پھر بھی شک تو شک ہوتا ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔

ستیش کو وہ منیجر محض خیالی آدمی سمجھتا تھا، ایک ایسا آدمی جو ہمیشہ خواب دیکھتا ہو۔ ہوٹل کا دروازہ کھلتے ہی منیجر اپنی عادت کے مطابق فوراً اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے کمرے سے وہ باہر آیا تو ستیش پر نگاہ پڑی اور کہنے لگا۔ ''کیوں صاحب! اتنی دیر کہاں تھے؟''

اپنے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے ستیش نے جواب دیا۔ ''ایک دوست سے ملنے گیا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا اور مختصر سا سامان سمیٹنے لگا۔

اس دوران میں چوکیدار گاڑی لے آیا۔ ہوٹل کا حساب چکتا کر کے وہ باہر نکلا۔

چوکیدار پہلے ہی اُس کا سامان گاڑی میں رکھ چکا تھا۔



سریندر کی آواز سن کر زمیندار یوگیندر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ ہرناتھ کے گھر میں قدم رکھتے ہی وہ تقریباً چیخ اُٹھا۔ ''پاجی، نالائق، بدمعاش! تو یہاں کیا کر رہا ہے؟''

اپنے باپ کے غصے سے سریندر خوب واقف تھا۔ اُس نے پہلے ہی سے خود کو کسی ایسے وقت کے لئے ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔ اُسے علم تھا کہ کسی نہ کسی روز باپ کے غصے کی شدت کو برداشت کرنا پڑے گا۔ وہ اسی لئے اپنے باپ کو کوئی جواب دیئے بغیر زمین کی طرف دیکھنے لگا۔ واضح طور پر پتہ چل رہا تھا کہ وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ چہرے سے اُس کی قوتِ ارادی بھی ظاہر ہو رہی تھی۔

بیٹے کو خاموش دیکھ کر یوگیندر کا غصہ کم ہونے کی بجائے اور بڑھ گیا۔ اُس نے ہرناتھ کی طرف مُڑ کر تیز آواز میں کہا۔ ''اس گدھے کو تم نے زنانے میں کیوں گھسنے دیا!......اسے ابھی جوتے مار کر باہر نکال دو...... پل بھی دیر نہ کرو!......ابھی نکالو۔''

سریندر نے نظر اُٹھا کر اپنے باپ کی طرف دیکھا اور پھر کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''پرائے گھر میں گھسنا اگر گناہ ہے تو اکیلا میں ہی خطاوار نہیں ہوں۔''

زمیندار یوگیندر اس طرح کی کوئی بات سننے کا عادی نہیں تھا۔ وہ اسی لئے بیٹے کی زبانی یہ بات سن کر سکتے میں آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اُسے یہ خیال آ گیا کہ بیٹے کے ذریعے یوں بے عزت نہ ہونے کی کوئی سبیل اس کے پاس نہیں تھی۔

عین اسی وقت کملا بول اُٹھی۔ ''کاکا!''

یوگیندر نے ایک مرتبہ اُس کے چہرے پر نظر ڈال کر چہرہ دوسری طرف گھما لیا۔ اس سے یوگیندر کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ کملا جیسی ''گناہگار'' سے وہ بات کرنے کا روادار نہیں۔ زمیندار کے چہرے سے روایتی سختی کا اظہار ہو رہا تھا۔

کملا نے یوگیندر کے جواب کا انتظار نہ کیا۔ وہ بلا تامل اور بے جھجک بولی۔ ''آپ لوگ بھاری غلطی کر رہے ہیں کہ حقیقت جانے بغیر ہی سریندر کو گناہگار مان رہے ہیں۔ ہم دونوں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ اگر دھرم (مذہب) اور سچائی کے لئے آپ لوگ تلاشی ہوں تو واضح طور پر جان جائیں گے کہ فضول کا شک کر کے اچھا نہیں کیا۔ مجھے یقین ہے

ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب آپ کی غلط فہمی دُور ہو جائے گی۔ اس دن آپ بہت پچھتائیں گے اور......"

ہرناتھ اب اور برداشت نہ کر سکا۔ اُس نے جھپٹ کر کملا کی گردن دبوچ لی اور اُسے گھسیٹتا ہوا گھر سے باہر لے آیا۔

"حرام زادی!" ہرناتھ کسی درندے کی طرح غرایا۔ "اتنے دنوں میں تو ناٹک کرنا بھی سیکھ آئی ہے! میرے گھر میں تیرے لئے کوئی جگہ نہیں...... دفع ہو جا!" ہرناتھ نے یہ کہہ کر کملا کو دھکا دیا اور زور سے گھر کا دروازہ بند کر لیا۔

اس دوران میں سبھی کی توجہ ہرناتھ پر مرکوز تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کسی کو پتہ نہ چل سکا سریندر کب وہاں سے چلا گیا۔

زمیندار یوگیندر پھر کچھ نہ بولا اور اپنے گھر لوٹ گیا۔

کچھ دیر کملا گھر کے باہر دروازے پر پڑی رہی۔ خود کو بے سہارا پا کر وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔ آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔

ذرا فاصلے پر ایک اُجاڑ جنگل تھا۔ کملا اس جنگل کے ایک ویران گوشے میں جا بیٹھی۔ اب اسے کیا کرنا چاہئے؟ یہ فیصلہ کرنا محال ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنے پیدا کرنے والے سے دھیان لگایا۔ پھر اُس کے ہونٹ جیسے خود بخود حرکت کرنے لگے۔ "سنتی ہوں کہ تو سب کی سنتا ہے۔ سو میری بھی سن! مجھے بھی تو ہی راستہ دکھا! میں ایک بے بس عورت ہوں اور کچھ نہیں جانتی۔" یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے کملا کے ذہن میں ایک خوفناک خیال آیا۔ اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے، دل میں ہلچل سی مچ گئی۔ اُسے خودکشی کا خیال آیا۔ اُس نے سوچا، نہیں میں..... میں یہ قدم نہیں اٹھا سکتی۔ سنا ہے خودکشی کرنے والوں کی رُوح جگ جگ تک اذیتوں کا شکار رہتی ہے۔ میں..... میں خودکشی کیوں کروں؟... میں نے کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ میرے دامن پر کوئی داغ نہیں، ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں۔ مگر بانس کے اس جنگل میں بیٹھ کر میرے لئے ساری زندگی گزارنا ممکن نہیں۔ کوئی نہ کوئی سبیل تو کرنی ہو گی۔

کملا کو کوئی آسرا درکار تھا۔ وہ دوبارہ سوچ میں گم ہو گئی۔ اگر ستیش اُس کے ساتھ ہوتا تو کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ اُس کی طرف اُنگلی اُٹھا سکتا۔

اپنے شوہر ستیش کے بارے میں سوچتے ہوئے کملا کو خیال آیا کہ وہ سنیاسی کیوں بن گیا؟

"آدمی کو سمجھنا اور اس کے دُکھوں کو جاننا کس قدر مشکل ہے!" کملا پھر بڑبڑانے لگی۔ پھر وہ خود ہی خاموش ہو گئی اور دونوں گھٹنوں کے درمیان سر رکھ لیا۔ وہ اب سریندر کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اُس کے باپ نے اسے بھی تو چھوڑ دیا ہے! وہ بھی تو اکیلا رہ گیا ہے۔ مگر وہ مرد ہے، سماج سے لڑ سکتا ہے۔ سب کو تو باپ کے ورثے میں جائیداد نہیں ملتی۔ سو اگر سریندر اس سے محروم ہو جائے گا تو کیا؟ سب کے باپ تو مالدار یا زمیندار نہیں ہوتے۔

کملا مردوں کے عیش و آرام کا موازنہ اپنے دُکھوں سے کرنے لگی۔ معاً اُسے اپنے گھر کے پاس ہی موجود تالاب دکھائی دیا۔ چھوٹے سے اس تالاب کے کنارے ایک سیاہ فام شخص آ کھڑا ہوا۔ اُس کے انداز و اطوار سے پتہ چل رہا تھا جیسے اُسے کسی شے کی تلاش ہو۔ وہ شخص...... وہ سیاہ رو کون ہو سکتا ہے، کملا کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ پھر کملا نے تالاب کے کنارے اُس شخص کی موجودگی کا سبب بھی جان لیا۔ یقیناً وہ کالا شیطان یہ دیکھنے آیا تھا کہ کتنی دیر میں کملا کی لاش پانی پر تیرتی نظر آتی ہے! وجہ یہ کہ اُسے مکمل یقین ہو گا کہ گھر سے نکالے جانے کے بعد کملا ڈوب مری ہو گی۔ وہ سانس روکے چپ چاپ بیٹھی رہی۔ کالا شیطان ششی مکرجی جنگل سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ پھر ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی ششی مکرجی کی منحوس آواز اُسے سنائی دی۔ آواز دھیمی تھی اور کچھ الفاظ واضح بھی نہیں تھے، پھر بھی کملا نے اندازہ لگا لیا کہ وہ شیطان کیا کہہ رہا تھا! ششی مکرجی خود کلامی میں مبتلا تھا کہ کملا کی لاش کل تک پانی پر تیرتی دکھائی دے گی۔ پھر وہ شیطان وہاں سے چلا گیا۔

دیکھتے دیکھتے شام ہو گئی۔ بانسوں کے جنگل میں اب جھینگر بولنے لگے۔ شام نے رات کو اپنے گلے سے لگایا تو کملا کی آنکھوں میں نیند جال بُننے لگی......!



ستیش کو آگرے سے روانہ ہونے کے لئے ایک سست رفتار پسنجر ٹرین ملی۔ پنجرے میں قید کسی پنچھی کی طرح ستیش خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا۔ وہ ٹرین مختلف چھوٹے

چھوٹے اسٹیشنوں پر رُکتی ہوئی تیسرے پہر مغل سرائے ریلوے اسٹیشن پر پہنچی۔

مغل سرائے ہی سے ایک ادھیڑ عمر عورت، ستیش کی ہم سفر بن گئی۔ وہ چہرے اور حلیے سے کوئی بنگالن ہی معلوم ہوتی تھی۔

''تم کہاں جاؤ گے؟'' اُس عورت نے ٹرین چلنے کے بعد ستیش سے پوچھا۔

''میں بردوان کے قریب اُتروں گا۔'' ستیش نے جواب دیا۔ ''وہاں سے مجھے جگدیش پور جانا ہے۔''

عورت چونک کر بولی۔ ''جگدیش پور جاؤ گے؟...... مجھے بھی وہاں کا خیال آتا ہے، بڑا دُکھ ہوتا ہے۔ اُس گاؤں میں میری دُور کے رشتے کی ایک موسی رہتی ہے۔ ان کا بیٹا بڑا سیانا اور کماؤ ہے۔ بے چاری موسی اپنی بدقماش بہو کی وجہ سے برباد ہوگئی۔ بسا بسایا گھر اُجڑ گیا۔ بدذات بہو اپنے باپ کے گھر گئی تھی، وہاں زمیندار کے بیٹے سے منہ کالا کر کے بھاگ گئی۔ یہ خبر سن کر موسی کے بیٹے نے دنیا تیاگ دی اور نہ جانے کدھر نکل گیا!...... ہائے ہائے موسی کی تقدیر ہی پھوٹ گئی۔ کیسا لائق بیٹا تھا! سنا ہے اُس کی تنخواہ پانچ سو روپے تھی۔ سب چھوڑ چھاڑ کر وہ چلتا بنا۔ مردوں کے دل بھی کمال ہیں۔ وہ لڑکا اپنی بے وفا عورت کو بہت چاہتا تھا مگر اُس کمینی نے قدر نہ کی۔ لڑکے کی بے وقوفی تھی کہ ایک عورت کے لئے سب کچھ چھوڑ دیا، بوڑھی ماں کا بھی خیال نہیں کیا۔ سنتی ہوں اس کی عورت بہت ہی خوبصورت تھی۔ ہزاروں میں ایک تھی وہ!...... میں کہتی ہوں، ہوگی خوبصورت، بھاڑ میں جائے۔ وہ سونا کس کام کا جس سے کان پھٹ جائے! بنگال میں ایسی حسین عورتوں کی کوئی کمی تو نہیں، ڈھیروں مل جاتی ہیں...... مگر پانچ سو روپے کی نوکری کہاں ملتی ہے؟''

وہ عورت اُسی کی کہانی اُسے سنا رہی تھی۔ ستیش سمجھ گیا کہ وہ عورت اُس کی کوئی دُور کی رشتے دار ہے۔ اُسے صرف نوکری چھوڑنے کا رنج تھا۔

''آپ اتنے عرصے سے کاشی میں رہتی ہیں جیسا کہ بتا چکی ہیں۔'' ستیش نے کہا۔ ''پھر یہ ساری باتیں آپ کو کیسے معلوم ہوئیں؟''

''اپنوں کی خیر خبر تو رکھنی ہی پڑتی ہے۔ کسی نہ کسی سے تو پتہ چلتا ہی رہتا ہے۔ کاشی میں میری ملاقات جگدیش پور کی ایک عورت سے ہوئی تھی جو تیرتھ یاترا کے لئے نکلی تھی۔

اُسی سے مجھے ساری باتیں پتہ چلی تھیں۔'' عورت نے بتایا۔

گاڑی ٹھیک چار بجے بردوان پہنچنی تھی، مگر دو گھنٹے لیٹ ہوگئی۔ دن بالکل ہی ڈھل گیا۔ ستیش کے ساتھ ہمسفر عورت بھی وہیں اُتر گئی۔ بیل قلی ریلوے اسٹیشن سے ستیش نے ایک قلی کیا اور جگدیش پور کے لئے روانہ ہوگیا۔ اُسے یقین تھا کہ کملا گھر میں موجود ہوگی اور اُس کی بیمار ماں کی تیمارداری کر رہی ہوگی۔ اسی کے ساتھ ستیش کے دل میں طرح طرح کے اندیشے بھی پیدا ہو رہے تھے۔ کہیں اس کی غیر موجودگی میں ماں نے کملا کو گھر سے نہ نکال دیا ہو!

جب ستیش گاؤں پہنچا تو کافی رات ہو چکی تھی۔ اس وقت راستے میں کسی سے ملاقات ہونے کا امکان نہیں تھا۔ گھر کے سامنے پہنچ کر اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ قلی کے کئی مرتبہ زور زور سے پکارنے پر دُرگا دیوی نے آ کر دروازہ کھولا۔

ستیش کو اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر دُرگا دیوی کو جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ قلی کو پیسے دے کر ستیش نے روانہ کیا اور دُرگا دیوی کے ساتھ گھر میں داخل ہوگیا۔ پھر اس سے پہلے کہ ستیش، کملا کے بارے میں کچھ پوچھتا، دُرگا دیوی نے روتے ہوئے جو قصہ سنایا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ کالی ناگن (کملا) آئی تھی۔ دُرگا دیوی کے کچھ نہ کہنے پر بھی دماغ دُکھا کر باپ کے گھر چلی گئی۔ اُس نے کملا کو بہت روکا مگر وہ نہ رُکی۔

ماں کی بات سن کر ستیش نے بھلا یا برا کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ گھر سے نکل کر اسی وقت کالی گرام کی طرف چل دیا۔

سفر کے سبب وہ پہلے ہی سے بہت تھکا ہوا تھا، اس پر پیدل چل کر جلد ہی تھکن غالب آ گئی۔ وہ بھوکا بھی تھا۔ چلتے چلتے آخر تھک کر وہ نیم کے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا۔ چاروں طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور کچھ فاصلے پر کالی گرام دکھائی دے رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے کچھ دیر تک بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے اٹھنا چاہا تو اسی وقت اُسے راستے پر کوئی ڈرتے ڈرتے جاتا نظر آیا۔ یہ کوئی عورت معلوم ہوتی تھی۔ عورت اُس سے زیادہ دُور نہیں تھی۔ ستیش راستے سے ہٹ کر بیٹھا تھا۔ چنانچہ اُس عورت نے اُسے نہیں دیکھا۔ ستیش اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کے قدموں تلے کچھ خشک پتے پڑے ہوئے تھے۔ ان پتوں کی چرمر کر وہ عورت قدرے ٹھٹکی۔ ستیش کے ذہن میں اچانک خیال آیا، یہ کہیں کملا تو

نہیں؟ یہ خیال آتے ہی ستیش نے اُسے نام لے کر پکارا۔

یہ آواز سنتے ہی عورت کے قدم لڑکھڑائے اور پھر وہ گر پڑی۔ اُس کے حواس گم ہو چکے تھے۔ وہ واقعی کملا تھی۔

ستیش جھپٹ کر وہاں پہنچا اور بے ہوش کملا کا سر اپنی گود میں لے کر بیٹھ گیا۔ کملا کی یہ حالت دیکھ کر ستیش کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔

خود پر قابو پانے کے بعد ستیش کو فکر ہوئی کہ کملا کو کس طرح ہوش میں لایا جائے! اُس نے اپنی چادر لپیٹ کر تکیہ بنایا اور اس پر آہستہ سے کملا کا سر رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ کہیں سے پانی لانے کے لئے اُٹھنے لگا۔ عین اسی وقت بادل کا وہ ٹکڑا جو چاند کو ڈھانپے ہوئے تھا چھٹ گیا۔ ایک بے خودی کے سے عالم میں کملا کے حسین چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے ستیش پھر بیٹھ گیا۔

یہ وہی کملا تو تھی جس کے پھولوں جیسے کومل چہرے کو تالاب کے گھاٹ پر دیکھ کر وہ مست ہو گیا تھا۔ کملا اب بھی بالکل ویسی ہی تھی۔ کملا کے گلابی ہونٹوں کی کشش سے بیراگی ستیش کی گردن رفتہ رفتہ نیچے جھکنے لگی۔ اُس کی من بینا کے تار ایک ساتھ بج اُٹھے۔

اسی لمحے بے ہوش کملا کے جسم میں حرکت ہوئی۔ خوابوں میں کھوئے ستیش کو جیسے ہوش آ گیا۔ کملا کو اُس نے آنکھیں کھولتے ہوئے دیکھا۔

''کملا!'' ستیش نے اُسے دھیمی آواز میں پکارا۔

فوری طور پر کملا کچھ نہ کہہ سکی۔ لگتا تھا اُس میں بولنے کی طاقت نہ ہو۔ اُس کی کھلی ہوئی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''رومت کملا! میں کھیتج بابو کی زبانی سب کچھ سن چکا ہوں۔'' ستیش نے تسلی دی۔

کملا بول اُٹھی۔ ''سن چکے ہو!... بھگوان کرے ایسی مصیبت دشمن کو بھی نصیب نہ ہو۔''

پھر کملا آہستہ آہستہ اُٹھ بیٹھی اور اپنے کلکتے کے سفر کی کہانی بیان کرنے لگی۔ ستیش دل ہی دل میں کملا کی روداد کا موازنہ کھیتج کے بیان سے کرنے لگا۔ دونوں کی یکسانی سے وہ خوش ہو گیا۔ اُسے کملا پر شک کرنے سے ندامت محسوس ہوئی اور بولا۔ ''رہنے دو کملا! میں یہ تمام قصہ سن چکا ہوں۔''

''تو تم...... تم مجھ سے نفرت نہیں کرتے؟'' کملا نے کسی قدر جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھ

پر تمہیں یقین ہے؟''

''بالکل یقین ہے۔ ورنہ آگرے سے کالی گرام تک دوڑا ہوا نہ آتا۔'' ستیش نے کہا۔

کملا کو محسوس ہوا جیسے وہ پھر سے جی اُٹھی ہے، اسے اس کا حق مل گیا ہے۔ وہ بولی۔ ''آگرے سے ابھی آ رہے ہو تو اس کا مطلب ہے تم نے کچھ کھایا پیا نہیں!''

''کھا پی لوں گا۔ تم نے کچھ کھایا پیا ہے؟...... مجھے تو بھوکی لگتی ہو...... کیوں؟''

کملا خاموش رہی۔ پھر ستیش نے کملا کو گمنام خط ملنے سے لے کر اب تک پیش آنے والے تمام واقعات سے مختصراً آگاہ کر دیا۔ کملا نے یہ سب سن کر ستیش کے قدموں کی دھول اپنے ماتھے پر لگاتے وقت اشکوں سے اُس کے پیروں کو بھگو دیا۔ پھر اُس نے خود پر قابو پا کر کہا۔ ''تمہاری اس بات سے مجھے بہت خوشی محسوس ہوئی کہ تمہیں مجھ پر اعتبار ہے۔ میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اب اگر میں مر بھی جاؤں تو پرواہ نہیں۔''

''جانے دو ان باتوں کو۔'' ستیش کہنے لگا۔ ''چلو گھر چلیں۔''

کملا کا دل دھڑک اُٹھا۔ اُس نے کہا۔ ''گھر؟...... گھر میں کیا ماں مجھے جگہ دے گی؟''

''اگر وہ مجھے جگہ دے گی تو تمہیں بھی انکار نہیں کرے گی۔'' ستیش نے جواب دیا۔

''میں نے سنا تھا، تم ماں کی بیماری کا حال سن کر اُس کے پاس گئی تھیں، پھر کیا ہوا؟'' ستیش نے دریافت کیا۔

کملا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

چاندنی میں ستیش نے کملا کی آنسو بھری آنکھوں کو دیکھ کر کہا۔ ''سمجھ گیا میں۔ ماں نے تمہاری خدمت قبول نہیں کی۔ خیر...... وہ سب اب ٹھیک ہو جائے گا۔ دراصل بات یہ ہے کہ پاس پڑوس کی عورتوں کی باتیں سن کر ماں کا مزاج بدل جاتا ہے۔ ایسی ہی عورتوں کے بہکائے میں آ کر وہ تم جیسی عمر کی کوئی لڑکی دیکھ کر میری دوسری شادی کرنے کے لئے آمادہ تھیں۔ اس کی وجہ تمہارے ہاں کوئی اولاد نہ ہونا انہوں نے بیان کی۔ تم بالکل نہ گھبراؤ...... کوئی فکر نہ کرو...... اب چلو، چل سکو گی نا؟''

کملا نے زبان سے تو کہہ دیا کہ چل سکے گی، لیکن جب وہ گاؤں کی طرف چلنے لگی تو اُس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ پھر بھی جیسے تیسے وہ ستیش کا ساتھ دیتی رہی۔

دھتورے کے جنگل میں جگنو آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ جھینگروں کی آوازیں بھی

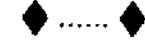
مسلسل سنائی دے رہی تھیں۔ ہوا میں مولسری کے پھولوں کی مہک بسی ہوئی تھی۔ وہ دونوں بے خوف سڑک پر چلے جا رہے تھے۔ کملا کو اس وقت شادی کی رات یاد آ رہی تھی۔ اس وقت بھی ایسی ہی چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ وہ بھی ایسی ہی خوشی کی رات تھی۔ کملا نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے ستیش سے کہا۔ ''مجھے ہر شے نئی نئی سی لگ رہی ہے۔''

''ہاں۔ مجھے بھی یوں محسوس ہو رہا ہے کہ میرا نیا جنم ہوا ہے۔'' ستیش تائید میں بولا۔

معاً کملا نے چونک کر ستیش کو مخاطب کیا۔ ''سنو! کسی کے گانے کی آواز آ رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی کے پہیوں کی صاف آواز بھی سنائی دے رہی ہے۔''

ستیش نے کان لگا کر سنا اور بولا۔ ''واقعی کوئی گاڑی آ رہی ہے۔''

کچھ ہی دیر میں گاڑی اُن کے قریب پہنچ گئی۔ گاڑی بان کی بڑی منت سماجت کرنے کے بعد وہ کملا کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔



بنا قصور کے بدنامی برداشت کر کے سریندر کا دل بہت دنوں سے بغاوت پر آمادہ ہو رہا تھا۔ آج جب اُس کے باپ زمیندار یوگیندر نے سب کے سامنے اسے بے عزت کیا تو وہ بھڑک ہی اُٹھا۔ بارود کو جیسے کسی نے چنگاری دکھا دی۔ اُس کی نس نس میں جیسے بجلی دوڑ گئی۔ اس کیفیت نے اُسے بے چین کر دیا۔ اُس کے تن بدن میں گویا آگ لگ گئی۔ اس کے باوجود اپنی تربیت کے سبب وہ اندر ہی اندر سلگ کر رہ گیا۔ ہونٹ بھینچ کر غصے میں کانپتا ہوا وہ وہاں سے چل دیا۔ اب تک وہ کسی بات کی پرواہ کئے بغیر ساری بے عزتی سہتا چلا آ رہا تھا، لیکن اب اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

کملا کے گھر سے نکلتے ہوئے اچانک اُسے ششی مکرجی کا خیال آ گیا۔ اُس نے سوچا، وہی جھوٹا فساد کی جڑ ہے۔ ششی مکرجی سے جواب طلبی ہی کی خاطر وہ اپنی حویلی ہی میں قائم زمیندار کے دفتر تک پہنچ گیا۔ وہاں پتہ چلا کہ ششی مکرجی طبیعت خراب ہونے کی وجہ بتا کر دفتر سے چلا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ نوکر نے سریندر کو بتا دیا کہ طبیعت خراب ہونا تو محض ایک بہانہ ہے، ششی بھلا چنگا ہے۔ دراصل رات کی گاڑی سے علاقے کا مجسٹریٹ، کالی گرام کا دورہ کرنے آ رہا تھا۔ اس بنا پر زمیندار کے ملازموں کو زیادہ دوڑ دھوپ کرنی پڑے گی۔ ششی ہمیشہ محنت سے جی چراتا تھا۔ اُسے بس کھڑے کھڑے

چاپلوسی خوب آتی تھی۔ وہ اسی لئے طبیعت خراب ہونے کا بہانہ کر کے کھسک گیا تھا۔ سریندر نے ساری بات سنی، پھر وہاں سے ششی کے گھر چل دیا۔

تین مرتبہ اُس نے ششی کو پکارا۔ وہ گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ ایک کھڑکی جس پر پھول کی بیل بنی ہوئی تھی، فوراً بند ہو گئی۔ کسی نے جواب نہیں دیا لیکن سریندر نے کھڑاؤں کی واضح آواز سن لی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس وقت ششی گھر ہی میں ہے۔ اُس نے اسی خیال سے بلند آواز میں پکارا۔ ''ششی!...... جاگ رہے ہو یا سو گئے؟ گھر میں ہو یا نہیں؟ جواب دو!''

بہت چیخنے چلانے پر ایک ننگ دھڑنگ لڑکا آم رس کا ٹکڑا چاٹتا ہوا باہر نکلا۔

''تیرا باپ کہاں ہے؟'' سریندر نے لڑکے سے پوچھا۔ لڑکے نے جب بتایا کہ ششی مکرجی گھر پر نہیں تو اُسے ڈانٹا۔ لڑکے نے بھاگ کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ اس ''فتنے'' نے بھانپ لیا تھا کہ سریندر اُسے پکڑنا چاہتا ہے۔ اس پر سریندر کو غصہ آ گیا۔ اُس نے دروازے پر لات مار کر کہا۔ ''کب تک مجھ سے چھپو گے!''

کچھ دیر سریندر گھر کے سامنے آم کے پیڑ تلے کھڑا رہا۔ سورج ڈوب گیا تو وہ ششی کے دروازے پر ایک اور لات مار کر تیزی سے بڑی سڑک کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ذرا ہی دُور چلا تھا کہ کسی نے پیچھے سے پکارا۔ ''سریندر دادا!''

سریندر چونک اُٹھا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ارون آ رہا تھا۔

''کیا ہے ارون؟'' سریندر نے پوچھا۔

''سریندر دادا! تم نے ادھر دیدی کو تو نہیں دیکھا؟ میں اُنہی کی تلاش میں ہوں۔'' ارون نے جواب دیا۔

''کیوں، کیا کملا گھر پر نہیں ہے؟'' سریندر نے سوال کیا۔

ارون نے بجھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''نہیں، گھر میں نہیں ...... باپو نے انہیں نکال دیا ہے...... ہم لوگوں میں سے کسی کو تلاش کرنے نہیں جانے دیا۔ باپو جب گھر سے باہر گئے تو میں دیدی کو تلاش کرنے نکلا ہوں لیکن وہ مجھے نہیں ملیں۔ وہ......'' ارون کی آواز بھرا گئی۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد ارون پھر بولا۔ ''دیدی مکلے، پاس پڑوس کسی کے ہاں نہیں جا سکتیں...... ہاں جنگل، باغ، کالی کے مندر وغیرہ سبھی جگہ میں اُنہیں دیکھ

آیا ہوں، وہ کہیں نہیں۔"

"کسی قصور کے بغیر کملا کو سزا دی گئی ہے۔" سریندر نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"کہیں وہ اسٹیشن کی طرف تو نہیں گئی؟ چلو اُدھر دیکھتے ہیں۔"

"اسٹیشن کی طرف باپو گئے ہیں۔ ریل لائن پار کسی کو اپنے مُردے کے لئے دان (خیرات) دینا ہے۔ میں اُدھر نہیں جاؤں گا۔ باپو نے دیکھ لیا تو خفا ہوں گے۔"

ارون کی بات سن کر سریندر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "ڈرنے کی کیا بات ہے! میں بھی تو تیرے ساتھ ہوں۔"

ارون راضی ہو گیا اور سریندر کے پیچھے چلنے لگا۔ اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے غیر متوقع طور پر بازار میں ایک جگہ اُنہیں بھیڑ دکھائی دی، شور وغل بھی ہو رہا تھا۔ تجسس کے تحت سریندر ارون کا ہاتھ تھامے بھیڑ میں گھس گیا۔ اُس نے دیکھا ایک عورت سر پر پٹی باندھے روتی اور چیختی ہوئی جا رہی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ کسی کو گالیاں بھی دے رہی تھی۔ معاً اُسے ایک آشنا آواز سنائی دی۔ "خبردار چوکیدار! مجھے ہاتھ نہ لگانا، میں برہمن ہوں۔"

سریندر اس آواز کو پہچان گیا۔ یہ آواز ششی مکرجی کی تھی۔ کالی گرام آنے کے بعد سریندر کو ششی مکرجی کے بارے میں پتہ چل گیا تھا کہ سارے فتنے کی جڑ وہی تھا۔ سر پر پٹی باندھے ہوئے عورت اُسی کو گالیاں بک رہی تھی۔ وہ ششی مکرجی کی طرف جھپٹتے ہوئے بولی۔ "یہ برہمن ہے تو ہوا کرے!...... چوکیدار، باندھ لے اس حرام زادے کو۔ دیکھا نہیں کہ اس نے لونڈیا کا خون کر دیا ہے۔"

خون کرنے کے بارے میں سن کر سریندر بھیڑ کو ایک طرف ہٹا کر آگے بڑھا۔ اُس نے ششی کی گردن پکڑ لی۔

"چھوٹے بابو آ گئے!" لوگوں نے سریندر کو دیکھ کر شور مچایا۔

سریندر نے زور سے کہا۔ "حیرت ہے، تم لوگ اتنی تعداد میں ہو کر بھی اس ایک شیطان کو نہیں پکڑ سکتے۔ لو میں نے پکڑ لیا ہے، باندھ لو اسے۔"

بھیڑ ہی میں سے کوئی لپک کر رسّی لے آیا۔ پھر چوکیدار نے ششی مکرجی کو خوب کس کر باندھ دیا۔

اسی وقت ادھیڑ عمر عورت، سریندر کے قدموں میں بیٹھ کر کہنے لگی۔ "چھوٹے بابو! اس

بے رحم پاپی نے میری بہن کا خون کر ڈالا ہے۔ میرے ساتھ انصاف کرو۔"

"خون کر ڈالا ہے؟...... تمہاری بہن کا؟...... اُس کی لاش کہاں ہے؟" سریندر نے پوچھا۔

"اُدھر اُس کوٹھڑی میں ہے۔" عورت نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "آپ خود چل کر دیکھ لیں چھوٹے بابو!"

سریندر نے عورت کے ساتھ چلتے ہوئے ارون سے کہا۔ "ارون!...... پولیس کے مقدمہ درج کرنے سے پہلے ذرا بھاگ کر ڈاکٹر بابو کو خبر دے آؤ تاکہ وہ لاش کا معائنہ کر لیں۔ جلدی جاؤ!" سریندر نے تاکید کی اور آگے بڑھ گیا۔ ارون دوڑتا ہوا گاؤں کی ڈسپنسری کی طرف چل دیا۔

جو عورت، سریندر کو اپنی بہن کی لاش دکھانے لے جا رہی تھی، ماتی کی بہن کاتی تھی۔ ماتی کے ساتھ بھی ششی مکرجی کے قابل اعتراض تعلقات تھے۔ انہی تعلقات پر کملا کا باپ ہرناتھ معترض تھا۔ ششی مکرجی کے خلاف آواز اٹھانے ہی کے سبب ماتی کو گاؤں چھوڑ کر آبادی سے باہر رہنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ زمیندار یوگیندر ہی نے اس کا حکم دیا تھا کہ ماتی گاؤں سے نکل جائے۔ اس حکم کی تعمیل میں جب ماتی کو گاؤں سے باہر رہنا پڑا تو اس کی بہن کاتی کی دُکان بھی پرانی جگہ سے اٹھ کر وہیں چلی گئی۔ کاتی کو اس سے فائدہ ہوا۔ آس پاس کے تین چار گاؤں کے رہنے والے بھی اُنہی کے گاہک بن گئے۔ کاتی کی آمدنی بہت بڑھ گئی۔ اس کی وجہ ششی خود کو بتانے لگا۔ یہ جگہ ششی کے لئے دُور تو تھی مگر اُس کا آنا جانا کم نہ ہوا۔ ماتی کے پاس جو زیورات تھے، وہ بھی ششی نے ہتھیا لئے اور انہیں بیچ کر زمین خرید لی۔ کاتی کو ششی کی آمد و رفت پسند نہیں تھی۔ اسی بنا پر دونوں بہنوں میں اکثر جھگڑا ہو جاتا تھا۔ ششی کو ماتی اپنا دیوتا کہتی تھی۔ آج بھی اسی وجہ سے دونوں بہنوں میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ ماتی اندر کوٹھری میں چلی گئی تھی۔ بہن سے لڑ بھڑ کر عموماً وہ کوٹھری میں جا پڑتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں ششی مکرجی آ گیا۔ اُس کے دستک دینے پر ماتی نے دروازہ کھول دیا۔ پھر وہ منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔

اس وقت شام ہونے والی تھی۔ ششی، ہرناتھ کے گھر کے قریب تالاب سے واپس آیا تھا۔ اُس نے یہی سمجھا تھا کہ کملا ڈوب گئی ہے۔ اُس کی خوشی اسی لئے فطری تھی۔ کملا اسی

ہرناتھ کی بیٹی تھی جس نے اُسے بدنام کیا تھا۔ اس کی جو توہین ہوئی تھی، اس کا بدلہ اس نے لے لیا تھا۔ وہ بے چین اس وجہ سے تھا کہ خوشی کا اظہار کرنے کے لئے اُسے کوئی مل نہیں رہا تھا۔ وہ ماتی کے سامنے خوشی کا اظہار کرنے پہنچتا مگر سریندر نے جلد ایسا نہ ہونے دیا۔ وہ گھر کے دروازے پر دھرنا دے کر بیٹھ گیا۔ ششی مکرجی کو اسی سبب ماتی تک پہنچنے میں دیر ہوئی تھی۔ سریندر چلا گیا تبھی وہ گھر سے نکل سکا۔ شراب کی بوتل بغل میں دبائے وہ ماتی کے پاس پہنچ گیا۔

تین چار پیالے پی کر بھی جب ششی مکرجی کو نشہ نہیں ہوا تو گانجا ملا اور پھر چلم تیار کر کے اس میں آگ رکھی۔ تین چار کش لگا کر اچانک وہ بلاسبب ہنسنے لگا۔ ششی ہی کے سبب ماتی کا اپنی بہن سے جھگڑا ہوا تھا اسی لئے اُس کا مزاج کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ ششی کو اس طرح بلاوجہ ہنستے دیکھ کر اُس کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور وہ تنک کر بولی۔ ''پاگلوں کی طرح کیوں ہنسے جا رہا ہے؟''

ششی نے جواب دیا۔ ''خوشی ہونے پر ہنسی آتی ہے اور ہنسی آنے پر خوشی ہوتی ہے۔ اسی کو کہتے ہیں ہنسی خوشی!''

''خیر ہنسی خوشی تو خوب دیکھ رہی ہوں، اب یہ بتاؤ میرے روپوں کا کیا ہوا؟'' ماتی نے پوچھا۔

''ارے روپوں کی بات کیا کرتی ہو...... میں تمہیں ایک ایسی خبر سنا سکتا ہوں جس کے آگے لاکھ روپے بھی کچھ نہیں۔ آج کیا ہوا...... نہیں جانتی؟ اچھا تو سن! پنڈت ہرناتھ کی بیٹی کملا ڈوب مری۔ کسی نے بھی اسے اپنے گھر میں جگہ نہ دی۔ نہ ساس نے نہ ماں باپ نے!...... وہ جاتی بھی کہاں...... اُس نے سب طرف سے مایوسی کے بعد تالاب میں ڈوب کر جان دے دی۔ میں اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ کر آ رہا ہوں۔'' ششی مکرجی نے فخریہ لہجے میں بتایا۔

''سچ...... کیا کملا واقعی ڈوب کر مر گئی؟'' ماتی نے شدید حیرت کا اظہار کیا۔

''ہاں ڈوب گئی۔'' ششی نے تصدیق کی۔ ''اُس نے خودکشی کر لی۔ وہ اب چڑیل بن جائے گی۔ تو نے اگر اب مجھ سے روپوں کا تقاضا کیا تو وہ تیری گردن مروڑ دے گی۔ وہ برہمن زادی ہے اور میں برہمن ہوں۔'' ششی نے اپنی دانست میں ماتی کو ڈرایا، انداز بچگانہ تھا۔

''گردن میری مروڑے گی یا تمہاری؟'' ماتی چڑ کر بولی۔ ''تم ہی نے تو ایک برہمن زادی پر ناحق تہمت لگا کر یہ غضب کیا ہے۔ رام...... رام! بے چاری کی جان بے سبب گئی۔ تھی تو عورت ذات!...... وہ بھی ایک برہمن کی بیٹی۔''

''ماتی! شراب اور گانجا میں نے پیا ہے مگر لگتا ہے نشہ تجھے ہو گیا ہے۔'' ششی مکرجی طنزیہ آواز میں بولا۔

''نشے میں تم ہو۔ میں نہیں۔'' ماتی کہنے لگی۔ ''کوئی بھلا آدمی اس طرح کسی کے پیچھے نہیں پڑتا، نہ یوں بدنام کرتا ہے۔ تم کہاں کے برہمن ہو!''

''ہوں برہمن۔'' ششی کو غصہ آ گیا۔ ''ہرناتھ برہمن ہے تمہاری نظر میں؟...... وہ کمینہ ہرناتھ مجھے برادری سے نکالنے چلا تھا، دیکھ لیا اپنا حشر۔''

''جاؤ جاؤ، فضول بڑ نہ مارو۔'' ماتی نے کہا۔ ''میری نظر میں تم پاپی (گناہ گار) ہو۔ جس نے اپنے دونوں جہان کھو کر اتنے دن تمہاری خدمت کی، تم نے سود کا لالچ دے کر اسی کے سارے زیورات ہتھیا لئے!...... تم نے مجھ جیسی غریب عورت کے روپے ہضم کر لئے۔ اس کے علاوہ ایک شریف آدمی کی بیٹی پر تہمت لگا کر اس کی جان لے لی۔ اس پر تم کہتے ہو کہ برہمن ہوں۔''

''دیکھ ماتی! کہتا ہوں مجھے غصہ نہ دلا۔'' ششی غصے میں آ کر بولا۔ ''سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، جھوٹ نہیں کہا۔''

''جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے یہ!'' ماتی چپ نہ رہی۔ ''جو جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہے وہ نرک (جہنم) کا کیڑا بنتا ہے۔ تم نے دانستہ کیا کملا پر تہمت نہیں لگائی؟ میری مَوسی (خالہ) جب بیمار تھی تب تم نے کلکتے جو خط بھیجا تھا وہ یاد نہیں ہے؟ تم نے ناحق کملا کو بدنام کیا۔ تم جھوٹے ہو۔''

ششی مکرجی غصے میں پیچ و تاب کھاتا ہوا اٹھا مگر ماتی نے پرواہ نہیں کی۔

''یہ تو غصہ کسے دکھا رہا ہے؟'' ماتی نے مزید کہا۔

ششی آپے سے باہر ہو گیا۔ اُس نے ماتی کے منہ پر طمانچہ مارا اور بولا۔ ''حرام زادی! چھوٹا منہ بڑی بات۔ تیری یہ مجال کہ ایک برہمن کی توہین کرے۔''

ماتی بھی اُٹھ کھڑی ہوئی اور غصے میں کہنے لگی۔ ''خبردار!...... آگے کچھ کہا تو اچھا نہ ہو گا۔ نکل جا میرے گھر سے۔ مجھ پر ہاتھ اٹھانے والا تو کون ہوتا ہے۔''

''دیکھ ماتی، تو بہت بگڑ رہی ہے۔ زمیندار تجھے گاؤں سے نکال کر باہر پھنکوا دیتا۔ میں نے بہت کہہ سن کر تجھے یہ جگہ دلائی جس میں تو پڑی ہوئی ہے۔ اب تو مجھ ہی کو آنکھیں دکھا رہی ہے۔ ٹھہر جا، ابھی تیرا سر منڈوا کر تجھے گدھے پر چڑھانے، سارے گاؤں میں گھموا کر نکلوا دینے کا بندوبست کرتا ہوں۔ کل ہی زمیندار بابو سے میں بات کرتا ہوں۔ تو نے سمجھ کیا رکھا ہے۔ مجھ سے دشمنی مول لے رہی ہے۔''

سر منڈوانے کی بات سن کر ماتی آگ بگولا ہو گئی۔ اُسے معلوم تھا کہ بدکردار عورتوں کے سر ہی منڈوائے جاتے ہیں۔ وہ اسی لئے غرا کر بولی۔ ''ضرور بات کر زمیندار بابو سے۔ مگر یہ مت بھولیو کہ میں بھی وہاں جا سکتی ہوں۔ اگر میں نے کوئی گناہ کیا ہے تو اس میں تو بھی برابر کا حصے دار ہے۔ میں زمیندار بابو سے سب کچھ سچ سچ بیان کر دوں گی۔ تیرا بھانڈا پھوڑ دوں گی۔ اس کے بیٹے پر بھی جھوٹا الزام لگا کر تو نے اسے گھر سے نکلوا دیا ہے، سب صاف صاف کہہ دوں گی۔''

''دیکھ لے جا کے کمینی!'' ششی مکرجی نے بگڑ کر کہا۔ ''تیری بات کا یقین کون کرے گا؟''

''کوئی یقین کرتا ہے یا نہیں، یہ میں دیکھ لوں گی۔ تیرے ہاتھ کا لکھا ہوا خط لیتی جاؤں گی۔ یہ خط زمیندار بابو اور زمیندارنی کو دکھاؤں گی، تب تو یقین کریں گے؟ تو سمجھتا ہوگا کہ وہ خط میں نے پھینک دیا ہوگا۔ وہ میرے پاس رکھا ہے۔''

یہ سن کر ششی ایک دم نرم پڑ گیا اور کہنے لگا۔ ''ماتی! تو ناراض ہو گئی؟ میں جانتا ہوں تو وہ خط زمیندار بابو کو نہیں دکھائے گی۔''

''دکھاؤں گی کیوں نہیں...... دیکھوں تو میرا کیا بگاڑ لیتا ہے۔ تو نے میرے زیور ہضم کر لئے، میرا سب کچھ لوٹ لیا۔ جا کر سب کچھ بتاؤں گی۔''

''غصہ تھوک دے ماتی! یہ سوچ کہ میں تجھ سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ مجھے وہ خط دے دے۔'' ششی اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''نہیں دوں گی وہ خط۔'' ماتی نے صاف انکار کر دیا۔

پھر ششی مکرجی نے کئی دفعہ نرمی اور سختی سے خط مانگا مگر ماتی کو ضد چڑھ گئی۔ اُس نے ہر بار انکار کیا۔ ششی کے دماغ پر شراب اور گانجے کا نشہ سوار تھا۔ زمیندار کی ملازمت سے نکالے جانے اور اپنے کرتوتوں کی سزا پانے کے خدشے سے وہ بے قابو ہو گیا۔ اُس سے اتنا صبر نہ ہوا کہ اس وقت معاملے کو رفع دفع کر دیتا اور پھر کبھی ماتی سے مطلوبہ خط حاصل کر لیتا۔ وہ بس اچانک ماتی پر ٹوٹ پڑا اور اُسے گرا لیا اور اُس کے سینے پر دونوں گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبانے لگا۔ ماتی کی آواز سن کر کاتی دُکان سے اُٹھ کر اندر آئی تو اس وقت تک ماتی ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔

''پاجی نے میری بہن کا خون کر دیا...... خون کر دیا!'' کاتی نے چیخ چیخ کر محلے بھر کو سر پر اُٹھا لیا۔

یہ دیکھ کر ششی مکرجی، ماتی کے بے جان جسم کو چھوڑ کر اٹھا اور شراب کی بوتل کاتی کے سر پر دے ماری جس سے وہ بھی زخمی ہو گئی۔ کاتی دوڑ کر باہر نکل گئی اور ششی کو گالیاں دینے لگی۔ لوگ اُس کے گرد جمع ہونے لگے۔ موقع غنیمت جان کر ششی کھسکا جا رہا تھا، لیکن اُس کے دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔ وہ بھاگ نہیں سکا۔ زمیندار کا ملازم ہونے کے باوجود وہ پکڑے جانے سے نہ بچ سکا۔ آخر انصاف بھی کوئی چیز ہے۔



کالی گرام میں علاقہ مجسٹریٹ کی آمد متوقع تھی۔ زمیندار یوگیندر اُسے لینے اسٹیشن پہنچا۔ مجسٹریٹ نہیں آیا البتہ اُس کا تار ضرور ملا۔ اچانک طبیعت خراب ہو جانے کی وجہ سے وہ نہیں آ سکا تھا۔ زمیندار اپنی ٹم ٹم میں گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ کچھ دُور چل کر چاندنی میں اُس نے ہرناتھ کو دیکھ کر ٹم ٹم روک لی۔

''اس وقت اتنی رات گئے کہاں گئے تھے؟'' زمیندار نے پرنام کر کے پوچھا۔

''ریلوے لائن کے پار ڈھائی چنڈیلا گاؤں میں ایک کام تھا۔ جس کے لئے مجھے بلوایا گیا تھا وہ مرگیا اس لئے واپس گاؤں جا رہا ہوں۔'' ہرناتھ نے جواب دیا۔

''میں بھی گاؤں جا رہا ہوں، آیئے میری گاڑی میں بیٹھ جایئے۔'' زمیندار نے پیشکش کی۔

ہرناتھ نے یہ پیشکش قبول کر لی اور ٹم ٹم میں بیٹھ گیا۔ گاڑی کچھ دُور پکی سڑک پر چل

کر گاؤں کی کچی سڑک پر چلنے لگی۔ اسی وقت ایک بیل گاڑی دُھول اُڑاتی ہوئی دوسرے گاؤں کی طرف چلی جارہی تھی۔

زمیندار یوگیندر خود گاڑی ہانک رہا تھا۔ اُسے سگار پینے کی طلب ہوئی۔ اب وہ لگام، چابک، سگار، دیا سلائی کیا کیا پکڑتا! مجبوراً اُس نے ٹم ٹم روک دی۔ اس کے بعد بڑی مشکل سے سگار سلگایا کیونکہ ہوا تیز تھی۔

''روکو!...... روکو!'' یہ آواز سن کر زمیندار چونک اُٹھا۔

زمیندار نے گاؤں کے ڈاکٹر کو دیکھا۔ ڈاکٹر اپنی پالکی سے اُتر کر ٹم ٹم کے قریب آ گیا۔

''کیا حال ہے ڈاکٹر صاحب؟'' زمیندار یوگیندر بولا۔

پھر ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ قریبی گاؤں میں ایک مریض کو دیکھنے جارہا ہے۔ گاؤں وہی تھا جہاں سے ہرناتھ واپس آ رہا تھا۔ ہرناتھ نے مریض کی موت کے بارے میں بتایا تو ڈاکٹر نے اپنا ارادہ موقوف کر دیا۔ معاً ڈاکٹر کہنے لگا۔ ''آپ کو میں ایک بات بتانا تو بھول ہی گیا جس کے لئے روکا تھا۔ آپ کے ایک ملازم ششی مکرجی پر بہت بڑی مصیبت آ پڑی ہے۔ وہ پولیس کے چنگل میں پھنس گیا ہے۔''

''وہ کیسے......؟'' زمیندار نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''وہ تو بیماری کی وجہ سے چھٹی لے کر گیا تھا۔''

زمیندار کے استفسار پر ڈاکٹر نے سارا قصہ بیان کر دیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ہرناتھ کا بیٹا ارون اُسے اپنے ساتھ کسی مریض کو دکھانے لے گیا۔ مریضہ ایک عورت تھی جو بظاہر مُردہ لگتی تھی لیکن وہ ابھی مری نہیں تھی۔ کافی کوشش کے بعد عورت کو ہوش آیا۔ وہاں اس عورت کی بہن بھی موجود تھی۔ ششی مکرجی نے اُس کے سر پر شراب کی بوتل ماری تھی جس سے اُس کا سر پھٹ گیا تھا مگر چوٹ گہری نہیں تھی۔ جو عورت بے ہوش تھی اُسے ششی گلا دبا کر مار ڈالنا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر نے داروغہ کو خبر کر دی۔ داروغہ نے آ کر عورت کا بیان لیا۔ اس بیان سے معلوم ہوا کہ ششی مکرجی نے عورت کے ساتھ ناجائز تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ یہی بات عام ہونے پر پنڈت ہرناتھ نے ششی کو برادری سے نکالنے کے لئے مہم چلائی تھی۔ ششی اسی وجہ سے ناراض تھا۔ جب ہرناتھ کی بیٹی کملا کلکتے میں گم ہوگئی تو ششی نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے ہرناتھ سے بدلہ لینے کے لئے کملا پر تہمت لگا

دی۔ آج اسی بات پر اس عورت کا ششی سے جھگڑا ہو گیا۔ عورت نے کہا تھا کہ وہ ششی کے کالے کرتوتوں کا بھانڈا پھوڑ دے گی۔ اسی پر غصے میں آ کر ششی نے اُسے گلا گھونٹ کر مار ڈالنا چاہا۔

ماتی کا کہنا تھا کہ جب وہ اپنی موسی کے پاس ان کی عیادت کے لئے کلکتے گئی تھی تو ششی مکرجی نے اسے ایک خط لکھا تھا۔ اس خط میں ششی مکرجی نے اعتراف کیا تھا کہ ہرناتھ سے بدلہ لینے کے لئے اسے موقع مل گیا ہے۔ تمام باتیں اُس نے خط میں تفصیل سے لکھی تھیں کہ کس طرح کملا پر الزام لگایا اور کیسے سریندر کو کملا کے اغوا میں ملوث کیا۔

ڈاکٹر سے یہ سب کچھ سن کر زمیندار یوگیندر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

''حرام زادے کی یہ مجال!'' زمیندار غصے بھری آواز میں بولا۔ ''سالے کو جیل میں سڑوا دوں گا۔'' پھر اُس نے ڈاکٹر کو پیچھے آنے کے لئے کہہ کر ٹم ٹم ہانک دی۔



کملا اور ستیش کو جگدیش پور پہنچ کر بھی سکون نہیں مل سکا۔ دُرگا دیوی نے خاصے بحث مباحثے کے بعد گویا اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اُس نے کہا کہ وہ کملا کے ہاتھ کا پانی نہیں پیئے گی۔ اُس کے بنائے ہوئے کھانے کو بھی وہ نہیں کھائے گی۔ ستیش کو ہر حال میں کملا کو چھوڑنا پڑے گا، اسے گھر سے نکال دینا ہوگا۔ وہ کسی صورت بھی کملا کے ساتھ گھر میں رہنے پر تیار نہیں تھی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ ستیش دونوں میں سے ایک کو چھوڑ دے، اپنی بیوی کو یا اپنی ماں کو۔

دُرگا دیوی کا ذہن اس بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا کہ کملا کا چلن داغ دار نہیں تھا۔ ستیش کی طرف سے عورت کی طرفداری دیکھ کر اُس کے دل میں یہ بات اور بھی بیٹھ گئی تھی کہ بہو نے اُس کے بیٹے پر جادو کر دیا ہے۔ ستیش نے بہت منت سماجت کی مگر دُرگا دیوی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اُسے کملا کی بے گناہی پر یقین نہیں تھا۔ مجبوراً ستیش نے بھی صاف کہہ دیا کہ وہ کملا کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔

چند لمحے دُرگا دیوی پر سکوت سا طاری رہا، پھر بولی۔ ''میں تجھے چھوڑ سکتی ہوں اپنا دھرم (مذہب) نہیں۔''

''چلو کملا، چلیں۔'' ستیش نے کملا کو مخاطب کیا۔

''کہاں؟'' کملا نے بجھی ہوئی سی آواز میں سوال کیا۔

''یہاں سے جہاں بھی چلے گئے، سکھ ہی میں رہیں گے۔'' ستیش نے جواب دیا۔

''یہ قدم اٹھانے سے پہلے سوچ لو کہ وطن، سماج اور اپنی ماں کو چھوڑ سکو گے؟ جو عہد کیا ہے اس پر قائم رہو گے؟''

''میں پختہ ارادہ کر چکا ہوں۔'' ستیش پُرعزم لہجے میں بولا۔ ''جو کہہ چکا ہوں اس پر عمل کروں گا۔''

پھر ستیش اپنا آبائی گھر چھوڑ کر کملا کو ساتھ لئے نامعلوم منزل کی طرف چل دیا۔

کسی نامعلوم راستے کا راہی ہونا مرد کے لئے فطری ہو سکتا ہے لیکن عورت کے لئے نہیں۔ اگر عورت گھر سے نکلتی ہے تو اس کی منزل دوسرا گھر ہوتا ہے۔ اسی خیال سے کملا نے ستیش کے اس مقصد سفر کی ایک سمت مقرر کر دی۔ طے ہوا کہ وہ دونوں کلکتہ سے ہو کر لکھنؤ لوٹ جائیں گے جہاں ستیش ملازم تھا۔ ابھی ستیش کی چھٹیاں باقی تھیں۔ اس کے علاوہ کملا کے والدین کو اطلاع دیئے بغیر کہ وہ زندہ ہیں اور کملا اپنے شوہر کے پاس ہے، یوں چلے جانا ستیش کو مناسب معلوم نہیں ہوا۔ کملا سے مشورے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ وہ کلکتے میں سریندر سے ملاقات کر کے یہ اطلاع کملا کے میکے تک بھیج دیں گے۔ سریندر کو تلاش کر لینا مشکل نہ ہوتا کیونکہ کملا کو اُس کے گھر کا علم تھا۔

ستیش اور کملا آخرکار کلکتے پہنچ گئے۔ ہاوڑا ریلوے اسٹیشن سے گھوڑا گاڑی کر کے وہ سیدھے سریندر کے ٹھکانے پر پہنچے۔ ستیش گاڑی سے اُتر کر سریندر سے ملنے گیا۔ کچھ ہی دیر میں واپس آ کر اُس نے کملا کو بتایا کہ سریندر اب وہاں نہیں رہتا۔ سریندر کے والد کچھ عرصہ پہلے آ کر اس کا سب سامان لے گئے تھے۔

''بلڈنگ میں کیا کسی کو معلوم نہیں کہ سریندر کہاں گیا ہے؟...... معلوم تو کرو۔'' کملا نے مشورہ دیا۔

ستیش پھر بلڈنگ میں گیا اور سریندر کا پتہ معلوم کیا۔ واپس آ کر ستیش نے کملا کو مطلوبہ پتہ بتلایا۔

''یہاں تو کھنج بابو رہتے ہیں۔'' کملا نے چونک کر کہا۔

کملا نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ اندر ہی اندر کھنج سے متوقع ملاقات پر

خوش تھی۔

وہاں سے وہ دونوں کھنج کے گھر پہنچے تو سب سے پہلے ان کی ملاقات کملا کے بھائی ارون سے ہوئی۔ یہ سن کر کہ کملا گاڑی میں بیٹھی ہے، ارون خوشی سے دوڑتا ہوا اپنی بہن کے پاس پہنچا۔ وہ بہت ساری باتیں ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔ ان باتوں سے کملا اور ستیش کو پتہ چل گیا کہ ششی مکرجی کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ گاؤں میں کملا کا کوئی سراغ نہ پا کر ہرناتھ، سریندر اور ارون گزشتہ رات وہاں پہنچے تھے۔ حقیقت کا علم ہونے پر ہرناتھ اور زمیندار یوگیندر دونوں ہی کو بہت افسوس تھا۔ زمیندار یوگیندر بھی ان کے ساتھ کلکتے آیا تھا۔ پچھتاوے کی آگ اسے بھی جلا رہی تھی۔ ان سبھی کو یقین تھا کہ اگر کملا نے خودکشی نہیں کی ہوگی تو وہ لازمی طور پر کھنج کے گھر ہی جائے گی۔ کھنج کے سوا کہیں بھی اُسے آسرا ملنے کی اُمید نہیں تھی۔

''دیدی آ گئی...... دیدی آ گئی۔'' چلاتا ہوا ارون، کملا کا ہاتھ تھامے اُسے کھینچتا ہوا کھنج کے گھر میں لے گیا۔

یہ نشست گاہ تھی جہاں سبھی موجود تھے۔ مصیبتوں میں مبتلا خاندان کو جیسے نئی زندگی مل گئی۔ یوگیندر نے کھنج کو مخاطب کیا۔ ''دیکھئے کھنج بابو، اس تمام بکھیڑے کے لئے ہم سب بوڑھے بے وقوف ہی ذمہ دار ہیں۔''

''میرے خیال میں تو آپ بزرگوں کی نسبت ہم نوجوان زیادہ قصوروار ہیں۔'' کھنج ہنس کر کہنے لگا۔ ''میں اگر کملا کو اپنے گھر نہ لا کر سیدھا ہسپتال پہنچا دیتا تو یہ المیہ رونما نہ ہو پاتا۔'' کھنج کی بات کیونکہ حقیقت پر مبنی تھی اس لئے کسی نے اختلاف میں کچھ نہ کہا۔

''جو کچھ بھی ہوا، اس کے لئے تم خطاوار ہو نہ میں۔'' سریندر نے کہا۔ ''دراصل اس کا ذمہ دار ہمارا سماج ہے۔''

ستیش بولا۔ ''اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ہم جوانی سے ڈرتے ہیں اور عورت ذات پر ہمیں اعتماد نہیں۔''

''خیر اب یہ بتاؤ تم لوگوں نے کہاں جانے کا فیصلہ کیا ہے؟'' زمیندار یوگیندر نے پوچھا۔

''آج ہی شام کی گاڑی سے ہم لکھنؤ روانہ ہو جائیں گے۔'' ستیش نے جواب دیا۔

''کیا کملا ایک بار اپنی ماں سے ملنے گاؤں نہیں جائے گی؟'' یوگیندر نے سوال کیا۔

''اس وقت گاؤں جانا میرے لئے ممکن نہیں۔'' کملا بول اُٹھی۔ ''بہت تھک گئی ہوں، کچھ دنوں آرام کروں گی۔''

''اچھا تو پھر دو دن یہیں رہ جاؤ'' ہرناتھ نے کہا۔ ''میں تمہاری ماں کو یہیں لے آؤں گا۔ تم اس سے مل کر لکھنؤ چلی جانا۔''

کھتج بابو کے گھر بہت دن رہ چکی ہوں، اب یہاں مزید نہیں رہنا چاہئے۔'' کملا کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

ہرناتھ چپ ہو گیا، کچھ نہ بولا۔ صرف ارون نے کملا کے ساتھ لکھنؤ جانے کی ضد کی۔ ستیش اور کملا اُسے ساتھ لے جانے پر آمادہ ہو گئے۔ طے یہ ہوا کہ کملا اور ارون کو گاڑی پر سوار کروا کر ہرناتھ، یوگیندر اور سریندر بھی آج ہی گاؤں واپس چلے جائیں گے۔

کھتج نے اُس روز مہمانوں کی بڑی خاطر مدارات کی۔

شام ہو گئی تو وہ سب ہاوڑا ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ کملا، ستیش اور ارون کو انہوں نے لکھنؤ جانے والی گاڑی میں سوار کرا دیا۔ اس کے آدھے گھنٹے بعد دوسری گاڑی میں زمیندار یوگیندر، ہرناتھ اور سریندر بھی اپنے گاؤں چل دیئے۔ صرف کھتج ریلوے اسٹیشن پر اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ خود کو خالی خالی سا محسوس کر رہا تھا۔ اس طرح خالی پن لئے گھر واپس جانے کی اُسے بالکل خواہش نہیں تھی۔ اُسے یوں لگ رہا تھا کہ بھری دنیا میں وہ بالکل تنہا ہے۔

دوسرے دن وہ موٹر پر سوار ہو کر کلکتہ شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر کاٹنے لگا۔ یوں جیسے وہ اپنے اندر کے انسان سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اُسے محسوس ہوا کہ کسی مقصد کے بغیر زندگی گزارنا اس کے لئے ممکن نہیں ہو گا۔ اس کی بے قراری بڑھ گئی۔ پھر خود ہی ایک روز اُسے اس کی زندگی کا مقصد مل گیا۔ انگریزوں کے خلاف نکلنے والے ایک جلوس میں وہ بھی شامل تھا!

''لے کے رہیں گے آزادی......'' کھتج بھی پُرجوش انداز میں نعرے لگا رہا تھا......!!

(ختم شد)